

رشتوں کے ریشم



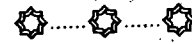
رفعت سراج

فہرست

صفحہ	نمبر شمار
11	1- سنہرا پانی
44	2- اے بسا آرزو
54	3- جوگن
69	4- حسب، نسب، کسب
76	5- مجھے جیت لو
105	6- رشتوں کے ریشم
126	7- کاسہ دل
141	8- اک حرف ملامت بھی نہیں
160	9- بتایا گزر اوقات
168	10- اک حرفِ تلی تو

ایک قطعہ!

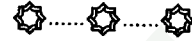
ستارہ خوبصورت ہے ذرہ خوبصورت ہے
ابھی یہ فیصلہ ہونے کو ہے، کیا خوبصورت ہے
یہ مانا کہ عشق کی تقدیر میں اجرت نہیں کوئی
مگر یہ بھی تو دیکھو کام کتنا خوبصورت ہے



پیش لفظ

ماں کی گود میں سنی ہوئی پہلی کہانی
ایک تھی چڑیا ایک تھا چڑا۔ چڑیا لائی چاول کا دانہ چڑا لایا دال کا دانہ دونوں نے
مل کر کھجڑی پکائی.....
جو ماں اپنے بچے کو پہلی کہانی اتفاق کی سناتی ہے گویا وہ اس کے لاشعور کی تہوں
میں اصلی ”اسلام“ بٹھا دیتی ہے..... امن کی چادر اوڑھا دیتی ہے۔
مگر ”اتفاق“ کی کہانی سن کر جو بچہ شعور کی منزل پر قدم رکھتا ہے..... تو خود کو بڑا
اکیلا پاتا ہے..... اس کے چہار سو معرکے ہیں..... بڑا شور، بڑی آوازیں۔
ارے..... دیکھو یہ بانٹ کر کھا رہا ہے..... یہ تو بڑا بے وقوف ہے..... بہت سے
موقع پرست اس کی جانب بڑھتے ہیں..... ”پہلے آئیے پہلے چھیننے“ کی بنیاد پر..... اپنے
حساب سے وہ اسے لوٹ لیتے ہیں خالی کر دیتے ہیں..... مگر نیک نیت ہونے کے باعث
فطرت پھر اس کا دامن بھر دیتی ہے.....
لئیرے آتے ہیں..... پھر چھین لیتے ہیں.....
دال چاول کی کھجڑی پکتی رہے گی..... چھین کر کھانے والے آتے رہیں گے.....
کسی کو لوٹنے سے سرور مل رہا ہے کسی کو لٹنے سے.....
لٹنے والے سمندر ہو رہے ہیں لوٹنے والے بنجر.....
اے چڑیا اور چڑے کی پہلی کہانی سننے والی معصوم روح.....
حوصلہ رکھنا..... تیری پشت پر خدا کا ہاتھ ہے۔ تیری جھولی ہمیشہ بھری رہے
گی..... مگر معرکہ تو تجھے کرنا ہوگا..... سمجھوتہ نہیں کرے گا تو۔ بھیڑیے کو بھیڑیا کہے گا اور بلی کو
بلی..... جس دن باطل سے خوف کھا گیا..... اپنے اصل سے ہٹ گیا.....
پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ”غزوے“ کیے..... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم چاہتے تو حجرہ مبارک میں فرشتے آ کر دشمنوں کے نیست و نابود ہونے کی خبریں

- 11- پھوپھی جان 181
12- تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی 191
13- خط جو پوسٹ نہ ہو سکے 228
14- صدف 240
15- یہ صراحی میں پھول نرگس کا 254
16- شناختی علامت 264



سنہرا پانی

”اماں! شاید میرے عقل داڑھ نکل رہی ہے۔“ اس نے داہنے رخسار پر ہتھیلی جما کر کہا۔
 ”اے ہاں اب اس لوٹھا کو عقل آئے گی۔“ اماں کے بجائے دادی جان نے جزدان میں کھونپ بھرتے ہوئے ناگواری سے بڑبڑا کر کہا۔

”جس کو باقاعدہ ٹریننگ سے عقل نہ آئی اسے ”داڑھوں“ سے عقل آئے گی؟“
 غسل خانے سے نکلتے بھائی میاں نے تولیے سے سر رگڑتے ہوئے تسخرانہ کہا۔
 تب اس کے صبح ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

”کسی کے دکھ تکلیف کا احساس ہی نہیں۔ جھائیں مارنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں سب۔ ٹھیک ہے میں کم عقل ہوں۔ اس گھر میں جن کے پاس ”عقلیں“ ہیں وہ کیا ملکہ الزبتھ کے دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔ کوئی سپرداؤزر، کوئی کلرک۔ ہونہ!۔“
 ”اُئی۔“ اس کی سسکی نکل گئی۔ ہونہ کہہ کر سر جھٹکا تو تکلیف بڑھ گئی۔

”ڈاکٹر کے پاس چلی جانا۔“ اماں کو ذرا احساس ہوا۔
 ”رخسانہ کے ساتھ چلی جانا۔“ انھوں نے پھر کہا اور پوچھا۔ ”کیا تکلیف زیادہ ہو رہی ہے؟“

”نہیں، بن رہی ہوں۔ وہ دھپ دھپ کرتی..... اندر چلی گئی۔ آج تکلیف کی وجہ سے اس کی خوش مزاجی بھی غائب تھی۔ وگرنہ بڑی سے بڑی بات پر ہنستی رہتی تھی۔
 ”اے دلہن! سر پر چڑھنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اس سے چھوٹی دو بچوں کی ماں ہے۔ نامراد کو کون پوچھے گا؟ مجھے تو ہول آتا ہے سوچ سوچ کر۔ کسی چیز میں تو طریقہ سلیقہ ہو۔“
 ”کیا کروں پھر اماں؟ اور بچیوں کو کون سا میں نے مار مار کر سکھایا ہے مگر کتنی سکھڑ ہیں۔ اے تو خود ہی کوئی شوق نہیں۔“ اماں نے بے چارگی سے جواب دیا۔
 ”بس کبھی کبھی آتی ہے یا کھانا اور سونا اور دودھ ضرور ملے نواب زادی کو..... اب دیکھو

سناتے..... اتنی نیک فطرت ازواجِ مطہرات کے ہوتے ہوئے خود کوڑے میں پانی بھر کر پیا۔ اپنے کپڑے دھوئے، اپنے جوتے گاٹھے..... بکری کا دودھ دوہیا..... وہ جس کی انگلی سے معجزے چھونٹتے تھے..... جس کو فرشتے درود و سلام پیش کرنے حاضر ہوتے تھے..... غزوات میں اس کے دندانِ مبارک بھی شہید ہوئے ہیں..... جسم مبارک پر زخم بھی آئے ہیں..... وہ جسے علم کل دیا گیا جسے ”حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم“ کہا گیا۔ جس کو عرش سے سلام پہنچیں..... اس نے ظلم کا مقابلہ کر کے ہمیں کیا سبق دیا کہ میں پیغمبر ہوں آدم کی سب اولاد تو پیغمبر نہیں..... ہاں میں انسان ہوں سب کی طرح آدم کا بیٹا بھی ہوں..... بانٹ کر کھاؤ..... لیکن لیرے کا ہاتھ روکو.....

”ایک مسلمان کا خون اور مال دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔“
 جو کسی پر ظلم کرتا ہے وہ ظالم ہے۔

جو ظالم کے سامنے خوفزدہ ہو کر حق بات دل میں رکھتا ہے بولتا نہیں۔
 احتجاج نہیں کرتا وہ بھی ظالم ہے اور مشرک بھی کہ اللہ سے زیادہ دوسرے سے ڈر رہا ہے۔

اللہ لا یحب الظالمین

(اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا)

نیکی کبھی پسپا نہیں ہو سکتی اگر درحقیقت نیکی ہے
 ظلم کبھی پھل پھول ہی نہیں سکتا اگر واقعی ظلم ہے

جَاءَ الْحَقُّ وَذَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ ذَهُوْقًا

(حق آ گیا جھوٹ مٹ گیا بے شک جھوٹ مٹنے ہی کے لیے ہے)

کتاب المبین کی ایکویٹز کبھی آن بیلنس نہیں ہو سکتی۔ فارمولے تبدیل نہیں ہو سکتے۔ لہذا چڑیا اور چڑے کی کہانی سے اتفاق کا سبق لینے والی معصوم سی روح..... بانٹ کر کھانا مگر چھیننے والے کو ”عقل کل“ ہونے کا غرور مت بخشنا..... تیری پشت پر وہ ہاتھ ہے۔ جس ہاتھ میں ساری قوت و قدرت ہے.....

صرف دعاؤں کے لیے

انتہائی حریص

رفعت سراج

چوبیس کا سن لگ گیا۔ اس خالی کے چاند میں۔ مجھے تو اچھی طرح یاد ہے۔ سورج سوانیزے پر تھا۔ پتے سوکھ رہے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کا کوئی منتقم بدلہ لینے کی خاطر دشمن پر بمباری کر رہا تھا۔ ”البتہ بھینسیں دودھ خوب دے رہی تھیں۔“ چھوٹے بھائی صاحب یونیورسٹی سے وارد ہو کر دادی جان کی بات میں نخل ہوئے۔

تو بھائی میاں نے بلند قہقہہ لگایا۔ وہ اندر کمرے میں سلگ کر رہ گئی۔ ”ہونہہ! ابھی تو اباجی کما رہے ہیں۔ دودھ۔ دودھ جیسے انھوں میرے لیے بھینسیں پال رکھی ہیں۔ طنے ایسے دیتے ہیں۔ جیسے ان کا کھار ہی ہوں۔ جسے دیکھو میرے کھانے پینے پر نظریں لگائے بیٹھا ہے۔ ہزار بار پیوں گی دودھ۔ جلنے والے جلا کریں۔“ اس نے خود کو دلا سہ دیا۔



رخسانہ باجی میکے آئی ہوئی تھیں۔ شام کو وہ خوبصورت چادر پہن کر کھڑی ہو گئی۔ ”چلو رخسانہ باجی! ڈاکٹر کے پاس۔“ ”کیوں بھئی۔ تمہیں کیا ہوا؟ انھوں نے حیرت سے اس کے صحت مند گلابی چہرے کو دیکھا۔

”درد ہو رہا ہے داڑھ میں۔“

”اچھا، میں متو کو دودھ پلا آؤں۔ سو جائے گا۔“ وہ باہر نکل گئیں۔ ”اچھا تو ہمارے بھی دن پھرنے والے ہیں۔“ چھوٹے بھائی نے اندر داخل ہو کر پوچھا۔ ”سنا ہے تمہارے اپریمیئر میں عقل نامی مہمان آرہے ہیں؟“

”آپ سے مطلب؟“ وہ چڑ کر بولی۔

”ہاں بھئی، ہم سے کیوں مطلب نہیں۔“

”دیکھیں چھوٹے بھائی! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ میں ویسے ہی مر رہی ہوں۔“ ”ارے، اتنی خوفزدہ مت ہو۔ بڑی اعلیٰ چیز ہوتی ہیں عقل محترمہ۔ مایوسی کی باتیں مت کرو۔ نیک فال ہے تمہارے حق میں۔“ وہ اس کے بستر پر لیٹ گئے۔

”سارا گھر دشمن ہے میرا۔“ وہ باہر چلی گئی۔



رخسانہ باجی تو معہ گھڑا پے کے عرصہ ہوا سرال بعد ہار چکی تھیں۔ اس سے چھوٹی

نغمانہ بچپن ہی سے ماموں زاد سے منسوب تھی۔ اٹھارویں برس میں لگی ہی تھی کہ شادی کے تقاضے شروع ہو گئے۔

اباجی پہلے آشیانہ کا بیہ کرنا چاہتے تھے مگر بقول اماں کسی ڈھنگ کے آدمی نے اس کے لیے سوال ہی نہیں کیا تھا آج تک۔ وہ بھی بڑا عرصہ بھائی کو ٹالتی رہیں مگر کب تک؟ خاندان کی خواتین زیادہ ہی ”گھڑا پاپند“ تھیں اور اباجی کے خاندان کے افراد ان کے گھر کے ذرا ذرا سے حال سے واقف تھے۔ ایک تو اس کا لا ابالی پن، اس پر مستزاد اس کا منہ پھاڑ کر جواب دینا۔ شکل و صورت میں خاندان کی سب ہی لڑکیاں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ اس پر اس کے اپنے دماغ بہت اونچے تھے۔ آج تک اسے کوئی بھایا ہی نہیں تھا۔ اپنے قابل ہی نہ لگا تھا۔

انٹر کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر چند سال بعد سخت بوریت ہوئی تو بے اندازہ ضد کر کے مقامی کالج میں داخلہ لے لیا۔ اماں اور دادی جان سخت خلاف تھیں اس کے دوبارہ کالج جانے کے، ان کے خیال میں اب اسے گھریلو امور میں طاق ہو جانا چاہیے تھا۔

”ہونہہ، جو طاق ہیں وہ کیا کر رہی ہیں۔“ وہ اسی لا ابالی پن کا مظاہرہ کرتی۔ ”بچے سلا رہی ہیں بچے کھلا رہی ہیں۔ نہ اپنی نیند سونا نہ اپنی نیند جا گنا۔“

”بس اس نامراد کو تو اس کی نیند لے ڈوبے گی۔“ دادی جان گڑھ کر کہتیں۔ ”کالج جانے سے آدھ گھنٹہ پہلے اٹھتی ہے۔ کالج سے آ کر کھانا کھا کر پھر سو جاتی ہے دیکھو تو ذرا، کوئی ذرا سی پکی ہو تو کہا جائے۔ اس کا اٹھان دیکھو، اس کی حرکتیں دیکھو۔“

تب وہ کھلکھلا اٹھتی۔ ”جو چاہے دیکھو بغیر ٹکٹ دیکھو۔“ وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر گنگنائی۔

چل ہٹ پرے۔ تو تو اماں بادا کا نام ہی ڈبو کر رہے گی۔“ وہ مسکرا ہٹ دبائے مصنوعی برہمی سے بولتیں۔

نغمی شام کو گھر آئی تو بتایا کہ وہ خصوصی طور سے آئی ہے کل کوئی لڑکے والے اسے دیکھنے آرہے ہیں۔

”کرتا کیا ہے وہ؟“ اس نے بغیر شرمائے پوچھا۔

”یہ تو کل ہی پتہ چلے گا کیونکہ ان لوگوں سے ابھی کھل کر بات نہیں ہوئی۔“

”اچھا تو یہ آدھی باتیں مجھ سے نہ کرو۔ کوئی بات بتایا کرو تو پوری معلومات سے۔“ وہ بولی۔

”ہاں، آپا! اب آپ کی شادی ہو جانی چاہیے۔ خدا کرے کوئی بات بن جائے۔“

”اے نفی! تو تو اس گھر سے چلی گئی ہے۔ تجھے کیوں بری لگتی ہوں میں؟“ اس نے

رسالے پر سے نظریں اٹھائے بغیر سوال کیا۔

”توبہ آپا! اس میں برا لگنے کی کیا بات ہے۔ ساری دنیا کی لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔ سب مجھ سے پوچھتے ہیں۔ تم بڑی بہن کی شادی کیوں نہیں کرتے؟ کیا عیب ہے؟ کیوں بیٹھی ہے؟“

”تو کیا سب کھڑے ہوئے ہیں جو میرے بیٹھنے پر اعتراض ہے۔“ وہ کھلکھلائی۔

حسب عادت۔

نفی چپ ہو کر رہ گئی۔



”بس کہہ دیا کوئی ضرورت نہیں سوچ بچار کی صاف ”نہیں“ کہہ دیں۔“

”کیا کی ہے مجھ میں؟“ وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ رنگت سے ملتا گلابی شلوار سوٹ گلے میں پڑا کالا دوپٹہ بجلی کی طرح کوندنا قامت۔ ڈھیلی ڈھالی چوٹی۔ غصے سے پھڑکتی حسین و مغرور ناک۔

”ہونہہ! اتنی کم تنخواہ۔ اسے کیا اپنی اوقات کی لڑکیاں نہیں ملیں جو وہ لوگ اس دیدہ

دلیری سے میرے لیے چلے آئے ہیں۔ ان سے یہ تو کہہ دیتیں شکل دیکھی ہے۔“

”اے تو کیا کوہ قاف کا شہزادہ بیانے کا وعدہ کر گیا ہے؟“ اماں اس کی بات سن چکی

تھیں اتنے صفا چٹ انکار پر بڑی طرح کھول رہی تھیں۔

”ویسے اماں! کوہ قاف کے ”دیو“ زیادہ مشہور ہیں اگر وہاں کے شہزادے کے

بارے میں سنا ہے تو وہ یہ کہ پتھر کا ہوتا ہے۔“ رخسانہ نے اسے شرارت سے دیکھ کر کہا۔

بھائی میاں! چھوٹے بھائی اور اباجی کوئی بھی اس رشتے پر راضی نہیں تھا کیونکہ وہ

لوگ ذہنی طور پر انتہائی پسماندہ نظر آتے تھے۔ مگر اماں اور دادی زمانے کی باتوں سے کچھ زیادہ

ہی خوفزدہ نظر آتی تھیں اور کچھ رضامندی تھیں مگر اس کا واضح انکار انھیں مجبور کر گیا۔

رشتے آتے رہے۔ وہ ہر مرتبہ جھنجھلا اٹھتی۔ ”یا اللہ! یہ معمولی قسم کے ملازمین میرے

لیے ہی رہ گئے ہیں۔“

”اگر میرے ملک میں ان سب کو حکومت کی طرف سے کار کوٹھیاں دی جاتیں تو ان میں سے کوئی بھی مجھے منظور ہوتا۔“

”تو گویا پیارا سا ایک بنگلہ ہو۔ بنگلے میں گاڑی ہو۔ گاڑی میں میرے سنگ سیٹاں اناڑی ہو۔“ نفی ہنسی۔

”ارے چھوڑو، نفی! دونوں ہی اناڑی ہو گئے۔ تو خدا ہی حافظ ہوگا ان کے گھر کا۔“

چھوٹے بھائی نے چھیڑا۔

”ہم تو ایسے ہی رہیں گے۔ کم عقل، اناڑی، بدھو، بس۔“

وہ صرف اسی مذاق پر چڑتی تھی جب اس کے ذہنی معیار و صلاحیت کو نشانہ بنایا جاتا۔ درحقیقت وہ تھی بھی سادہ و سطنی، خود میں گم، مگن، بے پروا۔



”اباجی! اتنی ساری لڑکیاں ہیں۔ میں کوئی اکیلی ہوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی۔ خدا جانے کہاں ماری ماری پھریں گی۔“ اماں نے قطعیت سے کہا۔ بھائی میاں نے اور چھوٹے بھائی نے اعتراض نہیں کیا۔

”اباجی! رات نہیں ہوگی۔ ہم سورج چھپنے سے پہلے آ جائیں گے۔“ اس نے لجاجت سے کہا۔

”جانے دیں اباجی! سب لڑکیاں جاتی ہیں۔“ چھوٹے بھائی نے سفارش کی۔

”اے ہاں۔ اور ڈوڈو۔“ دادی جان بڑبڑاتی تھیں۔

آخر کار اجازت مل گئی۔

اس نے میروں سادہ بڑا فٹ سا سوٹ پہنا۔ لپ اسٹک لگائی، کاجل ڈالا۔ بے حد خوشی سے اس نے اہتمام کیا۔ بی۔ اے فائل کی تمام اسٹوڈنٹ اس پنک میں شامل تھیں۔

سارا دن انھوں نے سمندر کے کنارے ہنستے کھلتے گزارا۔ تب اس نے جانے سے آدھ گھنٹے پیشتر ساحرہ کا ہاتھ تھاما اور ننگے پاؤں دوڑ نکلی گئی۔ کبھی کبھار وہ لہر آ کر آنے والی لہر سے پیشتر پانی میں جا کھڑی ہوتی، لہریں اسے چھو کر واپس پلٹ جاتیں۔ تب وہ مسرت انگیز ہنسی

ہنستی۔ ساحرہ کو پانی سے بہت خوف آتا تھا۔ تب جھاگ جھاگ پاگلوں کی طرح ٹکراتی لہر۔ اس کے پیروں سے چھو کر گئی تو اس نے ساحرہ کو پکارا۔

کلف لگا ہوا ہے۔ نہ کو تادہ تجھے بچانے کو۔“ اماں کچھ زیادہ ہی احسان مند ہو رہی تھیں۔
 ”مہرجاتی تو آپ لوگوں کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔“ اس نے کراہ کر روٹ بدلی۔
 اماں اس کی ہائے پر تڑپ کر رہ گئیں۔ اس لیے کچھ بولیں نہیں۔
 ”دیکھو..... بالکل جھٹک کر رہ گئی ہو۔ آج سے دودھ کے دو گلاس پینا۔“ بھائی میاں
 نے کہا تو وہ مسکرا دی۔



ساحرہ اور وہ تو عرصہ تک سوچ سوچ کر کا پنتی رہیں۔

”بڑا بہادر آدمی تھا۔“

”آدمی بھی بہادر نہ ہو تو گدھے بہادر ہوں گے۔ اس کو تیرنا آتا ہوگا لہذا جان بچانا
 اس کا فرض تھا۔“

”تو تو دون بعد ہوش میں آئی تھی۔ میں نے تو اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا تھا۔“
 ”ماشاء اللہ تیرا تو اٹھان بھی غضب کا ہے۔ کسی ڈبلے پتلے آدمی کے بس کی بات
 نہیں تھی۔ وہ تو پہلوانوں کو بھی مات دے گیا ہے۔ بے ہوش آدمی کا وزن تو ویسے بھی بڑھ جاتا
 ہے۔“ ساحرہ نے مزید مدح سرائی کی۔

”مگر کچھ مغرور سا تھا۔ ہم نے اس کا اتنا شکریہ ادا کیا اور اس نے جاتے ہوئے
 صرف ایک بات کی وہ بھی ڈاکٹر ہے۔“

”ہوش جلد آ جائے گا نا؟“ یوں ہی کہہ دیتا یہ میرا فرض تھا۔ کوئی بات نہیں بابا۔ کچھ
 نہیں بولا۔“ ساحرہ نے از حد حیرانی سے بتایا۔

”ویسے بھی، غرور آ ہی جاتا ہے۔ شکل بھی خوبصورت، باکسروں کی طرح جسم، اتنی
 عالی شان گاڑی، کوئی لینڈ لارڈ ہی لگتا تھا۔“

”اچھا بابا، بس کرو۔ بہت ہو گئیں تعریفیں۔“ اس نے منہ بنا کر ٹوکا۔



”اماں! گرمیاں آ گئی ہیں۔ میں ایک دو جوڑے لاؤں گی لان کے۔“

”کس کے ساتھ جاؤ گی؟“

”ساحرہ اور میں۔“

”ساحرہ! آؤ ناں..... بڑا مزا.....“ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ ساحرہ کی
 آنکھوں سے اوجھل تھی۔ ساحرہ کے حلق سے کئی خوف زدہ چیخیں اُبل پڑیں۔ وہ پاگلوں کی طرح
 پانی کی سمت دوڑی۔ پانی سے از حد خوف زدہ ہونے والی لڑکی۔ سبیلی کی خاطر پاگلوں کے انداز
 میں پانی میں اترنے لگی۔ تب کسی نے اسے بازو سے پکڑ کر خشکی کی جانب دھکا دیا۔ اور ساحرہ
 کے کانوں میں کسی وزنی چیز کے پانی میں گرنے کی آواز آئی۔ وہ بری طرح چیخ چیخ کر رو رہی
 تھی۔ دوسرے لوگ ان سے بہت دور تھے۔ وہ دونوں تو خود اساتذہ کی آنکھ بچا کر نسبتاً خاموش
 گوشے میں آئی تھیں۔

تب ساحرہ نے آنسوؤں کی دُھند میں دیکھا۔ انتہائی خوبصورت جسم کا ایک شخص
 آشیانہ کو بازوؤں میں اٹھائے باہر آیا۔ وہ سر تا پا شرابور تھا۔ وہ دیوانہ وار آشیانہ کی جانب لپکی
 جس کے چہرے پر موت کا سا سکوت تھا۔

”شانو!..... شانو!..... اوہ میرے خدا!.....“ دوسرے لمحے وہ خود بھی بے ہوش تھی۔

تب اس شخص نے انتہائی بے چارگی سے دو بیہوش خواتین کو دیکھا۔ پھر ادھر دیکھنے
 لگا۔ سامنے سے طالبات اساتذہ کے ہمراہ ان کی تلاش میں آ رہی تھیں۔ انھیں اس طرح ریت
 پر پڑا دیکھ کر تمام اساتذہ اور لڑکیوں کے چہرے فق ہو گئے۔

تب اس اجنبی نے تمام تفصیل سے مطلع کیا۔ میڈم اس کی گاڑی میں آشیانہ اور
 ساحرہ کو لے کر قریبی کلینک میں چلی گئیں۔ باقی گروپ بھی بجھا بجھا سا واپس ہولیا۔



”اس لیے ہی منع کر رہی تھی۔ موت کے منہ سے واپس آئی ہے۔ جو بچے ہٹ دھرمی
 دکھاتے ہیں، یہی ہوتا ہے ان کے ساتھ۔“ اماں اس کی حالت دیکھ کر تڑپ رہی تھیں مگر بظاہر
 پند و نصائح کے دفتر کھولے بیٹھی تھیں۔

”خدا جانے کون فرشتہ خصلت آدمی تھا۔ خدا سلامت رکھے اسے بھی۔“ دادی جان
 نے دعا دی۔

”تیرنا آتا ہوگا کو دگیا۔ اس میں فرشتہ خصلت ہونے کی کیا بات ہے؟“ اس نے کراہ
 کراہن احسان فراموش کی قبر پر لات ماری۔

”تجھے تو اس کا احسان مند ہونا چاہیے۔ اس حالت میں بھی دماغ میں اسی طرح

وہ انھیں دروازے تک لے آئی تھی۔

”آپ کا بے حد شکریہ۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کا قیمتی وقت ضائع کیا۔“ وہ انتہائی سلیقے سے کہہ رہی تھی۔ ”اگر آپ مناسب سمجھیں تو اندر آ جائیں، میں آپ کو اپنے گھر کی دو ”جلالی“ خواتین سے ملواؤں۔“ وہ شکفتگی سے ہنسی تو وہ خاتون..... بے ساختہ گاڑی سے باہر آ گئیں۔ چادل پھلتی اماں حیران ہو گئیں۔ جب اس کے ہمراہ ایک انتہائی معزز خاتون کو آتے دیکھا۔

”اماں! یہ میری ان محسن سے بڑی محسن ہیں جنہوں نے مجھے سمندر سے نکالا تھا۔ دیکھیں نا، اگر وہ نہ بچاتے تو میں مر جاتی۔ کہانی ہی ختم ہو جاتی۔ مگر ایک پاؤں میں چپل نہ ہونے سے..... سارے راستے شرمندگی کی موت سے کئی بار مرتی۔ یعنی تمام راستے مرگ و جنم کا سلسلہ چلتا رہتا۔“

”ایک دم باؤلی ہے۔ یہ کوئی کسی سے ملوانے کا طریقہ ہے۔ آئیں آپ یہاں بیٹھیں۔“ اس نے چھوٹے بھائی کی رائیٹنگ ٹیبل کی چیئر انہیں پیش کی۔ اماں کی ڈانٹ ادھوری رہ گئی۔

”دادی جان بھی آ گئیں۔ پوری صورت حال سے واقف ہو کر اماں بے زاری سے بولیں۔“

”آندھی، طوفان کی طرح ہے اس کا چلنا پھرنا، انسان گھر سے دیکھ کر جائے اپنی چیزیں۔“

”یہ تو بہن ہے ہی بے عقل۔“ اماں نے بے چارگی سے بتایا۔

وہ خاتون جو بڑی دلچسپی سے مسکرا رہی تھیں ہنس پڑیں۔ ”ارے نہیں، بڑی پیاری بیٹی ہے آپ کی۔ اور بھی بچیاں ہیں؟“

”ایک اس سے بڑی ہے اور ایک اس سے چھوٹی..... دونوں ہی بیابانی ہوئی ہیں۔ اپنے اپنے گھر خوش ہیں۔ دولڑکے ہیں۔ دونوں لڑکیوں سے بڑے ہیں۔ ایک کو تو پڑھنے کا ہی بہت شوق ہے۔ ڈبل ایم۔ اے کر رہا ہے۔ کہتا ہے اپنا اخبار نکالوں گا۔ بڑا بھی نیا نیا ملازم ہوا ہے۔“ اماں نے تفصیلی تعارف کرایا۔

”اس کی شادی کیوں نہیں کی پہلے؟ چھوٹی کی شادی۔“

”اصل میں اُسے میرے بھائی نے بچپن میں مانگ لیا تھا۔ ان کی چیز تھی، اب لیتے

کہ تب لیتے۔“

تب اماں نے کچھ رقم اسے دے دی۔ جب سے یہ حادثہ ہوا تھا۔ اماں تو بہت ہی اہم گئی تھیں۔ انھیں یہ احساس ہوتا کہ وہ اسے ہر وقت بدعا دیتی رہتی ہیں۔ اب اللہ ایک ہی کو سب کچھ نہیں دے دیتا۔ سب لڑکیوں میں حسن اور قابل رشک صحت دے کر اسے ممتاز بنا دیا تھا۔ کچھ اس نے اپنی جمع پونجی نکالی اور دونوں بازار چلی گئیں۔ کپڑا، لپ اسٹک کے نئے شیڈز، رومال اور خوبصورت آویزے۔ وہ بہت مگن رہی۔ شام بھی کافی در آئی تھی۔

دونوں اسٹاپ پر آ گئیں۔ ساحرہ کی مطلوبہ بس آ گئی۔ وہ چلی گئی۔ وہ دو قدم آگے بڑھی تو اس کی چپل ٹوٹ گئی۔ ”اودھ میرے خدا! یہاں تو کوئی سوچی بھی نظر نہیں آ رہا۔ عام سی سادہ چپل تھی جو وہ گھر میں بھی استعمال کرتی رہی تھی اور پھر شرمندگی بھی بہت ہو رہی تھی۔ وہ بے بسی سے آتے جاتے ٹریفک پر نظر ڈالنے لگی۔ اکیسے رکشا میں جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

تب اس نے سفید نئے ماڈل کی گاڑی کو دیکھا جسے ایک بہت پر وقار خاتون ڈرائیو کر رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔

”سینس، میری چپل ٹوٹ گئی ہے۔ چلتے ہوئے بڑی شرمندگی ہو رہی ہے۔ آپ کی بہت نوازش ہوگی اگر آپ۔“

”آؤ؟“ انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ پیکٹوں سمیت جلدی سے اندر بیٹھ گئی اور گھر کا پتہ بتا دیا۔

”آپ کو گاڑی چلاتے ہوئے ڈرنہیں لگتا؟“ اس نے سادگی سے پوچھا۔

”نہیں بھئی، تم سے بھی چھوٹی تھی تب سے چلا رہی ہوں۔ اب کیسا ڈر؟“ وہ مسکرائیں۔

”اچھا جب گاڑی سیدھی سیدھی جا رہی ہوتی ہے تو اسٹیرنگ کو دائیں بائیں حرکت کیوں دیتے رہتے ہیں؟“

”اس لیے کہ گاڑی بیلنس میں رہے۔“ انھوں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈال کر کہا۔

”اچھا!“ اس نے بڑے مگن سے انداز میں کہا۔ سفید کالج کے یونیفارم میں سفید انتہائی شفاف دوپٹے میں اس کا گلابی چہرہ بے حد سادہ تھا جس پر بھولپن کی چھاپ بھی گہری تھی۔ وہ بہت سنجیدہ رہتی تھی۔ تب اس خاتون نے پوچھا۔

”تم اسی طرح سنجیدہ رہتی ہو یا ہنستی بھی ہو؟“

”بہت ہنستی ہوں میں تو۔ گھر میں بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔“ وہ کھوئی کھوئی سی ہنس پڑی۔

ان خاتون کو یہ کھلا ڈھلا بے ریا ماحول بے حد بھایا۔ جب وہ جانے لگیں تو وہ بے انتہا محبت سے ملی۔ اماں نے انھیں دوبارہ آنے کا کہا اور شکریہ ادا کیا۔
 ”اور بیٹی! ہنستی رہا کرو۔ اچھی لگتی ہو۔“ انھوں نے اس کا رخسار تھپتھپایا۔
 ”بھلی عورت ہے۔ کتنی امیر زادی ہے مگر ذرا غرور نہیں، ذرا نشہ نہیں دولت کا۔“
 دادی جان نے تعریف کی۔ ”اپنے بچوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ خیر، کوئی بات نہیں۔“
 اماں نے چاول میں دوبارہ ہاتھ مارنے شروع کیے۔ ”تھی کوئی بھلی مانس۔“



وہ تو حسب عادت بھول بھال گئی۔
 آخری پیپر دے کر وہ گھر پہنچی تو پتہ چلا کہ وہی گاڑی والی خاتون آئی تھیں۔
 ”کیوں آئی تھیں؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔
 ”کیوں پابندی ہے کیا؟ محبت کی عورت ہے گزری ہوگی ادھر سے چلی آئی۔“ اماں نے سوال و وضاحت ساتھ ساتھ کی۔
 ”اچھا! انھیں یاد رہ گیا مجھے تو ذرا یاد نہیں۔“ اس نے لاپرواہی سے دوپٹہ سنبھال کر کہا۔
 ”کیوں تم کیا خاص پیمانہ ہو کہ ہر شخص کی پیمائش تمہارے حساب سے ہوگی۔“
 چھوٹے بھائی نے اسے چھیڑا۔
 ”تم تو دودھ کی دعا کیا کرو۔ بہت مشہور ہو رہا ہے آج کل کہ لوگ ”پانی میں دودھ“ ملا کر پی رہے ہیں۔“ وہ ہنسی۔

”دیکھ رہی ہیں اماں! میرے ایک گلاس دودھ کا اس گھر پر کتنا بوجھ ہے۔“
 ”اور کیا؟ چل تجھے بھی پتہ چل گیا کہ بیٹی ایک بوجھ ہوتی ہے۔“ دادی جان نے صرف بوجھ سن کر ہی گفتگو کا رخ حسب منشاء کر لیا۔
 ”اس کا تو کچھ زیادہ ہی بوجھ ہو رہا ہے۔ شکر کرتے ہیں ڈولیوں کے زمانے گئے۔ بے چارے کہا تو زمین بوس ہو جاتے جان بنانے سے زیادہ گھر کی فکر کرو۔“
 ”اماں بہت ہیں فکر کرنے کو۔“ وہ ہنسی، گویا اماں کو چھیڑا۔
 ”اے دلہن۔ کچھ کرو بھاگ دوڑ۔ کون پوچھے گا عمر نکل گئی اگر؟“ دادی جان نے

”اے اماں۔ اب تو خدا پر چھوڑ بیٹھی ہوں۔“ اماں نے ساس کو نہایت افسردگی سے جواب دیا۔

”بات تو ساری نصیبوں کی ہے۔ ایک سے ایک کم شکل مہارائیاں ہیں۔ اس موٹی میں تو اللہ نے کوئی ظاہری نقص بھی نہیں دیا۔ دونوں سے اچھی ہے۔ خدا اچھا ہی کرے گا۔“
 ”سلیقہ ہوتا تو کب کی کوئی لے جاتا۔ تم نے بھی سختی نہیں کی۔“ ساس نے بہو کو جتایا۔
 ”ہاں، بس اماں پھانسی دینے کی کسر چھوڑ دی ہے۔“ انھوں نے ساس کی بات سے اکتا کر جواب دیا اور باہر پودوں میں پانی ڈالتی شان کو آواز دیے لگیں۔



آج فراغت سے اکتا کر وہ چھتیس صاف کرنے پر کمر باندھ بیٹھی تھی۔ پُرانا سا جوڑا پہن کر سر پر پرانا منظر لپیٹ کر بڑے انتہاک سے کام میں مشغول تھی۔ پورے گھر میں اسٹول گردش کر رہا تھا۔ لپک ادھر، جھپک ادھر۔ دادی جان نہال ہو رہی تھیں۔ کئی بار سروے کر چکی تھیں اور سروے رپورٹ باورچی خانے میں بیٹھی اس کی بے خبر ماں کو پیش کر چکی تھیں۔
 ”کیا آج کوئی خاص مہمان آرہے ہیں؟“ چھوٹے بھائی نے حسب عادت مذاق کیا۔
 ”کیوں کیا گھر صرف مہمانوں کے لیے صاف کیے جاتے ہیں؟“ اس نے چھت پر ڈنڈے کو گردش دیتے ہوئے الٹا جواب دیا۔
 ”میں نے ”خاص“ کہا ہے۔“

”ایسی کوئی نیک اطلاع نہیں۔“ وہ شرارت سے ہنس پڑی۔

”اے۔ عثمان..... دیکھ تو سہی بچی نے سارا گھر ہی تو چمکا دیا۔“ دادی جان خوشی سے پوتے سے مخاطب ہوئیں۔

”لگتا ہے دادی جان۔ عقل داڑھ پوری نکل چکی ہے۔“ وہ شرارت سے بولے۔

”چھوٹے بھائی دیکھیں ہر وقت مذاق نہیں۔“ اب اسے تاؤ آ گیا۔

”اے چل چھوڑ۔ ویسے ہی تھک رہی ہے۔“ دادی جان کا مارے لاڈ کے بس نہیں چل رہا تھا۔ اسے گود میں لے کر پھرتیں۔

”آج اسے دودھ کے دو گلاس پلائیے گا۔“ بھائی بھی اسے اس طرح مصروف دیکھ کر خوش تھے مگر بظاہر چھیڑ رہے تھے۔

”چھوٹے بھائی! آپ جائیں یہاں سے۔“ وہ جھٹکا کر چیخی۔

وہ برآمدے کے ستونوں پر کپڑا مار رہی تھی کہ گھنٹی بجی۔ وہ اپنے ڈنڈے سمیت دروازے کی سمت لپکی۔

”اوہ!“ اس نے حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں۔

”آپ؟ السلام علیکم۔“

”ہاں بیٹی! وعلیکم السلام۔“ انھوں نے شفقت سے جواب دے کر اس کے دلچسپ حلیے پر نظریں دوڑائیں۔ وہ خفت آمیز انداز میں مسکرا دی اور انھیں لیے ہوئے اندر چلی آئی۔

”دیکھیں اماں! کون آیا ہے؟“ اماں باہر آئیں اور بڑی گرم جوشی سے ملیں۔

”کیسے تکلیف کی؟ آئیے اندر آجائیے۔“ وہ پڑتپاک انداز میں بولیں۔

”اب تو یہ آپ پر منحصر ہے کتنی تکلیف مزید دیں گی۔“ وہ مسکرائیں۔

اور پھر انھوں نے وہ بات کہی کہ کسی کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ رہا۔ دادی جان نے گلاس بھر پانی فوری پیا۔

”میرا سسرالی سلسلہ بے حد مختصر ہے۔ میکہ بھی چھوٹا ہے جو تقریباً پچھلے پندرہ سال سے امریکہ میں مقیم ہے۔ میں چھ ماہ پیشتر اپنے بڑے بیٹے کے پاس آئی تھی۔ سوچتی ہوں اس کا

گھر بسا دوں۔ وہ دو سال پہلے پاکستان مستقل آچکا ہے۔ ہیرا تو نہیں کہوں گی۔ عام انسان ہے۔“ ان کی آواز دھیمی ہو گئی۔ میں خود ہی اپنے میکے اور سسرال میں بڑی ہوں۔ جب جواب

لینے آؤں گی تو بہن اور بہنوئی کو بھی لاؤں گی۔ آپ اپنے شوہر سے مشورہ کیجئے۔ سوچ سمجھ کر جواب دیں میں جانتی ہوں میرے بیٹے کے لیے کیسی لڑکی موزوں رہے گی۔ اور آج بلا تکلف

میں آپ کے دولت کدے پر حاضر ہوئی۔“ اس افسار پر دونوں ساس بہو سو جان سے مرعیں۔

”آپ یہاں نہیں رہیں گی؟“ اماں نے جانے کیوں سوال کر دیا۔

”میرے دو بچے وہاں زیر تعلیم ہیں۔ ایک بیٹا وہاں پر کاروبار کرتا ہے۔ بچوں کی وجہ سے فی الحال وہیں ہوں۔ شوہر کا دو برس پہلے انتقال ہو گیا۔“ انھوں نے افسردگی سے بتایا۔

اپنے خاندان سے متعلق انھوں نے مستند معلومات بہم پہنچائیں۔ جاتے ہوئے مزید کہا کہ آپ اپنا خوب اطمینان کر لیجئے۔ اور اس رات وہ پہلی مرتبہ گم صم سی رہی۔ خدا جانے کون ہے؟ کیسا ہے؟ بالکل اجنبی

لوگ۔ اس کا دل لرز رہا تھا۔ سب تو خوش ہوں گے۔“ ہاں“ میں جواب دیں گے سب سے بڑا بوجھ جو ہوں میں۔

تمام کوائف اکٹھے کر کے غور و خوض کیا گیا۔ ابا اسے معہ بیٹوں اور بھائیوں کے دیکھ آئے تھے۔ چھوٹے بھائی نے اسے بتایا۔ ”تیس اکتیس برس کا لگتا ہے۔ بے حد سنجیدہ اور کم گوگر

بہت شاندار شخصیت کا مالک۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا یہ پیغام اس کے لیے آیا ہے۔“ انھوں نے کنکھیوں سے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اس کا اپنا کاروں کا کاروبار تھا۔ وہ لوگ اس کے شوروم

میں مل کر آئے تھے۔ اباجی نے دبے دبے الفاظ میں اماں کو سمجھایا۔ ”سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ بالکل جوڑ

نہیں ان کا ہمارا۔“ ”لوگوں کی بیٹیاں تو بادشاہوں کے ہاں بیاہ دی جاتی ہیں۔ یہ تو قسمت کے کھیل ہیں۔

اللہ جسے چاہے نواز دے۔ ترازو سے تل کر آسمان سے ٹوٹ تو نہیں آتے اس کے پاس۔ محنت کرتا ہے کماتا ہے۔“ یہ اماں کی دلیل تھی۔ پیسہ زیادہ نہیں تھا تو کیا ہوا پیشیت تو معزز تھیں۔ بڑی خود اعتماد

تھیں وہ۔ اسے کہتے ہیں نیت صاف منزل آسان۔ اگلے دن رخسانہ آئیں تو کہنے لگیں۔

”اب تو چاہے روز گازی بدل لیتا۔“ وہ مسکرائیں۔

”ارے نہیں، ایسا نہ کر دینا۔ دیکھنے والے کارڈیلر کے بجائے موٹر مکینک کی بیوی سمجھنے لگیں گے۔“ بھائی میاں نے برجستہ کہا۔ تو سب بے تحاشا ہنسنے لگے۔ پل کی پل میں خوشیاں اتر آئی تھیں۔

کچھ زیادہ ہنگامہ نہیں ہوا جب وہ نکاح سے پہلے خاموش بیٹھی تھی۔ بارات آ چکی تھی۔ تب اس کی ساس ایک خوبصورت سی لڑکی اور نکھرے نکھرے نوجوان کے ساتھ اس کے پاس چلی آئیں۔

”یہ ہیں بیٹا! تمہاری بھابی..... آشیانہ۔“

زرد سوٹ میں نہائی دھوئی کورے کاغذ کی طرح اُجلی اور صاف بھابی جو اپنی سادگی سمیت دونوں کو بے حد کیوٹ لگی تھی۔

”بھیا نے دیکھا ہے ماما؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”ہوں۔ تصویر دکھائی تھی۔“ انھوں نے جواب دیا۔

”یہ تمہاری نند ہے بیٹا! فرحت افزا اور یہ دیور..... میرا نمبر تین بیٹا عظیم۔ تمہارا دوسرا دیور جو ان دونوں سے بڑا ہے اعظم، وہ نہیں آسکا۔ اس نے تمہارے لیے بڑے پیارے پیارے تحفے بھجوائے ہیں۔“ وہ سر جھکائے ان کی باتیں سنتی رہی۔

بچے قطعی یورپین طرز کے نہیں تھے۔ مشرقی تہذیب کی چھاپ ان پر نمایاں تھی۔ جو شاید ان کی ماں کا کمال تھا۔ اس کی سہیلیاں آگئی تھیں۔ ساحرہ اس کی عزیز سہیلی کا بھی آج کے دن نکاح تھا۔ اس کا شوہر باہر جا رہا تھا۔ امیر جنسی تقریب تھی آج اس کے ہاں بھی۔ اسے بہت افسوس ہوا تھا اس کے نہ آنے کا۔

جب دلہن بنی آشیانہ کو فرحت افزا نے دیکھا تو مبہوت ہو کر رہ گئی۔ سرخ لباس سرخ نگینے جڑا سیٹ۔ صرف سرخ گلاب کے ہار اور گہنے۔ روپ بھی کسی کسی کو پوچھتا ہے اور فرحت افزا نے کھڑے کھڑے اس کے پوز کیمرے میں محفوظ کر لیے۔

وہ آج بے تحاشا روٹی تھی۔ ایسے رونے کا کبھی تصور نہیں تھا۔ خود بخود دل بھر آ رہا تھا اور آنکھیں برس رہی تھیں۔ تڑپ تڑپ کر، پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔

اور پھر اسے سہارا دے کر سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس سرخ گلابوں میں چھپے ڈینٹ سے انسان کے پہلو میں بٹھا دیا گیا۔ اس کے اپنے وجود سے اٹھتی خوشبوؤں پر اس شخص کی مہک حاوی ہو گئی۔ دائیں طرف معظم (اس کا شوہر) اور بائیں جانب اس کی ساس اور فرحت تھیں۔ اسکا پہلو محسوس کر کے اس نے سمٹنا چاہا مگر یہ ممکن نہ تھا۔ اس پہلو، اس شانے کی اس کے ماں باپ اور اسکے دل نے بڑی بھاری قیمت ادا کی تھی۔

سسرال میں عجب تماشا تھا۔ گھنٹوں اس کا گھیراؤ رہا۔ کوئی مووی بنا رہا تھا۔ کوئی جامد تصویر۔ کیمرے۔ فلش۔ ایک چکا چونڈ تھی۔ اس کے ہمراہ رخسانہ باجی تھیں۔ وہ بھی بوکھلا کر رہ گئیں۔ جب رات دو بجے اس کے رشتے کی جھٹائی اسے کمرے میں لائیں تو بڑا الٹا حساب تھا۔ معظم بیڈ پر نیم دراز کسی کتاب میں مصروف تھے۔

”ارے بھئی، آپ پہلے سے موجود ہیں یہاں؟“ بھابی ہنسیں۔

”بہت شور تھا باہر، کچھ تھک بھی گیا ہوں۔“

من جھنجھوڑتی بھاری سی آواز تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

معظم نے اسے دیکھا۔ تصویر سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ بھابی کی موجودگی کا احساس تھا۔ اس لیے فوری نظروں کا رخ بدل دیا۔

وہ اسے بیڈ پر نکا کر واپس پلٹ گئیں۔

اس کی عجیب کیفیت تھی۔ حرکت کرتے ہوئے ایک شرگیں سا احساس دامن گیر تھا۔

”ایزی ڈارلنگ۔“ وہ پردے برابر کرتے ہوئے بولے۔

وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

تب گھونگھٹ الٹ دیا گیا اور معظم ٹھک گئے۔ ایک بھگا وجود..... ان کے بازوؤں میں جھولنے لگا۔ وہی..... بالکل وہی۔ وہ پہچان چکے تھے۔ اس قدر مناسب لڑکیاں بہت کم ہوتی ہیں جو حسین بھی ہوں اور ان کا سراپا بھی ان کی خوبصورتی کا ہمسرہ ہو۔

انھوں نے اسے ٹھیک سے بیٹھنے کو کہا۔ مگر وہ اسی طرح ساکت رہی۔ انھوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ تو اس نے اپنے وجود کا ہر حصہ چھالیا۔

انھوں نے اس سے زیادہ باتیں نہیں کیں۔ پھر بھی جو کچھ کہا اسے اچھا لگا۔

اور پھر جب وہ دنیا کا مکروہ ترین مشروب پی کر آئے تو اس کا دم اٹنے لگا۔

اور انہی گھنٹی ہوئی سانسوں کے دوران اس پر حیرت ناک انکشاف ہوا کہ یہ وہی محسن ہے جو سمندر کی لہروں سے لڑ کر اسے جیت لایا تھا۔

پھر انھوں نے بہت کچھ کہا۔ مگر وہ دم سادھے رہی ایک ٹک ساکت۔

اور جب وہ بے خبر سو گئے تو آہستگی سے اٹھی۔ اپنا دوپٹہ تہہ کیا۔ اس کا ذہن گہری سوچوں میں گم تھا پھر اس نے سنگھار میز کے مقابل کھڑے ہو کر اپنا ایک ایک زیور اتارا۔ اس کے ناک اور کان سخت دکھ رہے تھے۔ گلے پر ٹیکس، مالا اور ہار کے نشان پڑ گئے تھے۔ اس نے اپنے نکھرے بالوں کو سمیٹا۔ اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ عجب دیو مالائی حسن تھا۔ اس نے آنکھوں میں جھانکا تھکی تھکی سی آنکھیں، خوابیدہ آنکھیں۔ آرزو شکستہ آنکھیں۔ تب وہ ہتھیلی میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کیوں؟ وہ خود بھی نہ جان سکی۔



جب صبح اس کی آنکھ کھلی تو رات کی تھکی ماندی خواتین ہشاش بشاش تھیں۔ کوئی پردے سرکار ہی تھی کوئی اس کا زیور ڈبوں میں لگا رہی تھی۔

ولیمہ شام کا تھا۔ دوپہر گیارہ بجے وہ گھر چلی آئی۔ فرحت اس کے ہمراہ تھی۔ باقی لوگ واپس چلے گئے تھے۔ اسے چھوڑ کر تب ہی ساحرہ آ گئی۔ کیونکہ فرحت افزا سے بے حد پسند آئی۔ فرحت افزاء کی موجودگی کے سبب وہ سکھی ہے۔ بے تکلفانہ گفتگو تو نہ کر سکی، پھر بھی کوڈورڈز میں باتیں کر رہی گئی۔ اس نے جان بوجھ کر رات کا انکشاف نہیں دہرایا کہ دیکھتے ہیں ساحرہ، معظم کو پہچانتی ہے یا نہیں۔

رخسانہ باجی اور نعمانہ بھی وہیں آ گئیں۔
 ”آپاشانو! کوئی زیور تو پہن لینا تھا۔“ نفی نے ٹوکا۔
 ”زیور ہی زیور ہیں بھابی کے پاس۔ ویسے یہ بغیر زیور کے زیادہ پیاری لگتی ہیں۔“
 فرحت نے پیار سے کہا۔

”پتہ ہے بھابی! ساجد بھائی کی دلہن رات کیا کہہ رہی تھیں؟“ سب نے سوالیہ انداز میں فرحت کو دیکھا۔

”کیا کہہ رہی تھیں بھیا سے کہ دلہن کا نام آشیانہ ہے۔ تم اپنا نام ”آباد“ رکھ لو۔ مسز آشیانہ آباد خوب سوٹ کرے گا۔“ فرحت کی بات سن کر سب بے ساختہ ہنس دیے۔
 رخسانہ نعمانہ کو اس کی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔ کتنا دولت مند گھرانہ تھا مگر غرور کسی میں نہ تھا اور پھر جب ساحرہ نے معظم کو دیکھا۔ تو بے ساختہ اُچھل پڑی۔

”اے شانو! جو سامنے براؤن سوٹ میں ہے وہی معظم ہیں نا..... یہ تو وہی ہیں جنہوں نے تمہیں پانی سے نکالا تھا۔“ دلہن بنی آشیانہ نے دھیرے سے نظریں اٹھا کر اثبات میں سر ہلادیا۔

”بھئی، اس وقت تو بڑے مغرور سے لگے تھے۔ فوراً ہی کلیںک سے چلے گئے تھے۔ ویسے کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔
 ”ہونہہ! صرف ٹھیک ہیں۔ ارے شاندار۔ تجھے پتہ ہے یہ وہی حضرت ہیں جو.....“
 ”مجھے پتہ ہے۔ انہوں نے بتا دیا تھا کل۔“ اس نے بات کاٹی۔
 ”تو مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ وہ خفگی سے بولی۔
 ”کیا بہت ضروری تھا؟“ وہ مسکرائی۔

”ارے بھئی۔ دلہن بیگم اتنی لاپرواہی اچھی نہیں ہوتی۔ بے حد قیمتی زیورات ہیں۔ یہ دیکھو اس لاکر میں رکھ رہی ہوں۔ اٹھا کر اپنی مرضی سے کہیں رکھ دینا۔“
 ”اگر اور نیندا رسی ہو تو ہم چلے جاتے ہیں۔“ انہوں نے اسے بے خبر انداز میں بیٹھا دیکھ کر کہا۔

خوبصورت جوڑا کھل جانے پر اس کے ریشمی بال پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ پڑے تھے۔ مئے مئے میک اپ کے نشان
 ارے بھئی۔ تم نے لباس بھی تبدیل نہیں کیا تھا۔ ہاتھ روم میں تمہارا لباس موجود تھا۔“ بھابی نے کہا۔

”اب پہن لوں گی۔“ اس نے لب کشائی کی۔

ایک زوردار قہقہہ پڑا۔

”بھئی وہ شب خوابی کا لباس ہے۔ ویسے کا شانہ جوڑا نہیں۔ واقعی بہت نیندا رسی ہے۔ مگر یہ روزانہ کی مجبوری ہے۔ اب نیندیں تمہاری نہیں رانی! ساجن کی ہیں۔ چلو اٹھو۔ غسل سے فارغ ہو جاؤ۔ تیار ہو جاؤ اچھی طرح۔ ناشتے پر تمہارا انتظار ہے۔“
 بے حد خوبصورت پیازی کلر شلوار سوٹ منتخب کر کے وہ اسے دے گئیں۔

ان کے جانے کے بعد کمرے میں سکوت سا چھا گیا۔

وہ نہادھو کر بالوں کو برش کر رہی تھی، ہلکے سے میک اپ کا بھی نشان نہیں تھا۔ تب ہی اس کی ساس آ گئیں۔ اس نے آداب کرنے سے پہلے انہیں بغور دیکھا۔ وہ شیشا سی گئیں۔ تب اس نے بغیر کسی جذبے کے انہیں آداب کہا۔

”خوش رہو۔ چلو دلہن! تمہارا انتظار ہو رہا ہے ناشتہ پر۔“ اسی وقت فرحت افزا بھی داخل ہوئی۔

”ماما! لے بھی آئیں بھابی جان کو۔ اوہ، پیاری بھابی لوگ میک اپ کر کے حسین لگتے ہیں۔ اور آپ بغیر میک اپ کے۔“ اس نے پُرستائش نظروں سے اسے دیکھا۔
 ڈرائیونگ روم کی وسیع و عریض ٹیبل پر کافی لوگ تھے۔ سب ہی ان لوگوں کے قریبی رشتہ دار تھے۔ معظم نے اسے دیکھا اور مسکرائے۔
 اس نے اپنی مسکراہٹ ہونٹوں میں جذب کر لی۔

جانے کا بہانہ ہوا۔ دو سال شکاگو جیل میں رہا ہوں۔ ماما نے زبردستی مجھے پاکستان بھیجا۔ بہت خوف زدہ ہیں مجھ سے۔ تم نہ ڈرنا۔ جو ڈرتا ہے وہ مرتا ہے۔ پتہ ہے نا تمہیں؟“
وہ بمشکل انھیں بیڈ تک لائی۔ نیکیے پر سر رکھ کر وہ بری طرح رو دی۔ ”ماں! کوئی گھڑی ہنسنے پر بدو عادی تھی؟ وہ کوئی گھڑی تھی جب تو نے ہنسنے پر کوسا تھا؟“

فرحت اور ماما تو فوراً ہی امریکہ چلی گئیں۔ وہ اتنے بڑے ڈھنڈار سے گھر میں بولائی سی پھرا کرتی۔ اماں کی طرف کم ہی جاتی تھی۔ جس دن جانا ہوتا صبح ہی معظم سے کہہ دیتی۔
”آج اماں کی طرف جاؤں گی۔ شام کو لیتے آئے گا۔“
یہ سوچ کر وہ اور بھی کم میکے جاتی تھی کہ معظم کو اس کا جلد جانا ناگوار نہ گزرے۔ وہ لحاظ کی سرحد درمیان میں رکھ کر اپنے خوف کو کچھ کم کرنا چاہتی تھی۔
کبھی کبھار رخسانہ باجی کے ہاں اور نعمانہ کے ہاں چلی جاتی۔ جب بھی وہاں جاتی ڈھیروں پھل مٹھائیاں لے جاتی۔ وہ دونوں اسے بہت ٹوکتی تھیں کہ اتنا خرچ مت کیا کرو۔ میاں کے علم میں لا کر ہر کام کیا کرو۔

دولت نے آشیانہ میں کوئی چھچھور پن پیدا نہیں کیا تھا۔ اپنی پسند کے سادہ سادہ کپڑے پہنتی یا پھر ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں۔ نہ آئے دن شاپنگ سینٹر جاتی نہ سب میں بیٹھ کر اپنی امارت کے قصے چھیڑتی۔ اماں کے ہاں جاتی تو فوراً گھر کے کاموں میں لگ جاتی کہ انھیں میری امارت کا احساس نہ ہو۔ کوئی احساس کمتری نہ ہو۔ اس کے اپنے گھر میں ڈش واشر سے برتن دھلتے تھے۔ اماں کے ہاں آ کر راکھ سے پتیلیاں رگڑتی، اباجی کے پرانے کپڑے رفو کرتی۔ اس کا کتنا جی چاہتا اباجی کے لیے قیمتی شیر و انیاں سلوائے، قیمتی لان کے کرتے بنوائے۔ انھیں قیمتی آرام دہ چپل لا کر دے۔ اپنی درجنوں سونے کی چوڑیوں میں سے چار ماں کے ہاتھ میں ڈال دے مگر وہ جانتی تھی اس کے گھر کا کوئی فرد اس سے چند سکے بھی لینا ناگوار نہیں کرے گا اور وہ ان کی خودداری کو تازیانہ نہیں مارنا چاہتی تھی۔ البتہ اتنا ضرور کہہ دیا:

”اماں! اب تو بھائی میاں اچھی پوسٹ پر ہیں۔ گھر کے کاموں کے لیے ملازمہ رکھ لیں۔ تھک جاتی ہوں گی۔“

”ساری عمر کام کیا ہے۔ کیسا تھکا؟ بہوئیں آ جائیں تو وہ کریں گی اب تو، چاہے خود

”یہ بتاؤ۔ کیسی عادت ہے؟ پسند تو آئے نا تمہیں؟“
”ابھی سے عادتوں کا کیا پتہ؟“ اس کی آواز جھمی اور سنجیدہ ہو گئی۔
”ویسے کنٹرول رکھنا۔ بڑے آفت ہیں۔“
”میں جانتی ہوں کس قدر کنٹرول کے لائق ہیں۔“ اس نے افسردگی سے سوچا۔

اور..... آج پھر جب وہ شغل کر رہے تھے۔ تو وہ ان کے پاس چلی آئی..... کراہت ہونے کے باوجود۔
”سنیں۔ کیا بہت ضروری چیز ہے یہ؟“
”دیکھو! آج سے ایک عہد کرو۔ تم میرے کسی معاملے میں نہیں بولو گی۔ ماما مجھے کہہ رہی تھیں تمہارے سامنے اس قسم کے مظاہرے نہ کروں۔ مگر بھئی، بیوی سے ڈرنے اور چھپانے کا میں قائل نہیں۔“ انھوں نے گلاس ہلا کر برف گھلانے کا عمل کیا۔
”اس سے بہت بری بو آتی ہے۔“ اس نے ناک سکڑ کر کہا۔ ”صحت الگ خراب ہوتی ہے۔“

”اب میں تمہاری خاطر اس میں پر فیوم چھڑکنے سے تو رہا۔“ عجیب روکھائی سے جواب ملا۔

”مجھے اپنی لک پر ناز ہے۔ تمہیں ایک بات بتاؤں۔ میں شطرنج میں کبھی نہیں ہارا۔ ریس سے جب بھی واپس ہوتا ہوں، میرے بینک بیلنس میں لاکھوں روپے کا اضافہ ہوتا ہے۔ شرط کبھی نہیں ہاری۔ کسی بھی حسین عورت کے لیے مجھے کبھی کوئی جتن نہیں کرنا پڑے۔“
نشہ آہستہ آہستہ تیز ہو رہا تھا۔ اسے گھبراہٹ محسوس لگی۔

”ماما کے خیال میں، میں غلط چل رہا ہوں۔ وہ میرے لیے مڈل کلاس ایسٹرن گرل چاہتی تھیں۔ میں نہیں مانتا تھا، میں جانتا ہوں ان لڑکیوں کو۔ شیشہ سمجھتی ہیں خود کو، ان کی مٹی میں صرف گناہ ثواب ہوتے ہیں۔ مذہب اچھی چیز ہے۔ اور میں تمہیں کسی چیز کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔“

اور وہ ایک سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔
معظم نے اپنا پورا بوجھ اس پر ڈال دیا۔ ”تم میری قسمت میں تھیں شاید تبھی جیل

کریں یا نوکرانیاں رکھیں۔“ اماں نے اسے محبت سے دیکھ کر جواب دیا۔
 ”دیکھا اماں! میں نہ کہتی تھی شادی کے بعد سب عقلیں آ جاتی ہیں۔ دیکھو کتنا
 احساس کرتی ہے۔“

”مگر چپ چاپ رہتی ہے۔ وہ شانو تو لگتی ہی نہیں۔“ اماں نے ساس سے کہا۔
 ”اے ہاں ڈہن! اب ذمہ دار ہو گئی ہے نا..... خدا نصیب اچھا رکھے۔“ انھوں نے
 بھی محبت بھرے لہجے میں کہا۔
 ”کیا بات ہے شانو! بہت جھک کر رہ گئی ہو دودھ نہیں ملتا؟“ چھوٹے بھائی نے
 مذاق کیا۔

”دودھ تو بہت ہے ہر جگہ۔ بس دل ہی نہیں چاہتا۔“ اس نے بجائے چڑنے کے
 بڑے گم صم انداز میں جواب دیا۔



”سنیں..... آپ کیوں پتے ہیں؟“ آج اس نے ہمت کر کے کہہ دیا۔
 ”ہونہہ..... کل کو کوہی ریس کیوں کھیلے ہیں؟ اتنی حسین گرل فرینڈز کیوں بناتے
 ہیں؟ اپنی اوقات میں رہو۔ آشیانہ بیگم! میں نے شادی اس لیے نہیں کی کہ میں تم پر عاشق ہو گیا
 تھا۔ اس لیے نہیں کی کہ مشرق پرست ہوں۔ صرف اور صرف اس لیے کہ میری عمر بھی ایسی تھی۔
 میں اس اسٹینڈرڈ سوسائٹی میں بغیر مسز کا تھا۔ اس پر میری ماں کا اصرار۔ اچھا ہے گھر میں بیوی
 بھی ہو کیونکہ گرل فرینڈ اور بیوی میں بہر حال فرق ہوتا ہے۔ وہ اس قابل نہیں ہوتیں کہ انہیں
 مستقل گھر میں جگہ دی جائے اور تم مجھے ٹوکنے کی خطرناک غلطی نہ کرنا۔ یہ کام تو میری ماں نہ کر
 سکی۔ شاید تم جانتی ہو میرے والد نے مجھے عاق کر دیا تھا۔“
 یہ نیا دھماکہ تھا۔

”اور انھوں نے میری شکل نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی۔ مگر ان کے انتقال کے بعد ماما
 نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ مگر ایک اہم قانون شکنی کے بھگتان پر میں دو سال شکاگو جیل رہا۔
 وہاں سے رہا ہوا تو ماما نے مجھے پاکستان بھجوا دیا۔ اور میں نے اپنا بزنس کر لیا یہاں۔ مجھے کہتی
 تھیں تمہیں کوئی حد درجہ مشرقی لڑکی لا کر دوں گی، بیوی کی شکل میں تاکہ وہ تمہیں سنوار دے۔“
 وہ بڑی سچائی سے اسے تمام باتیں بتا چکا تھا۔ وہ جو ماما سے سخت بدظن ہو گئی تھی۔ ان

پر ترس آنے لگا۔

”تو ماما یہ بھایا تھا تمہیں قربانی کا جانور۔“ اس نے زہر خندانہ انداز میں سر کو جھٹکا۔
 ”ہاں تو بھئی۔ کیا کیا سنوارو گی میرا؟“

اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ گولڈن ٹائٹ گاؤن اور چمکتے سیاہ بال دونوں بازوؤں کا
 ٹکیہ بنائے۔ وہ اسے بڑی طنزیہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر دیکھ رہے تھے۔
 ”کاش، تمہارے اعمال بھی تمہارے ظاہر کی طرح حسین ہوتے تو میں خود کو خوش
 قسمت ترین لڑکی سمجھتی۔ لعنت ہے اس عورت کی زندگی پر جسے اپنے شوہر کی وفا نہیں حاصل نہ
 ہوں۔ جو باہر چلا جائے تو دل دوسووں میں گھر کر رہ جائے۔ جو رات کی تاریکی میں کھڑکی
 دروازوں سے لگ کر اندازوں سے کھیلے۔ اب آتا ہو گا تب آتا ہو گا۔“
 وہ الماری کی جانب بڑھے تو جھٹکے دینے سے دروازہ نہ کھلا۔
 ”کیا یہ لاکڈ ہے؟“ وہ گھوڑے۔

”مجھے کیا پتہ؟ میرا تو اس الماری سے کوئی واسطہ نہیں۔“ اس نے لاپرواہی سے
 جواب دیا۔

”مگر میں نے کبھی اسے لاک نہیں کیا۔“ اس بار ان کی آواز میں ترشی تھی۔

”تو پھر مجھے کیا پتہ؟ چابیاں ادھر ہیں، دیکھ لیں۔“ اندر ہی اندر اس کا کلیجہ کانپ رہا
 تھا۔ انھوں نے چابیاں لگائیں کوئی بھی فٹ نہیں تھی۔

”میں کہتا ہوں اسے بند کس نے کیا؟“ پل بھر میں وہ وحشی ہو گئے۔ بلوریں گلدان
 اٹھا کر سنگھار میز کے آئینے پر دے مارا۔ وہ لپٹی ہوئی اندر ہی اندر کانپ رہی تھی لیکن بظاہر بے
 نیاز تھی۔

انھوں نے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ آسمانی ٹائٹ ڈریس میں وہ خوف زدہ
 انداز میں ہونٹ چبا رہی تھی۔

”بتاتی ہو یا نہیں؟“

”میں کہہ رہی ہوں مجھے کوئی پتہ نہیں۔ صفائی فاطمہ نے کی تھی۔“

”بکو اس بند کرو.....“

ہزار بار کہہ چکی ہو کہ میرے وجود سے اس کی بو آتی ہے۔ تو دفعتاً ہو جاؤ کسی اور

مسئلہ حل کیا۔ کیونکہ دو چار آدمی دو پہر کو ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔ اپنے کمرے میں آئی تو رات کا نقشہ نظروں میں گھوم گیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کہاں سے لاؤں وہ آغوش جس میں سر دے کر اپنا دکھ کہوں۔ دو پہر کو حسب توقع وہ کھانے پر آ گئے تھے۔ کسی انداز سے شرمندگی نہیں جھلکتی تھی۔ وہ ملازم کے ساتھ مل کر کھانا لگوانے لگی۔

”یہ ڈرینگ ٹیبل وہیں کا وہیں ہے؟“ وہ اس کے سر پر کھڑے پوچھ رہے تھے۔

”پھر میں کیا کروں؟“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”نوکر سے کہہ کر اس کا آئینہ نہیں بدلو سکتی تھیں؟“

”اچھا، بدلوادوں گی۔“ سادگی سے جواب ملا۔

”کبھی خود سے بھی کچھ کر لیا کرو۔ ضروری ہے کہ ہر بات کے لیے کہا جائے۔“

وہ خاموش رہی، نیکیں میز پر رکھ کر وہ ان کی طرف دیکھے بغیر باہر آ گئی۔

خدا جانے یہ صبر و تقویٰ تھا کہ کیا تھا۔ اس نے کبھی بیرونی دنیا پر کچھ ظاہر نہیں کیا۔

ماں پوچھتیں۔ ”خوش تو ہو بیٹی؟“

”خوش نہ ہونے کی وجہ؟ اپنا گھر ہے، اپنی چھت ہے۔“ عجب بے نیازی سے جواب ملا۔

”بہنیں پوچھتیں۔“ ایڈ جسٹ ہو گئی ہو۔ کیسے رہتے ہیں تمہارے ساتھ؟“

”جیسے شوہر رہتے ہیں۔“ بڑے سپاٹ سے انداز میں جواب ملا۔

”آتے کیوں نہیں؟“

”فرصت نہیں۔“

”پہلے کی طرح کیوں نہیں رہتیں خوش باش، کیا کمی ہے؟“

”خوش ہوں اور کس طرح رہوں؟ آپ لوگ کیا خوشی کے اظہار کے لیے ڈھول

پیتے ہیں؟“ سرد مہری سے جواب ملا۔ پرسان حال خاموش ہو جاتے۔ کیسا نہ سمجھ میں آنے والا

روایہ تھا۔

آج وہ ایک حسین و معصوم بیٹی کے ہمراہ گھر میں داخل ہوئی۔ تو گھر پہلے سے زیادہ

اپناگا۔ پہلے سے زیادہ مضبوط۔

وہ اسے ہاسٹل لینے آئے تھے۔ اس کا سامان گاڑی میں خود رکھا تھا اور اسے سہارا

کمرے میں۔

بتا دو چابی کہاں ہے۔ وگرنہ مجھے سلطان کے پاس اسی وقت جانا پڑے گا۔ اسی سے منگوا لوں گا۔ جو تم کر رہی ہو اس میں ناکام رہو گی۔“ وہ جنونی لگ رہے تھے۔

”مجھے کچھ پتہ نہیں۔“

انہوں نے اس کے گاؤں کی فرل کو زور سے جھٹکا دیا۔ مگر وہ بھی کوئی سیخ سلائی نہیں تھی۔ ان کا ہاتھ اپنے گلے سے جھٹکے سے ہٹا کر بولی۔

”آپ اس قدر زیادتی نہیں کر سکتے۔ جس چیز کا مجھے کوئی علم نہیں۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ کیا بتا سکتی ہوں؟ ہٹیں میرے سامنے سے میں جا رہی ہوں اس کمرے سے۔ کیا میں اس گھر میں سو بھی نہیں سکتی آرام سے؟“ وہ کوئی کم تھی۔

”زیادہ ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نکالو چابی۔ کہاں ہے؟“ انہوں نے اس کا رخسار سرخ کر دیا۔

”جنگلی.....“ وہ تڑپ کر رہ گئی۔

”شرم نہیں آتی تمہیں اتنے بے ہودہ طریقے سے جواب دیتے ہوئے۔“ وہ مزید بھڑک گئے اور ان کے تشدد سے ناک سے خون بہہ نکلا۔ وہ وہیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ تو عادی پینے والے تھے۔ ذرا سی رکاوٹ بھی برداشت نہیں ہوتی تھی۔

تب اس نے بیڈ کے نیچے سے چابی نکال کر ان کی سمت پھینکی۔ خود ناک پر ہاتھ رکھ کر ہاتھ روم میں چلی گئی۔

”بے وقوف۔ بدتمیز۔“ وہ چابی پا کر اسے اردو، انگریزی میں گالیاں دینے لگے۔ فرسٹ ایڈکس سے اس نے دو الگائی اور گاؤں بدل کر ماما کے بیڈ روم میں چلی آئی۔



صبح وہ سو کر ابھی تو جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ بہر حال، اٹھنا تو تھا، گھر بھی دیکھنا تھا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو پتہ چلا صاحب جا چکے ہیں۔ اس نے ٹائم دیکھا نو بج رہے تھے۔

اس بات کی توقع فضول تھی کہ وہ معذرت کریں گے۔ خدا جانے اسے نباہنے کے ہنر کہاں سے آ گئے تھے۔ لڑکر میکے جانے کا تو خیال بھی دل میں نہ لاتی۔

اس نے برائے نام ناشتہ کیا۔ گھر کی صفائی کروائی۔ دو پہر کے کھانے سے متعلق

دے کر گاڑی تک لائے تھے۔ بیٹی کا نام انھوں نے اپنی پسند سے گل رکھا تھا۔ ان کے اس انداز سے اسے بہت سکون محسوس ہوا تھا۔ مگر ان کے اپنے معمولات وہی تھے۔ وہ حقوق جو انھوں نے بیوی کے نام کرنے کا وعدہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کیا تھا۔ وہ آدھے سے بھی کم اسے ملتے تھے۔ محبتوں اور الفتوں کی بارشیں باہر ہوتی تھیں۔ اس کے حصے میں صرف چھینٹے آتے تھے۔

اور ایک روز وہ آ کر انتہائی درشتگی سے اپنی نائی کھینچ کر اتار رہے تھے۔

اس نے مزاج آشنا و فادار بیوی کی طرح سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھا۔

”گلتا ہے تمہاری بیٹی سخت منحوس ہے۔ تین سو چوبیس میرے لیے ہمیشہ لگی رہا ہے۔

آج ایک لاکھ روپے ہار کر آ رہا ہوں۔ سنا تم نے؟“

”میری ہی بیٹی نہیں۔ آپ کی بھی.....“ اس نے تصحیح کی۔

”ہونہہ!“ انھوں نے کوٹ اچھال کر ایک طرف پھینکا۔

”یہ تو ایک نیک فال ہے۔“ اس نے سوچا۔

”جو ہارتا چلا جائے تو کیا وہ جوئے، ریس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے؟“ اس نے بے

خونی سے سوال کیا۔

”جی نہیں، سڑک کے کنارے کٹورہ لے کر بیٹھ جاتا ہے۔“ وہ بھڑک کر بولے۔

”ضروری ہے کٹورہ لیا جائے۔ ہاتھ پاؤں کی سلامتی کے ساتھ وہ سامان بھی ڈھو

سکتا ہے۔“

”تمہاری تو نیت یہی ہے۔ تمہاری تو اوقات ہی یہی تھی۔“

”چلی جاؤ میرے سامنے سے۔ ورنہ کچھ کر بیٹھوں گا۔“ وہ دھاڑے۔



اس کے دیور اعظم کی شادی ان دنوں ہوئی تھی۔ جب وہ سفر کے قابل نہ تھی۔ ماما

فون پر اس کا احوال پوچھتی رہتی تھیں اور ہر مرتبہ اس کے منہ سے سن کر کہ ”خوش ہوں“ ان کے

دل سے بوجھ سارک جاتا۔ معظم شادی میں شرکت کے لیے دودن کے لیے گئے تھے۔ ماما کی

مرضی سے ہی اعظم کی شادی وہاں مقیم پاکستانی فیملی میں ہوئی تھی۔

گل۔ اب تین سال کی ہو گئی تھی۔ ماما اصرار کر کے اسے امریکہ بلاتی تھیں۔ اس

مرتبہ ان کا پروگرام امریکی ریاستوں کی سیر کا تھا۔ وہ اسے شامل کرنا چاہتی تھیں۔

وہ گل کو کے جی کا سسر میں دے چکی تھی۔

تب اعظم اور عظیم کے بھی بے حد اصرار پر معظم نے اسے جانے کو کہا۔

”ایک دو ہفتے کی بات ہے۔ گل کو یہیں رہنے دو۔ آیا ہے اس کے پاس۔ نانا نانی

ہیں، میں ہوں۔“

تب وہ امریکہ چلی آئی۔ ایئر پورٹ پر سب انھیں ریسیو کرنے آئے ہوئے تھے۔

ماما نے اسے گلے لگایا۔ تو اس کا دل بھر آیا۔

”راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“ انھوں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ویسے میری تو کمر دکھ رہی ہے بہت لمبا سفر تھا۔“ اس نے

تھکی تھکی آواز میں اسے بتایا۔

”اور بھی گل نہیں آئی؟“ فرحت نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”انھوں نے آنے ہی نہیں دیا۔ کہہ رہے تھے چند دنوں کی

بات ہے تم آرام سے تفریح کر آؤ۔ ڈسٹرب کرے گی تمہیں۔“

”اچھا!“ ماما کی خوشی میں تحیر تھا۔

”اور بھئی، اعظم کی دلہن سے تو تمہارا تعارف نہیں کرایا۔ یہ زہرہ ہے۔“ انھوں نے

چھوٹی بہو کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے زہرہ کو گلے لگا کر پیار کیا۔ نازک سی زہرہ بہت پیاری تھی۔ چہرے پر بکھری

مسکراہٹ اسکی خوش اخلاقی کی مظہر تھی۔

”اوہ بھابی! گل کا تو اتنا انتظار تھا۔ رات بھیا کا فون آیا تھا۔ انھوں نے بھی نہیں بتایا۔

بس صرف اتنا کہا کہ آپ کو لینے پہلے پہنچ جائیں تاکہ آپ پریشان نہ ہوں۔“ عظیم نے بتایا۔

”ہاں، بھئی، مجھے بھی اس کا بے حد افسوس ہو رہا ہے۔ لے آئیں اسے بھی۔“ ماما نے کہا۔

”ویسے کیسی ہو رہی ہے؟“ انھوں نے محبت سے پوچھا۔

”بہت شرارتی ہے ماما۔ تنگ آ جاتی ہوں۔“ اس نے ہنس کر بتایا۔

پھر وہ ان کے ہمراہ گھر چلی آئی۔ بہت خوبصورت لگا۔ مگر اس کے اپنے گھر سے کم

تھا۔ وہ وسیع عریض گھر کہ بچہ اس میں کھو جائے تو بمشکل ملے۔ پانچ بیڈروم نیچے، سات اوپر۔

جب ہی وہاں ہو کا عالم تھا۔ اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں کس قدر خوشیاں تھیں۔ گل اسے

بہت کچھ بدلا تھا۔ مگر سرکشی کا تھوڑا انداز اب بھی باقی تھا۔ وہ پہلے روز سے آج تک کسی امارت و شان سے مرعوب نہ تھی۔ جیسے یہ اسے یقین تھا کہ یہ سب اسے ملنا تھا۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے انھیں جواب دے رہی تھی۔ وہ سمجھی ماما چلی گئیں۔ اس نے ایک بازو راسا ہٹایا۔ ماما ایک ٹک اس کی سمت دیکھ رہی تھیں۔

اس کی آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا۔ ماما کی آنکھیں بھی دریا تھیں۔ انھوں نے دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ وہ آنکھوں پر دوبارہ بازو رکھ چکی تھی۔ تب اسے اپنے پاؤں پر گرم قطروں کا احساس ہوا۔ وہ بے تحاشا چونک گئی۔

ماما اس کے پیروں میں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کے لیے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔ وہ رو رہی تھیں۔

”ماما!“ وہ انھیں شانوں سے تھام کر بٹھاتے ہوئے بولی۔

انھوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ ادھر بھی طغیانی آگئی۔

”میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔“ وہ تڑپ تڑپ کر رونے لگیں۔

”اوہ! ماما!!!“ کتنی ہی دیر سمندر جوار بھائے کی طغیانی کے سامنے بے بس رہا۔

”مجھے معاف کر دینا۔“

”ماما! یوں نہ کہیں۔ کوئی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہوں، خوش ہوں۔“

”اوہ میری بیٹی! ایسے نہ کہا کرو۔ مجھ سے کہو بیٹی! جو تمہارے جی پر بوجھ ہے۔ کہہ دو بیٹی! تم ہنسی کیوں نہیں؟ کہو بیٹی! جو گزری..... جو میں نے چاہا تھا وہ نظر نہیں آیا..... وہ وہیں ہے تو پھر تم سر اسر گھٹائے میں ہو۔ تم.....“

وہ ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ان کا خوشبوؤں بھرا وجود اسے سایہ دار درخت سا لگا۔ پھر کوئی لفظ، کوئی حرف بچ میں نہ آیا۔ وہ ان کا دامن بھگولیا کی اور وہ اس کا.....“

ان کا نیا گرافال دیکھنے کا پروگرام تھا۔ اور پھر وہیں سے ماما کا اپنے دیور کے پاس

بہت یاد آئی۔ اور وہ یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ بید پر نیم دراز سوچوں میں گم ماما کے کردار کا تجزیہ کر رہی تھی۔ کیا ماما خود غرض ہیں؟ جنھوں نے اپنے ہر شرعی عیب سے بڑے بیٹے کا ناتہ عمر بھر کے لیے مجھ سے جوڑا۔ ہماری کم مانگی کا فائدہ اٹھایا۔

مجھے اتنی محبت سے بیاہ لائیں۔ ان کی محبت میں آج بھی کمی نہیں۔ وہ اپنے ظلم کا تاوان مسلسل ادا کر رہی ہیں۔ سوچتی ہوں نہ اٹھا کر چٹا ہوتا ساحل پر۔ موجیں چند لمحے میرے جسم و زوج سے کھیل کر اسے ہر احساس سے عاری کر دیتیں۔ یوں روز تو نہ جشن مرگ کا اہتمام ہوتا۔ احساس کی دولت ہے کہ روز افزوں بڑھتی جاتی ہے۔ کبھی محبت کرنے والے مل جاتے ہیں۔ تو پھر احساسات تو انا ہو جاتے ہیں۔ دل ان سے بدگمان ہوتا ہے۔ تو کوئی احساس گل کے زوپ میں جھولی میں آن گرتا ہے۔ احساس کی آگ سگسا سگسا کر مجھے جھلسایا جاتا ہے۔ اور تم کیا ہو ہر بات سے بے نیاز محبت کا کوئی بیکراں جذبہ تمہاری روح کو چھوٹا تک نہیں۔ تو تم نے کیوں مجھے لہروں سے جیت لیا تھا۔ شاید تمہارے لیے موت بہت بڑا واقعہ ہے۔ تمہارے مشاغل بہت پھیل گئے ہیں۔ تمہیں ہر شغل سے لطف لینے کے لیے ایک عمر نوح چاہیے۔ سو بس تمہاری رُوح میں صرف دو احساس طاقت ور ہیں۔ موت اور زندگی۔ ماسوائے کچھ نہیں۔

اور ماما..... آپ کی محبتوں کا جال اب میرے لیے وبال ہو چکا ہے۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

وہ میرا گھر تھا، وہ میری پہچان تھا۔ وہی میری اصلیت تھی۔ وہ گھر جہاں میں دو بھائیوں، دو سایہ دار اشجار میں ہمہ وقت پھلتی پھولتی تھی۔ میں ان بد عادیوں والی بزرگ عورتوں کو اپنی کسی خوشی، کسی غم کا بھید بھی نہیں دوں گی۔ میں بوجھ تھی۔ انھیں سکھ کی نیند آئی ہوگی۔

میرے اطراف جتنی عورتیں ہیں۔ آپ ماما، اماں، دادی جان..... سب سے میرا دل میلا ہے۔ تب ہی پروہ سر کا کر ماما..... دودھ کا گلاس لے آئیں۔“

”لودہیں پی لو۔“

”میرا جی نہیں چاہتا ماما! بس نیند آ رہی ہے۔“

”تھوڑا سا پی لے لو۔“

”پھر مجھے زبردستی پینے سے تھو جائے گی۔“ یہ وہی دودھ تھا جو میکے میں چھڑ چھاڑ کا عنوان رہا۔

ٹورنٹو جانے کا ارادہ تھا۔ وہ دونوں بہوؤں کو اپنے عزیزوں سے ملوانا چاہ رہی تھیں۔

ابھی وہ نیا گرافال دیکھنے سے جی بھر کر لطف بھی نہ لے پائے تھے کہ شکاگو کے عظیم کا فون آ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بڑی بھابی..... کو بلائیں۔ آشیانہ نے جب بات کی تو وہ کہہ رہا تھا۔ ”بھابی! پاکستان سے بھیا کا فون آیا ہے ابھی..... وہ گل دوسری منزل سے گر گئی ہے اور اب ہاسپٹل میں ہے۔ انھوں نے کہا ہے جتنی جلد ہو سکے آ جائیں۔“

اس کی تو آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سب تسلی دے رہے تھے۔ ساری تفریح غارت ہو گئی۔

شکاگو پہنچ کر وہ عظیم کے ہمراہ جلد ہی پاکستان پہنچ گئی۔ ماما نے کہا تھا وہ فرحت کے ہمراہ دو چار روز میں پہنچ رہی ہیں۔

وہ سیدھی گھر جانے کے بجائے ہاسپٹل پہنچی۔ عظیم نے سب کچھ معلوم کر لیا تھا، فون پر۔ اپنی بچی کو نیم مردہ حالت میں دیکھ کر وہ تو بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ پتہ چلا کہ تین دن سے ہوش نہیں آیا ہے۔ ویسے حالت خطرے سے باہر ہے۔ وہ ایک دم شکستہ حال گھر لوٹ آئی۔ معظم اپنے بیڈ پر لیٹے کوئی فون سن رہے تھے۔

”آپ سے جب اس کا دھیان نہیں رکھا گیا۔ آیا سے نہیں سنبھالا گیا تو کیوں رکھا تھا اے اپنے پاس؟“ اس نے فون جھپٹ کر ایک طرف رکھا۔ وہ بالکل جنونی لگ رہی تھی۔ ”میری آپ سے کون سی دشمنیاں چل رہی تھیں کہ آپ ہر لمحہ مجھے تاک کر نشانہ لگاتے ہیں۔ جو سیدھا میرے دل میں لگتا ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا..... اسے کچھ ہو گیا۔“ وہ بری طرح رودی۔

”پاگل ہو رہی ہو تم۔ ٹھیک ہے وہ اب، ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی ہو۔ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ تمہیں تو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔“ وہ جو اسے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ اسے اس قدر جنوں میں دیکھ کر جھلا کر رہ گئے۔

اس کے صبح وشام کے چکر تھے۔ دادی جان، اماں رخسانہ باجی، نعمانہ، بھائی سب اس کا خیال رکھ رہے تھے۔ مگر وہ پرکٹی چڑیا کی طرح بے بس پھرا کرتی۔

بچی کے دماغ پر بڑا اثر پڑا تھا اور اس کی آنکھیں بھی متاثر ہوئی تھیں۔ دماغ کا معاملہ بہت نازک تھا..... آنکھوں سے متعلق ڈاکٹر بڑا امید تھے۔

بچی گھر آ گئی۔ بڑی عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتی تھی۔ سارے گھر کے جوتے جمع کر کے ڈھیر لگا دیتی۔ نوکروں کے پاؤں سے بھی سلپر کھینچ لاتی۔

جمعہ کی صبح وہ اپنے کمرے میں بیٹھی پردوں کے ہب نکال رہی تھی۔ لائڈری بھجوانا تھا اور نئے پردے دیکھ رہی تھی۔ کوئی ادھر اُڑا ہوا نہ ہو۔ معظم اخبار کا جھڈیشن لیے بیٹھے تھے۔ بچی اس کے پاس بیٹھی کھیل رہی تھی۔ یکا یک اپنی آنکھوں پر ہتھیلیاں رکھ کر ملنے لگی۔ پھر چھوٹے چھوٹے خوبصورت قہقہے لگانے لگی۔ کلکاریاں مارتی ہنستی۔ پھر معظم کے بھاری جوتے اٹھا کر کمرے میں بھاگنے لگی۔ آشیانہ کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے معظم کو دیکھا۔ وہ بھی بڑی پریشانی سے بچی کو دیکھ رہے تھے۔

”کیا ہوگا اس کا؟“ وہ بھرائی آواز میں بولی۔

”ٹھیک ہو جائے گی۔ فکر نہ کرو۔“ وہ تسلی دے رہے تھے۔ مگر آواز میں تشویش تھی۔

تھوڑی دیر میں اماں اور ابا جان آ گئے تو اس کا ذہن ادھر ادھر ہو گیا۔



”میڈم۔ بے بی امارا سلپر ادھر ادھر پھینک دیتا اے۔ ام بڑا ڈسٹرب اے۔ میرے کو تو چھٹی دیو۔ یہ ابنا رمل بے بی کنٹرول نہیں ہوتا۔“

”اپنے صاحب کو اپنا ڈکھڑا سنا دو، وہ بیٹھے ہیں۔“ اس نے بچی کو گود میں اٹھا کر تلخی سے کہا۔

اس نے جانے کیا کہا۔ انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کی تنخواہ تھمائی اور چلتا کیا۔

وہ کسی کام سے کچن میں گئی اور گل نے حسب عادت جوتوں کا ڈھیر لگا دیا۔ تھوڑی دیر بعد جوتوں کو قرینے سے لگایا اور بستر بنا کر لیٹ گئی اور کھلکھلانے لگی۔ معظم نے آ کر دیکھا۔ وہ لمحے بھر کو دم بخود سے کھڑے رہے۔ بعض اوقات ٹھیک ٹھاک لگتی اور بعض اوقات اس قدر تکلیف دہ حرکتیں کرتی جو دونوں کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔

وہ علاج کے لیے باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس لیے ماما نہیں آئی تھیں۔ عظیم چند دنوں بعد ہی واپس چلا گیا تھا۔

”امی! کہانی سنائیں۔“ ساڑھے تین سالہ گل نے بہت دنوں بعد نارمل انداز میں

اولین تکلف آج بھی تھا۔ سادہ سی عورت داماد کی پیشانی دیکھ کر بات کرتی تھیں۔ انھیں تو کبھی یہ کہنے کی ہمت بھی نہ ہوئی کہ بیٹا تم ہمارے ہاں کیوں نہیں آتے؟

اس کے سادہ سے گھر والے اس بات پر متفق تھے کہ روپیہ محنت سے کمایا جاتا ہے اور ان کا داماد جتنا دولت مند ہے۔ ظاہر ہے کہ محنت بھی اسی قدر کرتا ہے۔ واقعی مصروف ہے۔

بھائی میاں تو شادی کے بعد بے حد مصروف تھے۔ چھوٹے بھائی ایک سیاسی ماہنامے کے چیف ایڈیٹر تھے۔ ان کی اپنی مصروف دنیا تھی۔ ان کے لیے یہ بات کم تھی کیا کہ ان کی بیٹی نے چار سالوں میں کبھی ان سے کوئی دکھ نہیں کہا جبکہ اس کی دوسری بہنیں سسرال کی دکھی داستانیں ماں کو سنا جاتی تھیں۔

اماں جب سے آئی تھیں نوافل میں مصروف تھیں۔ بچی کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ اس پر پڑھ پڑھ کر دم کر رہی تھیں۔ اس نے بچی کا سوٹ کیس لاک کرتے ہوئے نظر اٹھا کر انھیں دیکھا۔ ڈیرینگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑے بالوں پر اسپرے کر رہے تھے۔ سنجیدہ اور خاموش خاموش۔

اس نے اس دولت مند اور خوبصورت شوہر کو بایست سے دیکھا اور سوچا کتنا فکر مند ہے۔ آج یہ شخص اپنی اولاد کی وجہ سے اپنے سوشل جھوڑ کر جا رہا ہے۔ کتنی خوش نصیب ہے میری بیٹی جسے باپ کی توجہ اور ہمدردی تو حاصل ہے۔

اس کو یاد تھا۔ نعمانہ کی شادی پر اباجی نے اپنے ایک رشتے کے بھائی سے چند ہزار روپے قرض لیے تھے اور بیچا نے انھیں دیتے ہوئے کہا تھا۔ بھائی صاحب! آپ تو بہت اہم سیٹ پر بیٹھے ہیں۔ ہر فائل آپ کے ہاتھوں سے گزر کر آگے جاتی ہے۔ آپ چاہیں تو۔

”میں جانتا ہوں تمہارا مقصد میاں۔ مگر میں اپنی اولاد کے لیے کنوئیں کھودنا نہیں چاہتا۔ میاں جان لو۔ یہ بات صحیح اور مشاہدے میں آئی ہے۔ جس طرح اولاد ماں باپ کے خون اور جانداد میں حصہ دار ہوتی ہے۔ ان کے گناہ اور ثواب کے نتیجے..... بھی اولاد کے حصے میں آتے ہیں۔ پہلے مجھے ان کاموں سے خوف خدا نے روکے رکھا۔ اور اب۔ میاں بچے سکھی رہیں۔ اس سے بڑی دولت کیا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری رقم دو ماہ میں لوٹا دوں گا۔“

اس کا جی چاہا کہ معظم کو جھنجھوڑ کر اباجی کی یہ بات سنائے۔ اور کہے۔ ”کیسے دوست ہو؟ کیسے دشمن ہو؟“

بات کی۔ اس نے اسے خوشی سے لپٹا لیا..... ”کون سی کہانی؟“
”کون سی کہانی؟“ اس کو یہ الفاظ بازگشت کی طرح پھیلنے لگے۔
”ملکہ کی؟“

گل خاموش رہی۔ ”کون سی کہانی بیٹی؟“
”وہ کہانی جہاں ایک شہزادی دو بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک دن ایک دیو..... دیو اٹھا کر لے گیا۔ وہ شہزادی آج تک قیدی ہے۔ سنائیں ناں۔“

اس نے اخبار میں سے کہانی شروع کر دی۔ ”نافرمان شہزادہ۔“
”ایک بادشاہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بادشاہ اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ مگر شہزادہ بہت ضدی اور سرکش تھا۔ وہ کسی کی بات نہیں مانتا تھا۔ ایک دن اسے پتہ چلا۔ کوہ قاف میں کسی دیو کے پاس ایک پھول ہے جس میں ساری دنیا نظر آتی ہے اور اگر وہ پھول کسی کے سامنے کر دیا جائے تو وہ اس پھول کے مالک کا غلام بن جاتا ہے۔ شہزادہ اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اسے اللہ نے سب کچھ دیا تھا مگر اسے بہت ہوس تھی۔ وہ دنیا کے ہر ملک پر حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر جب وہ کوہ قاف پہنچا تو پتھر کا ہو گیا کیونکہ وہاں جو بھی آدم زاد آواز نکالتا پتھر کا ہو جاتا تھا۔ بیوقوف شہزادے نے دیو کو آواز دے دی تھی۔ شہزادے کے واپس نہ ہونے پر کچھ خیر خواہ اس کو ڈھونڈنے نکلے۔ انھیں راستے میں ایک بزرگ ملے۔ انھوں نے سنہرے پانی دیا کہ پتھر بنے آدمی پر چھڑکنا وہ زندہ ہو جائے گا۔“ وہ یہیں تک پہنچی تھی کہ معظم اندر داخل ہوئے۔
”تم کیا الٹی سیدھی کہانیاں سنا کر اسے اور زیادہ ذہنی طور پر بیمار کرو گی؟ کبھی عقل بھی استعمال کر لیا کرو۔“ انھوں نے جھاڑا۔

”میرا مقصد تو اسے سنانا تھا۔“ اس نے سوئی ہوئی گل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ دوسرے آپریشن کے بعد ماما کے پاس جانے کی تیاریاں کرنے لگی کیونکہ آپریشن کے نتائج حوصلہ افزا نہیں تھے۔ معظم بھی اس کے ہمراہ جانے کو تیار ہو گئے۔

بچی کی معصوم صورت اور اس کی اینارل حرکتیں دونوں کے اعصاب چٹخا دیتی تھیں۔
ان کی رات کی فلائٹ تھی۔ وہ ضروری چیزیں یاد کر کے رکھ رہی تھیں۔ اماں صبح ہی نغمہ کے ہمراہ آگئی تھیں۔ وہ اس کے ہاں بہت کم آتی تھیں۔ اس داماد کے اور ان کے درمیان

اسی دم اس کی بیٹی اندر آ گئی اور معظم کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ وہ اپنی آنکھوں کو عجیب سے انداز میں حرکت دے رہی تھی۔ حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکال رہی تھی۔ سچے سچائے معظم نے اسے گود میں اٹھالیا۔ مگر وہ چل کر ان کی گود سے اتر گئی۔ اور کمرے میں بھاگتے ہوئے بیٹھ گئی۔ اس نے معظم کی سمت دیکھا۔ وہ بھی ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ ایک لمحہ کو ان کی نظریں ٹکرائیں۔ ہر دو طرف..... بے چارگی تھی۔



وہاں جاتے ہوئے بچی کے کئی ٹیٹ ہوئے۔ رپورٹیں خوش آسند تھیں۔ دماغ کی شدید چوٹ کی وجہ سے بچی کی آنکھوں پر بھی اثر تھا۔ اچانک اندھیرا چھا جانے کی وجہ سے وہ چیختی تھی اور ادھر ادھر بھاگتی تھی۔

اسے معظم پر اس وقت ٹوٹ کر پیار آ جاتا جب وہ انتہائی سنجیدگی اور تشویش سے ڈاکٹروں سے انتہائی شستہ انگریزی میں معلومات حاصل کر رہے ہوتے۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہی معظم ہے جس نے اس پر تشدد کر کے کبھی معذرت نہیں کی تھی۔

آج اس کی زندگی کا ایک کڑا امتحان تھا۔ نیا آریا پار۔ بال برابر قوت برداشت کا پل صراط۔ بچی تو ہاسپٹل میں تھی۔ آج اس کا آپریشن تھا۔ وہ ماں اور معظم کے ہمراہ جا رہی تھی۔ اس کا دل دھڑ دھڑنچ رہا تھا۔ صبح کو وہ معظم کے گلے لگ کر بے ساختہ رو دی تھی۔ اور انھوں نے احس..... بے وقوف کہہ کر ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس کی پشت تھپتھا کر گویا تسلی دی تھی۔

شام چار بجے انھوں نے جانا تھا۔ وہ ظہر کی نماز کے لیے وضو کر کے کمرے میں آئی تو پردہ ہٹاتے ہی اس کے حواسوں پر گویا پھول برس پڑے۔

معظم خوبصورت محلی جائے نماز پر رکوع کی حالت میں تھے۔

اور وہ دم سادھے انھیں دیکھتی رہ گئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔

آج یہ شخص دنیا کا خوبصورت ترین انسان لگ رہا تھا۔ اسے بیٹی کو سنائی ہوئی کہانی ”نافرمان شہزادہ“ یاد آ گئی۔

اس نے سوچا۔ ”ایسا بھی ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ ناممکن کیا بات ہے یہاں؟

بعض اوقات اپنے نفس کا لاڈلا انسان ہوس مال و جاہ میں اتنا مدہوش ہو جاتا ہے کہ

اس کی ہوس بند توڑتے سیلاب کو مات کر دیتی ہے اور وہ دنیا میں کسی اور تکبر میں مبتلا کر دیتے

والے عیش کے پھول کی تلاش میں گناہوں کے کوہ قاف میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔

اور ایسے میں مرشدوں کا والی..... بزرگوں کا بزرگ..... سارے جہاں کا بادشاہ۔

ایک دھچکے کا، ایک ٹھوکر کا، ایک رُوح کو جھنجھوڑنے والے حادثے کا سنہرا پانی عطا فرماتا ہے۔ جو اس کے تعمیر کے پتھر کو زندگی عطا کر دیتا ہے اور وہ حسب توفیق تاب ہو جاتا ہے اور اپنے ضمیر کے زندہ وجود کو سمیٹ کر اس گناہوں کے کوہ قاف سے سر پٹ بھاگتا ہے۔ کیسے نصیب والے ہوتے ہیں جنہیں یہ سنہرا پانی دیا جاتا ہے۔

بڑی کڑی قیمت، بڑے کالے کوس کے فاصلے، بڑی مسافتیں، اس سنہرے پانی میں بہت ہے آقا..... کافی ہے مالک..... بھر پور ہے بادشاہ۔

خدا کرے کسی کی ایسی آزمائش نہ ہو کہ اس سنہرے پانی کی نوبت آئے۔

معظم آنکھیں بند کیے آیت کریمہ پڑھ رہے تھے۔

”اور کوئی نہیں سوائے اللہ کے۔ تو پاک ہے بے شک میں ہی اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہوں۔“

اس نے چادر لیٹی اور جائے نماز معظم کے ساتھ بچھالی۔

اماں کی کم عقل بیٹی جانے کتنے ادراک کے دروازوں سے گزر کر خدائے لازوال کے حضور سر بستہ تھی۔



عثمان بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے تھے۔ وہ گھر کی تمام ضروریات کا ذمہ داری سے خیال رکھتے تھے۔ اسے کسی چیز کی کمی نہ ہونے دیتے لیکن ان میں ایک خرابی تھی جو ان کی تمام خوبیوں پر بھاری تھی اور وہ تھی ”اچھی صورتوں“ کو بہ غور تکتے رہنے کی عادت۔ حالانکہ محض ”تکنا تو کوئی ایسی خامی نہیں تھی کہ تکتے سے ”قلبی تبدیلی“ کا سراغ نہیں ملتا!

لیکن ٹوبہ کے نزدیک یہ اس کی بہت بڑی توہین تھی۔ وہ لاکھوں میں نہ سہی ہزاروں میں ایک ضرورت تھی۔

شروع شروع میں جب اس کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، اسے عثمان کی یہ عادت بہت بھاتی تھی۔ جب وہ مسکراتی تو عثمان جذبوں سے پر نظروں سے اسے بہ غور دیکھا کرتے لیکن رفتہ رفتہ پتا چلا کہ ان مسکراتی نظروں کا محور محض وہی ”فرد یکتا“ نہیں بلکہ جہاں بھی اچھی صورت ہوتی ہے، وہ عثمان کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔

اکثر تقریبات میں اس وقت ٹوبہ کا حلق تک کڑوا ہوا جاتا جب عثمان اسے ”باسی روٹی“ کی طرح نظر انداز کر کے کسی پرکشش چہرے کو دلچسپی سے تکتے لگتے۔ کچھ ایسی اضطراری کیفیات ان کے چہرے سے مترشح ہونے لگتیں گویا وہ ”مرکز نگاہ“ چہرے کو نوالہ بنا کر اپنے معدے میں اتارنا چاہتے ہوں۔ ایسے میں وہ انھیں اپنی جانب زبردستی متوجہ کرنے کی کوشش کو اپنی توہین سمجھتی اور محض خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔

واپسی کے دوران میں عثمان اس کے بڑے موڈ کی وجہ بڑی سادگی سے دریافت کرتے تو اس کا جی چاہتا کہ گاڑی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لے۔

نئی نئی شادی تھی۔ اپنے اخلاق و کردار کو جیون ساتھی کے سامنے بے مثل ظاہر کرنے کی لگن تھی۔ دل میں سو طرح کی تادیلیں ابھرتیں کہ مبادا میرا گمان ہو۔ ایسا نہ ہو کہ میں اپنے خیال کے اظہار کے بعد کوتاہ نظر کہلاؤں یا شکی عورت ہونے کا سر شکیلیٹ مل جائے لہذا عثمان کے استفسار پر وہ اپنا موڈ بحال کرنے کی کوشش کرتی اور سر درد یا تھکن کا بہانہ بنا دیتی۔ پھر ایسا کئی مرتبہ ہوا تو اسے عثمان کے دل پھینک ہونے کا یقین ہو چلا۔

اس روز بڑی آپا کی بچی کی سالگرہ تھی۔ وہ اور عثمان بھی خصوصیت سے مدعو تھے۔ وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوئی۔ بہترین کتان کی سبز ساری باندھی۔ بالوں کا اچھا سا اسٹائل بنایا۔ مناسب میک اپ کیا اور موزوں زیورات سے آراستہ ہوئی۔ عثمان نے نظر ڈالی تو گویا شاعر ہی

اے بسا آرزو

”امی میری بیلٹ کہاں ہے؟“ ننھا یا سر بولا۔

”جہنم میں ہوگی۔ اتار کر چیزیں اس طرح پھینکتے ہو گویا دوبارہ استعمال ہی نہیں کرو گے۔ کتنی مرتبہ کہا ہے تمہارے کمرے میں ہر چیز کا ٹھکانا ہے، کیوں نہیں رکھتے ہر چیز اس کے مقام پر۔“ وہ گویا بھری بیٹھی تھی۔ پھٹ ہی تو پڑی۔

یا سر جلدی سے کمرے میں واپس گھس گیا اور اپنی وارڈ روب میں الٹ پلٹ کرنے لگا۔ اس نے ڈانٹ تو دیا تھا مگر کسی طرح قرار نہ آیا تو مجبوراً خود آ کر اس کی بیلٹ ڈھونڈی۔ ”انہی حرکتوں پر کسی دن بری طرح پٹو گے۔“ اس نے پھر گرمی کھائی اور اپنے اچھے بالوں کی چوٹی جھٹک کر کچن کی سمت آئی تو عثمان کو ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے کچن کے دروازے پر موجود پایا۔

”بھئی وہ چائے وائے ناشتے وغیرہ کا کوئی انتظام نہیں ابھی تک؟“ عثمان نے کہا۔

”میں دنیا کی عورتوں سے مختلف ہوں لہذا کابلی اور سستی میں اپنا جواب نہ رکھنے والی عورت تو اسی ذہب کی ہوتی ہے۔ چل کر بیٹھے آ رہا ہے ناشتا۔“ اس نے عثمان کو بھی گویا سالم لگنا چاہا۔

”یار اتنی سی بات کا جتنکڑ بنا لیتی ہو تم تو، کمال ہے۔“

وہ ناشتا لگا رہی تھی کہ عثمان نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر وہ اس سے پہلے بول اٹھی۔ ”میں نے کوئی وضاحت طلب نہیں کی اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جو بات آپ کے لیے اتنی سی ہو وہ میرے لیے بھی اتنی سی ہو؟“ وہ کام نمٹا کر پھر پلٹ گئی۔

عثمان خاموشی سے ناشتا کرنے لگے۔ انھوں نے خاموشی ہی میں پناہ ڈھونڈی تھی۔ وہ بھی مزید کچھ نہیں بولی تھی اور گڑیا کو تیار کرانے لگ گئی تھی۔

”بعض عورتیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں لیکن بد مزاج ہوتی ہیں۔“ وہ شرارت سے مسکرائے۔

”بعض کیا، آپ کو تو بہت زیادہ کا تجربہ ہوگا۔“ وہ جل بھٹن کر خاک ہوتے ہوئے بولی۔
 ”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“ وہ ونڈا سکرین پر نظر جما کر بولے۔
 ”چھوڑیں، میری زبان نہ کھلوائیں۔ میرا موڈ سخت خراب ہے۔“ وہ منہ موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”کیوں خراب ہے؟ کوئی وجہ بھی تو ہوگی۔“
 ”حرا آپ کی پھڑی ہوئی کزن تھی جسے آپ غور سے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے؟“ وہ آخر برداشت کی حدوں سے گزر گئی۔

”حرا!“ وہ حیران ہوئے۔ ”کون ہیں یہ محترمہ؟“
 ”وہی جنھیں مغرب سے عشاء تک آپ نے ”باوضو“ دیکھا۔“
 ”باوضو!“ وہ مسکرائے۔

”لگتا تو ایسا ہی تھا گویا وضو کر کے نیت باندھ کے بیٹھے ہوں۔“ وہ جل کر بولی۔
 ”ہااا..... ہااا۔“ عثمان اپنے قہقہے پر قابو نہ پاسکے۔ ”ہوں۔ تو یہ وجہ ہے خراب موڈ کی۔“ وہ مسلسل مسکرا رہے تھے۔

اچھی صورت پہ غضب ٹوٹ کے آتا دل کا

یاد آتا ہے ہمیں ہائے وہ

وہ گنگنائے تو ثوبیہ مزید سلگ گئی۔ ”ہونہہ۔ ایک تو چوری اس پریسنہ زوری۔“
 ”ارے یار! اچھی صورت کو دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے آخر؟“ انھوں نے چھیڑا۔
 ”لیکن کوئی اچھی صورت دل میں بہت زیادہ جگہ بھی بنا سکتی ہے۔“ وہ تنخی سے بولی۔
 ”وہ تو بنا چکی ہے۔“ عثمان نے وارفتہ نظر اس پر ڈالی۔

”مت بنایا کریں مجھے۔ میرا دل خوش نہیں ہوتا ان باتوں سے۔“ وہ مسلسل چوہے پر بیٹھی تھی گویا۔

”کیوں اتنی اتنی سی باتوں پر خون جلاتی ہو۔ ارے یار! ہم تو دل و جان سے تمہارے ہیں۔“

ہو گئے۔ اس کی بے تحاشا تعریف کی۔ اس کے حسن کی اس کے سلیقے اور جامہ زہبی کی۔ وہ سُن سن کر خوش ہوتی رہی بلکہ پھولے نہ سائی۔
 آپا کے ہاں بڑی چہل پہل تھی۔ اعلیٰ پیمانے پر تقریب ہو رہی تھی لہذا اسی مناسبت سے اہتمام تھا۔

وہ اپنی سہیلیوں میں گھل مل گئی۔ اس کی کزنز اسے گھیرے پھرتی رہیں۔ عثمان بھی مردوں سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔ معاً اس کی نظر عثمان پر پڑی تو انھیں ایک جانب مستقل دیکھتے پایا۔ ان کی پُرکشش اور چمک دار آنکھیں مسلسل ایک سمت مرکوز تھیں۔ ثوبیہ نے ان کی نظروں کا تعاقب کیا تو دیکھا کہ وہ اس کی دوست حرا کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کی نظروں سے نروس سی نظر آ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی سرخی اس کے چہرے سے پھیلنے لگی تھی۔ ثوبیہ کے تو پیر سے لگی اور سر پر بھی، ہونہہ! یہ بیچارے اپنی عادت سے مجبور ہیں تو اس کمینی کو تو اس طرح پوز نہیں دینا چاہیے، وہ کھولتی ہوئی حرا کے سر پر جا پہنچی۔
 ”حرا۔“

”حرا ایک دم چونک پڑی۔ جس ”باس“ کی نظروں سے وہ داد طلب کر رہی تھی، اس کی ”پرسنل سیکرٹری“ اس کے سر پر کھڑی تھی۔ حرا کھسیا گئی۔
 ”ہوں؟“ حرا صرف اتنا کہہ سکی۔

”بھئی ادھر آؤ، ذرا انتظامات میں ہاتھ بٹاؤ۔ تم تو بالکل ہی پُر تکلف مہمان بن کر بیٹھ گئیں۔“ اس نے جذبات پر قابو پا کر اسے وہاں سے ٹالنا چاہا تو حرا بھی چور چوری فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

واپسی کے دوران میں وہ قطعی خاموش تھی۔
 ”یقیناً سر درد ہو رہا ہوگا یا تھکن زیادہ ہو گئی ہوگی؟“ عثمان نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس کی سمت دیکھا۔

”ضروری نہیں کہ بیماریاں بھی لگی بندھی ہوں اور کوئی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔“ وہ چپتے ہوئے لہجے میں بولی۔

عثمان نے عجیب سی نظر اس پر ڈالی۔ ”اس وجہ کا بھی کوئی نام ہو سکتا ہے۔“ وہ بولے۔
 ”جانے کتنے نام ہوں گے۔ اب کس کس کا نام لوں؟“ ثوبیہ نے سوچا مگر خاموش رہی۔

”ہاں اس وقت تک جب تک میرے علاوہ دوسری کوئی اچھی صورت نہ ہو۔“
 ”بدگمانی کے زہر کا کوئی تریاق نہیں۔“ وہ اس کی سمت بہ غور دیکھ کر بولے۔
 ”تو یہ خاموش ہو گئی اور اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔“



”دراصل ہم لوگ خوشگوار ازدواجی زندگی کے راز، پر اپنے اخبار کے لیے سروے کر

رہے ہیں۔“

ان میں سے ایک نے وضاحت کی تو ثوبیہ کی سمجھ میں آیا کہ وہ کیوں آئی ہیں۔
 ان دونوں نے اپنی آنکھوں پر سن گلاسز لگائے ہوئے تھے۔ ثوبیہ انھیں ڈرائنگ روم
 میں لے آئی اور مشروبات سے ان کی تواضع کرنے لگی۔
 ”ہم نے یہ دقت اس لیے منتخب کیا ہے کہ اس دقت شوہر حضرات بھی اپنی ڈیوٹیز بھگتا

کر آچکے ہوتے ہیں۔ کیا آپ کے شوہر گھر پر موجود ہیں؟“
 ”جی بس آنے والے ہیں۔“ وہ بولی تو ایک دم ہی اطلاع گھنٹی بج اٹھی۔ وہ معذرت
 کرتی ہوئی باہر آ گئی۔ واقعی عثمان آ گئے تھے۔ اس نے انھیں ”خواتین“ کی موجودگی سے مطلع
 کرتے ہوئے آمد کی وجہ بھی بتادی۔
 ”کیا ہماری زندگی خوشگوار ہے؟“ انھوں نے بریف کیس اسے تھماتے اور مسکراتے
 ہوئے پوچھا۔ ”یہ لوگ کہاں سے سراخ لگا کر یہاں آئی ہیں؟“
 ”تو، نا خوشگوار ازدواجی زندگی کے راز، ہی بتا دیجیے گا۔“ اس کا موڈ پھر خراب

ہونے لگا۔

عثمان اس کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔ دونوں خواتین اپنے گلاسز اتار کر
 میز پر رکھ چکی تھیں۔ ان میں سے ایک خاتون کی آنکھیں بے تحاشا خوبصورت تھیں۔ صحت مند
 جلد اور روشن و متکلم آنکھیں واقعی سحر انگیز تھیں۔ ثوبیہ نے ڈر کر عثمان کی طرف دیکھا۔ وہ اس
 سے کہیں زیادہ گہرائی سے خاتون کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ مسکراتے ہوئے پوچھ رہے
 تھے کہ ان کا تعلق کس اخبار سے ہے اور یہ سروے کس سلسلے میں کیا جا رہا ہے؟

جادو اثر آنکھوں والی کی بجائے دوسری خاتون جو گہری رنگت کی تھیں، جواب میں
 بولیں تو عثمان نے اس طرح دیکھا گویا جیسے انھیں ان خاتون کا ”ناگ آڑنا“ بالکل پسند نہ آیا

ہو۔ مخاطب خاتون کی خاموشی کے سبب انھوں نے ”اخلاق بالجبر“ کے طور پر ان گہری رنگت والی
 خاتون سے تفصیل سنی اور دوبارہ اس ”آہو چشم“ سے مخاطب ہوئے۔ ”آپ کب سے اس اخبار
 سے منسلک ہیں؟“

”دو سال سے۔“ مختصر سا جواب ملا۔

”آپ یقیناً جرنلزم میں ایم۔ اے ہوں گی۔“

”ظاہر ہے۔“ خاتون کو جیسے ان بچکانہ سوالات پر کوفت ہو رہی تھی۔

”یہ ہمارا“ انٹرویو کرنے آئی ہیں۔“ آخر ثوبیہ سے نہ رہا گیا تو اس نے عثمان کو یاد

دلایا بلکہ بتایا۔

وہ سوال نامہ ساتھ لائی تھیں۔ اس کے حساب سے سوالات کرنے لگیں۔ ثوبیہ بڑی

سمجھ داری سے جواب دیتی رہی۔

آخر میں ان گہری رنگت والی خاتون نے عثمان سے پوچھا۔ ”اس دنیا میں آپ کے
 نقطہ نظر سے بہترین شے کیا ہے؟ دراصل ان سوالات کے جواب سے آپ کی شخصیت کا واضح
 خاکہ بنانے میں بہت مدد ملے گی۔“ انھوں نے ساتھ ساتھ وضاحت بھی کی۔

”اس دنیا میں مجھے جو چیز سب سے زیادہ پسند ہے، وہ حسین آنکھیں ہیں۔“ عثمان
 مسکرا کر بولے اور ثوبیہ کا دل چاہا کہ وہ اپنا سر پیٹ ڈالے۔ اس نے سوچا۔ ”صرف آنکھیں ہی
 نہیں، وہ چہرے بلکہ جو کچھ بھی جن پر خوبصورت آنکھیں فٹ ہوتی ہیں۔“ ثوبیہ جل بھن کر
 کباب ہو رہی تھی۔ آخر اس نے خود ہی اس ملاقات کو کام کا بہانہ کر کے مختصر کیا۔ اسے یہ خوف
 تھا کہ اس سروے کی ہیڈ لائن یہ نہ ہو۔ ”مسٹر عثمان حسین آنکھیں دیکھ کر ریشم خطمی ہو جاتے
 ہیں۔“ اس نے پہلے تو بڑے سلیقے سے عثمان ہی کو ٹالا۔ ”جائیے آپ لباس تبدیل کر لیجیے۔ میں
 چائے کا انتظام کرواتی ہوں۔“

عثمان بادل ناخواستہ وہاں سے اٹھ گئے اور بولے۔ ”جیسے آپ چاہیں۔“ انھوں نے
 فرمانبردار شوہر کا کردار نبھا کر گویا خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز منکشف کر دیا اور ثوبیہ نے سکون و
 طمانیت کا گہرا سانس لیا۔



وہ کسی کام سے راہداری میں آئی تھی کہ فون کی گھنٹی جیج پڑی۔ رات نو بجے کا عمل تھا۔

عثمان نے ایک نظر اس پر ڈالی اور صورت حال سمجھتے ہوئے فون پر بولے۔ ”اچھا بھائی خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر انھوں نے فوراً ریسیور رکھ دیا۔

ثوبیہ کی ماں کہا کرتی تھی۔ ”اکثر مرد اس بات سے سخت بیزار ہوتے ہیں کہ ان سے ایسے سوالات کیے جائیں کہ اتنی دیر کہاں کر دی؟ کہاں سے آرہے ہو؟ کہاں چلے گئے تھے یا کس کا فون تھا؟“ ثوبیہ نے کبھی یہ سوالات کر کے اپنے مرد کو نالاں کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اس کا دل چاہ رہا تھا کہ صاحب کی طبیعت اچھی طرح صاف کر ڈالے۔ پہلے پوچھے کہ کس کا فون تھا، جواب میں غلط بیانی ہو تو پھر خبر لے ڈالے لیکن اس نے نہ جانے کیا سوچ کر خاموشی اختیار کر لی اور چپ چاپ پلٹ گئی۔



عثمان نے بہت دن پہلے اسے بتا دیا تھا کہ ان کا کوئی دوست کسی کام کے سلسلے میں یہاں آ رہا ہے۔ دو چار روز قیام کرے گا۔ آج واقعی وہ آ گیا تھا۔ لمبا چوڑا لیکن عجیب سے حلیمے کا مالک۔ اسے الگ تھلگ کمرادے دیا گیا تھا۔

عموماً اس کا کام ملازمہ ہی کر دیا کرتی تھی۔ اکثر وہ باہر ہی ہوتا تھا۔ اگر اس سے کبھی سامنا ہوتا تو رات کے کھانے پر اور اس وقت وہ اور عثمان اپنے قصے کہانیاں چھیڑ بیٹھتے وہ کمرے میں چلی آتی۔ عثمان نے بتایا کہ وہ پڑھا لکھا زمیندار ہے اور زمینوں ہی کے سلسلے میں آیا ہوا ہے۔ ثوبیہ کو اس سے مطلق سروکار نہ تھا بلکہ اس کے بارے میں جاننے کا ہلکا سا شوق بھی نہیں تھا۔

آج وہ ایک منگنی کی تقریب میں گئی تھی۔ عثمان نے جانے سے انکار کر دیا تھا کہ کام زیادہ تھا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ رات کا کھانا باہر ہی کھائیں گے۔ رات نو بجے وہ گھر لوٹی تو یہی فکر تھی کہ خدا جانے مہمان کب آیا ہوگا۔ کھانا بھی کھایا ہوگا یا نہیں؟ اس نے ابھی انگوٹھیاں ہی اتاری تھیں کہ یہ خیال آتے ہی وہ مہمان کے کمرے کی طرف چلی آئی۔ خوبصورت ساری کا آنچل اچھی طرح لپیٹ لیا۔ وہ بستر میں دھنسا ہوا تھا۔ انگلیوں کے بیچ سلگتا سگریٹ تھا اور دوسرے ہاتھ میں تاش کی گڈی۔

”اوہ۔“ وہ اسے دیکھ کر سنبھل گیا۔

”عثمان تو آج دیر سے لوٹیں گے۔ پتا نہیں آپ کب آئے ہوں گے اور کھانا بھی کھایا ہے کہ نہیں! یہی پوچھنے آئی ہوں۔“

اس نے فون اٹھایا تو بیڈروم ایکسٹینشن غالباً عثمان نے اٹھا لیا تھا۔ شادی کو ساتواں برس لگ چکا تھا لیکن پڑاسرار و نامعلوم سے وابستہ اب بھی ثوبیہ کو اسی طرح پریشان کرتے رہتے تھے کیونکہ عثمان میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں آئی تھی۔

کوئی لڑکی تھی جو بڑی آہستگی سے ہیلو کہہ رہی تھی۔

”ہوں۔“ عثمان نے ہنکارا بھرا۔

”دیکھیے جی میں نے اس نمبر پر رنگ کیا ہے۔“ لڑکی نے نمبر بتایا۔

”یہی ہے۔“ عثمان کی آواز پھر ابھری۔

”کیا مسٹر عثمان موجود ہیں؟“

”بول رہا ہوں۔“

چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ پھر لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ”پرسوں آپ پراچہ صاحب کے ہاں ڈنر میں ملے تھے۔ میں شگفتہ بول رہی ہوں۔ آپ نے فون نمبر بھی لیا تھا لیکن.....“

”اوہ مس شگفتہ!“ عثمان کو گویا بہت کچھ یاد آ گیا۔ ”دراصل مصروفیت میں یاد ہی نہیں رہا۔“

”آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کی کمپنی نئے سال کے کیلنڈر چھاپ رہی ہے اور آپ کے ہاں نئے چہروں کی ٹرانسپیرنسیز کی ضرورت ہے.....“

”فون کرنا بھول گیا تھا مگر باقی سب یاد ہے۔“ عثمان بات کاٹ کر بڑے رومانی انداز میں بولے۔

”عثمان صاحب! آپ کی پرسیلٹی بھی تو غضب کی ہے۔ کسی سین میں اگر آپ کی ٹرانسپیرنسی بھی شامل ہو تو کیلنڈر کافی خوبصورت ہو جائے گا۔“ وہ ہنسی، مدھری ہنسی۔

”ہونہہ! دیدے پھاڑ کر دیکھنے کے علاوہ ان کے پاس اور کون سی ادا ہے۔ اسی ادا کی وجہ سے چڑیل تھے ان کی پرسیلٹی ”غضب“ کی لگی ہوگی۔ ثوبیہ نے سوچا اور ریسیور کان سے لگائے رکھا۔ تو بہ تو یہ آج کل کی چلتا پڑھ لڑکیاں گھروں میں آگ لگانے کے ہنر جانے کہاں سے سیکھ کر آتی ہیں اور انھیں تو دیکھو کیا کنوارے چھیل چھیلے بنے چمک رہے ہیں۔ اس نے ریسیور آہستگی سے رکھ دیا اور کھولتی ہوئی بیڈروم میں آ کر عثمان کو گھورنے لگی۔

عثمان احمد صاحب!

اگرچہ آپ کا اور میرا کوئی واسطہ ہے نہ تعلق، پھر بھی یہ چند باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہوں گی۔

عورت کو چہار دیواری کے تحفظ کے علاوہ سچی محبت بھی میسر آ جائے تو وہ کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتی۔ آپ دوسری شادی کر سکتے ہیں تو یہ حق مجھے بھی حاصل ہے۔ وہ آپ کا دوست کہہ رہا تھا کہ یہ بددیانتی نہ ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ اب میں بیگم عثمان نہیں ہوں۔ میں نے اس کا انتخاب بڑی جرأت سے از خود کیا ہے۔ عثمان صاحب! نظر باز سے نوسر باز اچھا۔ کم از کم اعصابی دباؤ سے تو مجھے رہائی مل گئی ہے۔

والسلام

فقط ثوبیہ



”جی شکریہ۔ آپ گھر پر نہ بھی ہوں، تب بھی موجود ہوتی ہیں۔ اپنے پیچھے کافی سارے احکامات جو چھوڑ جاتی ہیں۔ ملازمہ نے کھانا کھلا دیا ہے۔“

”آپ اکیلے ہی تاش کھیلتے ہیں؟“ وہ جاتے جاتے رک کر حیرت سے بولی۔
”کھیلتا ہوں لیکن اکیلے نہیں۔ مجھے دنیا میں صرف اسی کا جنون ہے۔ میں نے شوق نہیں جنون کہا ہے۔ میں جوا ری ہوں، نوسر باز ہوں۔ صرف کھلاڑی نہیں۔“

ثوبیہ کو اس کے سچ سے خوف سا آنے لگا لیکن اس نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ اس نے کبھی ارادہ اسے نہیں دیکھا۔ نظر بڑی بھی تو بے حد بے تاثر، کہیں اور پہنچی ہوئی۔ اب جبکہ وہ اس قدر رنجی سنوری اس کے سامنے تھی تو بھی اس کی بے نیازی کا وہی عالم تھا گویا اس کا چہرہ ”اچھا چہرہ“ نہ ہو۔

”دراصل میں کھیل نہیں رہا تھا چونکہ نوسر باز ہوں اس لیے نئی نئی تکنیک سوچتا رہتا ہوں۔“ وہ سادگی سے مسکرا دیا اور جھک کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی، وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔
وہ کافی دن رکا رہا۔ اچھا خاصا بے تکلف بھی ہو گیا تھا۔ گھر میں آنے جانے والوں سے بھی سابقہ پڑ جاتا تھا لیکن اس کی ”نظریں“ ہر امتحان سے سرخرو آئیں۔ ”عجب مگن سا شخص تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی ذہن میں گم اطراف سے بے نیاز۔“



حکفۃ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو محض ”دیکھنے“ سے تسکین پا جاتی ہیں۔ وہ ہاتھ دھو کر عثمان کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ ہر بار ان کی بولتی نظروں کے پیغام یاد دلاتی تھی۔ اسی کی بنا پر جھگڑوں نے طول پکڑا۔ ثوبیہ میکے چلی آئی اور اپنے اس اقدام کو حق بجانب قرار دیا کہ یہ تو بہت پہلے ہو سکتا تھا، بس اس کے صبر سے گاڑی چلتی رہی۔ عثمان کا کہنا تھا کہ وہ دونوں بیویوں سے انصاف برتیں گے۔ یہ سن کر تو وہ بھڑک ہی اٹھی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ عثمان اسے منانے کے لیے پیچھے پیچھے چلے آئیں گے۔ نہ کہ دوسری شادی کی خبر دینے۔ اس نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ شیر کو تازہ شکار مطلوب تھا۔ بھوک میں کچھ بھائی نہیں دیتا سو اس کا مطالبہ مان لیا گیا۔ ان کی نظروں کے دام سے آزاد ہو کر ثوبیہ کو ایک طرح کا سکون ملا۔ اس نے سوچا اب جو چاہیں کریں میری بلا سے۔



”پھر وہ آپ کے پیچھے بھاگے؟“ افشاں اتنی سادہ سی کہانی کی توقع نہیں کر رہی تھی، اس کا خیال تھا، ابھی مزید موڑ باقی ہیں۔

”لاحول ولا قوۃ۔ وہ کیوں میرے پیچھے بھاگتے؟“ ان کے پنے ٹٹے باضابطہ قسم کے مزاج پر پتھر کی طرح لگا یہ جملہ۔

”اچھا پھر تم وہاں سے بھاگ آئیں؟“ بیلا نے فلاور میکنگ کے عمل کے دوران ایک جملہ ادا کر کے یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ وہ بھی مجلس میں حاضر ہے۔ نہ صرف حاضر ہے بلکہ متوجہ بھی ہے۔

”پھر کیا ہوا؟“ سعدیہ کا اشتیاق سوا تھا۔ اگلے مہینے اس کی بھی منگنی ہونے والی تھی۔

”ارے کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو؟ جب میں وہاں سے آ گئی تو بات ختم، اب کیا ہونا تھا؟“ مڈھوتو اس پھر پھر کی گردان سے جیسے جل کر رہ گئیں۔

”اوہ!“ افشاں نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے گہرا سانس لیا۔ ”آپ کی اسٹوری تو ”فارمولا اسٹوری“ بھی نہیں ہے۔ یہ تو ایسی مظلوم و بے چاری سی کہانی ہے جس کے مصنف کا کہانی لکھنے کے دوران ہی انتقال پڑ لال ہو گیا ہو۔ اور کہانی اُن کہی رہ گئی ہو۔“

”فلمیں کم دیکھا کرو۔“ مڈھوتے بڑا مان کر اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔ ان کے نزدیک تو منگیتر سے تصادم بھی ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ ان کے تورگ و پے میں ابھی تک سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ اور ان سب کے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہیں تھی۔

”بہر حال..... خاک ڈالو اس سارے قصے پر۔ یہ بتاؤ چل رہی ہو بازار؟“ بیلا نے گویا اپنا کام تقریباً مکمل کر لیا تھا۔

”نگار کو لے جاؤ۔ میرا موڈ نہیں ہے۔“ افشاں نے ان کی زندگی کے رنگین تصادم کو بے وقعت کر کے واقعی ان کا موڈ خراب کر دیا تھا۔

”شش.....!“ افشاں نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دروازے کی سمت توجہ مبذول کرائی۔ روحی آپ اپنی نئی چوڑیوں کو چھنکاتی مسکراتی آ رہی تھیں۔

”آپی..... چچا کہہ رہے تھے۔ ان کا بجٹ بگڑ رہا ہے۔ آپ کی چوڑیوں کی وجہ سے۔“ افشاں نے ان کے مسکراتے چہرے پر شرارت بھری نظر ڈالی۔

”اچھا۔ مگر چوڑیاں تو ہم اپنے جیب خرچ سے پہنتے ہیں۔ چچا جان نے ہمارے

جوگن

”ارے وہ ایک دم پیچھے سے سامنے آ گئے۔ میں تو جیسے مر ہی گئی۔“ خاندان کی سب سے بودی، بزدل 1857ء کا بچا کچھا نمونہ، قسم کی مڈھو آپ اپنی نوزائیدہ منگنی کے فوراً بعد پڑنے والی افتاد اس طرح سنار ہی تھیں، جیسے جیمز بانڈ کی سپنس سے بھرپور فلم کا کلاکس چل رہا ہو۔

”اچھا خیر..... پھر آپ زندہ کیسے ہوئیں؟ کسی مسج موعود نے پھوک ماری یا ہاتھ پھیرا؟“ افشاں نے سیب کو دانتوں سے بھنبھوڑنے کے بعد جیسے سپنس سے اکتا کر کہانی کو آگے بڑھانا چاہا۔

”اُف خدایا!“ مڈھو آپ تو حیا سے ڈہری ہو گئیں۔ ”ہاتھ پھیرنے“ جیسا نازیبا اور غیر سنسر شدہ جملہ تو انہیں جیسے زمین میں ہی اتار گیا۔

”کہیں سے تھوڑی بہت شرم اُدھار لے لو۔ اس گھر میں تو کوئی بھی تمہارے جتنا منہ پھٹ نہیں۔“ مڈھوتے واقعی بہت محسوس کیا تھا۔

”مجبوری یہ ہے آپ! اس گھر میں تو مجھے کوئی ”صاحب نصاب“ نظر نہیں آتا۔ سب کا اپنا گزارا ہو جائے تو یہی بہت ہے۔ آپ کے پاس حیا کی ڈھیر ساری دولت ہے۔ اس کی زکوۃ نکالیں تو اس غریب مسکین کا خیال رکھیے گا۔“ افشاں نے اختتامی مراحل سے گزرتے سیب کا جائزہ لیا کہ اب کس زاویے سے منہ مارا جائے۔

”چھوڑیں آپ! آپ بات آگے بڑھائیں۔ پھر کیا ہوا؟“ نگار کی آتش شوق طوالت سے مزید بھڑک گئی تھی۔ اس نے کوفت بھرے انداز میں افشاں کو گھورا تھا جس کی وجہ سے کہانی درمیان میں ٹھہر گئی تھی۔

”پھر نصربھائی نے کچھ کہا بھی؟“

”اُف اللہ۔ اگر وہ کچھ کہتے تو میں کیسے سنتی؟ میں تو بھیتا بھاگ لی وہاں سے۔“ ان کا چہرہ لالوں لال ہو گیا۔

سامنے تو کبھی اعتراض نہیں کیا۔“ وہ حیرت سے افشاں کو دیکھنے لگیں۔

”جو لوگ اسراف ناپسند کرتے ہیں، وہ یہ نہیں دیکھتے کہ جب خرچ ضائع ہو رہا ہے یا قومی خزانہ؟“ نگار نے ان کی خوبصورت چوڑیوں پر پسندیدگی کی نظر ڈالی۔

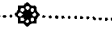
”وہ جو تائی جان نے درجن بھر سونے کی چوڑیاں آپ کو ہوا کر دے رکھی ہیں، وہ کیوں نہیں پہنتیں؟“ افشاں کی نظر میں ان کی ایک سے ڈیزائن والی درجن بھر چوڑیاں چمکتی رہتی تھیں۔

”وہ تو ہم تقریبات میں پہنتے ہیں۔“ وہ بے نیازی سے صوفے پر دراز ہو گئیں اور اپنی چوڑیوں سے کھیلنے لگیں۔

”آپ کب تک اپنی چوڑیوں سے خود ہی کھیلتی رہیں گی؟ دل نہیں چاہتا، کوئی ان حسین چوڑیوں سے کھیلے؟“ سعدیہ نے شرارت سے ان کو دیکھا تھا۔

وہ ساکت سی ہو کر سعدیہ کی شکل دیکھنے لگیں۔ ”ہم سے اس طرح کی باتیں نہ کیا کرو سعدی۔ تمہیں پتا ہے، ہمیں عارضی خوشیوں کے مقابلے میں مستقل غم پسند ہے۔ ہم ہمیشہ خوش رہنا چاہتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ہم عارضی خوشی سے دوچار ہوں۔ کہو۔ آمین۔“ ان کے لہجے میں یکدم خاتم ابھر آیا۔

”آمین۔“ وہ سب تو چپ رہیں۔ افشاں کے منہ سے مگر آمین نکل گیا۔ نگار اس کو گھور کر رہ گئیں۔



واصف بھٹیا ہائر اسٹڈیز کے لیے امریکہ سدھار رہے تھے۔ گھر والے تو تھے ہی اس پر مستزاد پھوپھیاں اور ان کے بچے بھی انھیں الوداع کہنے کے لیے دودن پیشتر آ موجود ہوئے تھے۔

”واصف بھٹیا آپ تو اب نہیں لوٹیں گے۔ جس کو ”امریکا“ ہو جائے اسے پھر اس مرض سے مشکل ہی سے نجات ہوتی ہے۔“ ان کی پھوپھی زاد گوہر نہ جائے ان کے منہ سے کیا سننے کی متنی تھیں۔ اپنی دانست میں انھیں چھیڑ رہی تھیں۔

”اللہ نہ کرے۔ اللہ کرے میرے بھٹیا ساتھ خیریت کے واپس آئیں۔“ نگار نے ناگواری سے گوہر کی طرف دیکھا۔ ”آپا! کسی کو الوداع کہتے ہوئے بدفالیں منہ سے نہیں

نکالتے۔“ وہ لہجے پر کنٹرول کر کے آخر کبہ ہی بیٹھیں۔

”بدفالی نہیں ہے یہ۔ آج کی زندہ حقیقت ہے۔“ گوہر کو ہار ماننا نہیں آتی تھی۔

”انشاء اللہ۔ میرا بیٹا کامیاب ہو کر بہت جلد ہمارے درمیان ہوگا۔“ عائشہ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو محبت اور جدائی کے جذبات سے افسردہ نگاہوں سے دیکھا۔

”اچھا یہ بتائیے لوٹ کر بدھو جب گھر کو آئیں تو آپ سب کے لیے کیا لائیں؟“ واصف اپنی پیکنگ مکمل کر کے اطمینان سے ان سب کے قریب آ بیٹھے۔

”وہ اشیاء تو ہرگز نہ لیجیے گا جو یہاں بھی تھوک کے بھاؤ مل جاتی ہیں۔“ سعدیہ نے حفظ ماتقدم کے تحت فوراً کہا۔

”روٹی آپ! آپ بھی اپنی فرمائش نوٹ کر دیجئے۔“ افشاں کی پھر رگ پھڑکی۔

”کیا ان کے جانے کے بعد فون و خط و کتابت کا سلسلہ نہیں چلے گا۔ ایسی جلدی کیا ہے؟“ وہ بہت انہماک سے گڑیا کا غرارہ سی رہی تھیں۔ پندرہ بیس گڑیاں تھیں ان کے کمرے میں جن میں ”فینسی ڈریس شو“ قسم کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔

”آپ! سے فرمائش پوچھنے کا کیا فائدہ۔ بلکہ ضرورت ہی نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے، چوڑیاں ہی منگوا میں گی۔ کیوں آپ!؟“

”مگر ہم امریکہ سے چوڑیاں نہیں منگوائیں گے۔ امریکیوں کی شکلوں کی طرح بے رونق ہی ہوں گی۔“ انھوں نے سلائی کا سلسلہ روک کر افشاں کو جواب دینے کی فرصت نکالی۔

کمرے میں قہقہے گونجے۔

”ایسی نادان نہیں آپ! کہ ہر کس و ناکس سے چوڑیاں منگوانے لگیں۔ چوڑیاں تو خاص بندہ تحفے میں دے تو مزا ہے۔“ گوہر کھلکھلائیں۔

”کیوں بھابی؟“ انھوں نے کمرے میں داخل ہوتی رشتی بھابی کو گھیرا۔ جو بہت کچھ سن چکی تھیں۔

”مجھے کیا پتا بھئی۔ ہمارے تو کسی نے ایسے چوٹیلے کبھی نہیں کیے۔ خود ہی پہنی ہیں ہمیشہ۔“

انھوں نے کس کر بڑے زہریلے انداز میں گڑیا کا غرارہ سیتی ہوئی روحی کی طرف دیکھا پھر پرنسپل اسٹیج سے بنے پورٹریٹ کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ بے جان اسٹیج نہ ہو، ان

”جن کلائیوں کو چوڑیوں کی عادت ہو، وہ نگلی ہو جائیں تو بہت ستاتی ہیں۔ تمہیں کیا پتا؟“ وہ افسردگی سے پھر سلائی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”ہاں ٹھیک ہے، اگر مجھے بیوگی کا تجربہ نہیں تو آپ بھی تو اس طرح کے کیس میں نا تجربہ کار ہیں۔“ واصف ہنس دیے۔

”ارے ان کا تو دماغ اوندھا ہے، تم بھی بہک جاتے ہو۔ کیسی منحوس باتیں شروع کر دی ہیں۔“ زخشی بھابی تو جیسے بلبلا اٹھیں۔

”بیٹھے ہنس رہے ہو، تم پر بلا لا رہی ہے۔ امریکن کی چوڑیوں کی فکر پڑی ہے۔ یہ نہیں سوچ رہی ساری غمخست بھابی پر آ رہی ہے۔ میرے منہ میں خاک۔ تمہیں کچھ ہوگا تو تمہاری بیابا پر کوئی دکھ پڑے گا۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے۔ جس کے بھاگ تمہارے ساتھ جاگیں، وہ سدا سہاگن رہے۔“

”بھابی! کیوں جان جلاتی ہیں اپنی؟ ان بے چاری کا تو ڈنی توازن.....“

”تو کسی پاگل خانے میں ڈلوادو۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں یہ منحوس باتیں۔“

واصف نے بھابی کو بچ میں ٹوک دیا تھا تو انھوں نے بھی واصف کی بات مکمل نہ ہونے دی۔

”ڈلہن! بڑی بات ہے بھابی سنیں گی تو انھیں رنج ہوگا۔“ عائشہ کو بالا خرہ داخلہ کرنا پڑی۔

”ہم تو انسان ہی نہیں ہیں امی۔ سارے رنج انھیں ہوتے ہیں یا ان کی امی کو ہونہ۔ ہزار دفعہ کہا ہے، الگ مکان لے لیں۔ پاگل ہمارے سر منڈھ رکھے ہیں مگر ہماری سنیں کیوں؟ پاگل ہیں تو کیا ہوا۔ کسی کا دل تو لگا ہوا ہے۔“ وہ بچے کو شانے سے ٹکا کر بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

”بھئی، ہزار مرتبہ کہا ہے، میرے کمرے میں مت آیا کرو۔ میرے پاس فالٹو بھیجے نہیں ہے جو تمہارے ساتھ کھاؤں۔“

”ہم تو ہنسی سے کھیل رہے تھے بھابی!“

”بخشو بی بی مجھے۔ تمہاری تو عمر پڑی ہے کھیل کود کے لیے۔ جب یہ چلنے پھرنے لگے گا تو کھیل لینا، مگر میرے کمرے میں مت آیا کرو۔ سارے گھر میں تو تم آ سب کی طرح

کے شوہر نامہ ارمسود شاہ ہوں اور وہ انھیں کچھ جتا رہی ہوں۔ یہ اسکیج۔ مسعود شاہ کے ایک مصور دوست کا تحفہ تھا۔ شاید اسی لیے ڈرائنگ روم کی آرائشی اشیاء کا حصہ تھا۔

”آپ نے کبھی بھائی جان کو دھیان ہی نہیں دلایا ہوگا اس طرف۔“ نگار نے بھائی کی سائیڈ لینے کی کوشش کی۔

”لو..... اور سنو تجھے بھی دھیان والا کر پورے جاتے ہیں۔ یہ تو خوشی کا سودا ہوتا ہے بی بی! تمہارے بھائی کو سارے دھیان پہلے سے ہیں۔ انھیں کچھ سکھانے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔“ انھوں نے تلخی سے کہا اور ہاتھ میں پکڑی فیڈر شیر خوار کے منہ میں جیسے ٹھونس دی۔

”بھئی، یہ کیا بے معنی سی باتیں شروع کر دیں۔ ہم تو چوڑیوں پر معلوماتی بحث کر رہے تھے۔“ افشاں نے گویا تصادم کا خطرہ ٹالا تھا۔

”آپ لوگوں کو روجی آپ سے اس طرح کی چھیڑ چھاڑ نہیں کرنی چاہیے۔ تائی اماں کو کتنی مشکل ہو جاتی ہے۔ پھر یہ آسانی سے دوا بھی نہیں کھاتی ہیں۔“ واصف نے دبی زبان میں جیسے ان سب کو فہمائش کی تھی۔

”وہ تو خود بہت خوش ہوتی ہیں چوڑیوں کے تذکرے سے۔“ سعدیہ نے کہا۔

”یہ تو ایسا ہی ہے جیسے آپ سب مل کر انھیں پاگل سمجھتے ہوئے مذاق اڑا رہے ہوں۔“ واصف کو جیسے روجی پر بہت ترس آ رہا تھا۔

”اچھا چلیں آپ اپنا موڈ خراب نہ کریں۔ اب نہیں کریں گے اس طرح کی باتیں۔“ افشاں نے امن عامہ کے قیام میں آگے بڑھ کر حصہ لیا۔

”واصف!“ روجی نے سوئی میں دھاگا ڈالنے کا پروگرام موقوف کر کے واصف کو مخاطب کیا۔

”جی!“ وہ ان کے قریب آ بیٹھے۔

”بھئی، تم تو دہیں کسی امریکن سے شادی کر لینا۔ ان کے ہاں تو چوڑیوں دوڑیوں کے شگلن ہی نہیں کیے جاتے۔ کسی عورت کی چوڑیاں ٹوٹتی ہیں تو اس کی ساری ہنسی ہی ٹوٹ جاتی ہے۔“ انھوں نے بڑی عالمہ فاضل بن کر واصف کو مشورہ دیا۔

”اگر عورت چوڑیاں پہننا پسند نہ کرتی ہو تو کیا اس کے بیوہ ہونے کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل جاتا ہے؟“ واصف مسکرا دیے۔

چھائی ہوئی ہو۔ ایک یہ کراہی تو میری پناہ گاہ ہے۔ جاؤ خدا کے لیے یہاں ہے۔“ وہ بڑی طرح جھلارہی تھیں۔

”کیا بات ہے رختی! یہ تم اس سے کس طرح بات کر رہی ہو؟“ مسعود شاہ ہاتھ روم سے باہر آ کر بیوی کے اطوار پر شدید حیرانی کے عالم میں کھڑے تھے۔

”اور کس طرح بات کروں؟ کبھی کبھی میرا بھی دل چاہتا ہے کہ ایک گوشہ تنہائی میں چند سانس سکون کے لے لوں۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی سر پر سوار۔“

”مجھے نہیں چاہیے تفصیل۔ صرف یہ پوچھ رہا ہوں تم اس سے بات کس انداز میں کر رہی ہو؟ یہ اس گھر کا سب سے بے ضرر وجود۔“ مسعود شاہ تولیہ بیڈ پر پھینک کر برہمی سے مخاطب ہوئے۔

”ہونہ۔ سب سے بے ضرر وجود۔ سب سے بڑی جو تک میری شہ رگ سے چٹنی ہوئی۔“ رختی بڑبڑائیں۔

”تمہیں اچھی طرح جان لینا چاہیے۔ جو رشتہ بھی میری ذات سے وابستہ ہے۔ تمہیں اسے اتنی ہی اہمیت دینا ہوگی جتنی میری خواہش ہے اور یہ اس لیے کہ مجھے پتا ہے۔ اس گھر میں مجھ سے اور میری وجہ سے تم سے کس قدر محبت کی جاتی ہے۔ میری چھوٹی چھوٹی خوشی کا خیال رکھا جاتا ہے تو اس کا جواب تم اس طرح سے دوگی؟ جبکہ یہ بے چاری تو اینارمل ہے۔“ انھوں نے بہت ڈکھ سے روحی کی طرف دیکھا۔

”اور شاید آپ بھول گئے ہیں، یہ آپ ہی کی وجہ سے اینارمل ہوئی۔ جوگ لیا ہے اس نے آپ کے نام پر۔“

”شٹ آپ!“ مسعود شاہ دھاڑے۔

روحی انھیں الجھتا دیکھ کر باہر نکل گئی تھیں۔

”یہ ایک معصوم اور پاک سیرت لڑکی ہے۔ اس کے متعلق بات کرتے ہوئے آئندہ

احتیاط سے کام لینا۔ ورنہ۔“

ورنہ۔ شوہر غصے کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے ”ورنہ“ کہہ کر چپ ہو جائے تو ہوش مند بیوی ”ورنہ“ کا مطلب نہیں پوچھتی اور نہ ”ورنہ“ سے آگے گفتگو بڑھانا پسند کرتی ہے۔ خشی کا اگر چہ خون کھول رہا تھا۔ مگر مسعود شاہ کے غضبناک انداز انھیں کسی ممکنہ خطرے کی پیشگوئی

کرتے محسوس ہو رہے تھے۔

اور یوں بھی جس عورت کو شوہر کی وفا اور محبت پر شک یا تذبذب رہتا ہو، وہ کمتری کے احساس سے ہمہ وقت دوچار رہتی ہے۔ بے بنیاد خطرات کی تلوار اسے ہمہ وقت سر پر لٹکتی محسوس ہوتی ہے۔ یہی..... بے اطمینانی و بے اعتمادی اس کی زندگی کا سارا حسن، سارا رس چوس لیتی ہے۔ نہ وہ محبت دینے کے قابل رہتی ہے نہ لینے کے۔ اور جو عورت اپنے مرد کو اپنی فطرت محبت سے سیر نہیں کرتی۔ وہ اپنے پاؤں پر خود ہی کلباڑی مارتی ہے۔ وہ اگر کسی نئی عورت کو نہیں اپناتا تو اس کا بھی نہیں رہتا۔ عجیب سے فاصلے درمیان میں در آتے ہیں۔

دل اُجاڑ، دماغ خنجر، زبان بول۔ بالآخر نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ مرد ”ورنہ“ سے آگے کا ٹکڑا جوڑ کر جملہ مکمل کر دیتا ہے۔

جملہ مکمل ہو جاتا ہے۔

ذات ادھوری..... رہ جاتی ہے۔

مگر مسعود شاہ بہت مضبوط آدمی تھے۔ انھیں غیض و غضب کے عالم میں بھی دھیان رہتا تھا کہ ”عزت“ وہ کمائی ہے جو ایک بار لوٹ لی جائے تو پھر عمر بھر جمع نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی اس معاشرے کا المیہ ہے۔ بہت سی خوبصورت اور زیادہ جمیز والی بیویاں بہت سے معقول مردوں کی زندگی کو مستقل، المیہ بنا ڈالتی ہیں اور وہ ”عزت“ کی خاطر ”سب اچھا ہے“ کی رپورٹ دیتے پائے جاتے ہیں۔

انھیں بچپن میں پڑھی یا سنی ہوئی وہ کہانیاں یاد آنے لگتی ہیں جن کے اختتام پر لکھا ہوتا تھا یا بتایا جاتا تھا کہ ”راوی آگے چین لکھتا ہے“ اور ایک آہ سرد ان کے سینے سے آزاد ہوتی ہے اور وہ سوچتے ہیں انھیں ”چین“ کے جے بھی یاد ہیں یا نہیں؟

انہی آفت زدگان میں مسعود شاہ کا شمار بھی ہوتا تھا۔ رختی خوبصورت بھی تھیں۔ اور ”جمیز یافتہ“ بھی، ڈگری نے ان کا کچھ نہ بگاڑا تھا۔

اگر ان کی بڑی بہن میاں سے لڑکر میکے میں پڑاؤ نہ ڈالے ہوتیں تو شاید آج وہ اتنی احتیاط سے کام نہ لیتیں۔ مسعود شاہ کو ایک بار سبق تو سکھا ہی دیتیں۔ مگر پرسوں می سے بات ہوئی تھی فون پر۔ وہ ان کی بڑی بہن کے گھر بلو جھگڑے کی وجہ سے بیمار پڑ چکی تھیں۔ ان کا بلند پریشر مستقل ہائی ہو رہا تھا۔

بڑے افتخار سے مسکرائیں۔

”جی نہیں۔ افلاطون نے واقعی غلط کہا تھا۔ انسان کو شش کرے تو خاطر خواہ تبدیل عمل میں آسکتی ہے۔“ رافع کب ہار ماننے والا تھا۔

”ہم ڈرائنگ روم میں ہیں یا ”ایٹینئر“ میں۔ افلاطون و سقراط کے حمایتیوں و مخالفوں میں ٹھن گئی ہے۔“ واصف بھیا مسکرا دیے۔

”کس بحث میں الجھ گئے ہیں۔ رافع بھائی! چلیں شروع کریں۔“ بیلا کو تو بیت بازی میں بڑا لطف آتا تھا۔

بیت بازی شروع ہوئی۔ لڑکیوں اور لڑکوں کی دو ٹیمیں تھیں۔ اس قدر غل غپاڑہ چا کہ تو بہ ہی بھلی۔ ہار ماننے والی تو کوئی ٹیم بھی نہیں تھی۔ مقابلہ اس قدر طویل ہوا کہ ”اسٹاک ایکسچینج“ میں مندی کا رجحان پیدا ہونے لگا۔ مطلوبہ شعر خاصی دیر برآمد ہونے لگا۔

آخر ایک جگہ لڑکیوں کی گاڑی انک گئی۔ حرف ”الف“ کا استعمال دونوں طرف سے اس قدر ہوا کہ دوسرے حروف سے شروع ہونے والے اشعار تو یاد آ رہے تھے مگر ”الف“ سے شروع ہونے والا یاد نہیں آ رہا تھا۔ لڑکے انھیں سوچ میں ڈوبا دیکھ کر فحش کا جشن منانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

ابھی سے دل و جاں سر راہ رکھ آئیں

کہ لٹنے لٹانے کے دن آ رہے ہیں

روحی اپنی گڑیا تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

بہت ہمدردی سے مسکرا کر انھوں نے لڑکیوں کی ”مدد“ کی تھی۔

”واہ واہ روحی آپنی زندہ باد۔“ لڑکیاں خوشی سے چیخ پڑیں۔

”روحی آپنی مقابلے میں شامل نہیں تھیں۔ یہ دھاندلی ہے۔“ واصف کا ایک اور خالہ زادندیم چیخ اٹھا۔

”مگر بہر حال وہ لڑکی ہیں۔“ انشاں نے اطمینان سے کہا۔

”مگر رولز و ریگولیشن میں لکھا ہے کہ۔۔۔“

”جی نہیں۔“

”جی ہاں۔“

اس لیے رختی نے اپنا ”پروگرام“ ملتوی کر دیا تھا۔ اب خاموشی سے ہنی کو گود میں بھر کر کمرے سے باہر چلی گئی تھیں مگر خون آشام نظروں سے اس طرف دیکھنا نہ بھولی تھیں جس طرف روحی کی موجودگی کا احتمال تھا۔

واصف کی فلائٹ رات دو بجے کی تھی۔ چند قریبی کزنز بھی آ موجود ہوئے تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ پہلے تو تاش و کیرم کھیلے گئے، پھر بھی ٹائم پاس نہ ہوا تو بیت بازی کی محفل جم گئی۔ لڑکیاں بھی نماز پڑھ کر ہنگامے میں شامل ہو چکی تھیں۔

روحی البتہ سارے ہنگامے سے الگ تھلگ ایک موڑھے پر بیٹھی ایک بڑی سی گڑیا گھنٹوں کے بیچ دو بچے اس کے ریشمی بالوں میں پراندہ ڈال رہی تھیں۔ ریشم و پوت سے یہ پراندہ ان کی تازہ ترین تخلیق تھی۔

”ارے آپ! آپ تو ویسے بھی بڑی ادبی قسم کی چیز ہیں۔ آئیے ناں بیت بازی کی محفل شروع ہے۔“ واصف کے خالہ زاد رافع نے روحی کو دعوت دی۔

”بھئی، سب کچھ پڑھنے کی حد تک ہے۔ یہ بیت بازی وغیرہ مجھے پسند نہیں۔“ انھوں نے گڑیا کا رخ اپنی طرف کرنے کے بجائے خود آگے چہرہ کر کے گڑیا کے بالوں کی سینک دیکھنے کی کوشش کی جیسے وہ گڑیا نہ ہو۔ کوئی بھاری بھر کم قسم کی لڑکی ہو جسے آسانی سے اپنی طرف گھمایا نہ جاسکے۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“ رافع نے انھیں پھر متوجہ کیا۔

”بھئی، اپنی اپنی فطرت ہوتی ہے۔ ہر انسان کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ تم نے شاید پڑھا یا سنا ہو۔ افلاطون نے کہا تھا فطرت آزاد اور غلام الگ پیدا کرتی ہے۔ ہر ایک کا اپنا انداز فکر ہوتا ہے۔ ایک چیز کسی کو پسند ہوتی ہے تو دوسرے کو ناپسند۔“ ان کی تو عام باتیں ہی بڑی عالمانہ و فاضلانہ ہوتی تھیں اس پر سے ان کی شان بے نیازی۔

”اور آپ کو یہ بھی پتا ہوگا کہ اسی ”نظریے“ کی مخالفت پر سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا تھا؟“ رافع کو ان سے الجھنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔

”تو پھر ہوئی ناں۔ اپنی اپنی سمجھ اور پسند کی بات۔“ وہ جیت جانے کے احساس سے

وہ چیخ و پکار شروع ہوئی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دی۔ مسعود شاہ بھی اندر آ گئے۔ پیچھے پیچھے چائے، کافی کی ٹرائی دھکیلتی رختی بھی۔

”کیا مسئلہ ہے بھئی؟“ مسعود شاہ کو اندازہ تو تھا کہ ہوگی کوئی شرارت۔ کہ باقاعدہ طور پر سب شریعت تھے۔

”آپ ہی انصاف کیجئے مسعود بھائی!“ رافع نے دہائی دی۔

”اچھا بابا بات تو بتاؤ۔“ وہ ہنستے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔ واصف نے قصہ بیان کرنا شروع کیا۔

رختی سب کی طرف باری باری کپ بڑھانے لگیں۔

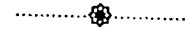
”اوہ! یہ بات ہے۔“ تفصیل سن کر انھوں نے روجی پر ایک نظر ڈالی۔

”روچی آپ کی وجہ سے سارا کھیل تلیٹ ہوا۔“ ندیم نے شکایتی انداز میں کہا۔

”بونہ..... دیکھتے جاؤ، ابھی تو ان کی وجہ سے جانے کیا کیا تلیٹ ہوگا۔“ رختی کے لہجے میں اتنا زہر تھا کہ مسعود کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

”انصاف ہونے تک آپ نہیں جاسکتیں۔“ رافع نے روجی کو باہر جانے سے روکا۔

”اسی بہانے کچھ دیر۔ یہاں بیٹھو بی بی! عدالت لگ رہی ہے۔“ رختی بھابی کی طنزیہ ہنسی مسعود شاہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔



دس کمروں کی اس دو منزلہ عمارت میں تین بھائیوں کے خاندان آباد تھے۔

سب سے بڑے حمود احمد شاہ مرحوم جن کی صرف دو بیٹیاں، دردانہ اور روحانہ تھیں۔ ان سے چھوٹے سعد احمد شاہ تھے جن کی دو بیٹیاں، مدیر عرف مدھو اور افشاں اور دو بیٹی بیٹے تھے مسعود شاہ اور واصف شاہ۔ سب سے چھوٹے محمود احمد شاہ تھے۔ ان کی بھی صرف دو بیٹیاں تھیں نگار اور بیلا۔

اس خاندان کو اللہ نے خوشی اور نعمت کے جلوے بھی دکھائے تھے۔ اور اندوہ بیکراں کے نظارے بھی۔ پہلا اور بڑا دکھ جس سے روحانہ عرف روجی کی چپ کا آغاز ہوا تھا۔ وہ ان کی سب سے چھوٹی اور سب سے حسین ولاڈلی پھوپھی کی بیوگی کا سانحہ تھا۔ ان کے شوہر کی سنر ہو گیا تھا۔ پھوپھو اپنے شوہر کو علاج کی غرض سے ہی کراچی لائی تھیں اور حکم الہی ان کا انتقال بھی

یہیں ہوا تھا۔ چار سال کی بچی ان کی گود میں تھی۔

روچی، پھوپھا کے سر ہانے بیٹھی سپارہ پڑھ رہی تھیں، جب عورتوں نے بے ہوش پھوپھو کی کلائیوں سے چوڑیاں اتاری تھیں۔

جوان پھوپھی کی بربادی کا منظر نہ جانے کس زادے سے دیکھا تھا کہ کبھی ذہن سے محو نہ ہو سکا۔ جائے نماز پر بیٹھتیں تو جیسے سریش لگا کر بیٹھتیں۔ گھبرا کر علاج معالج شروع کیا گیا۔ عادتوں میں قدرے تبدیلی ضرور ہوئی مگر چپ ٹوٹ کر نہ دی۔ گھنٹوں کسی سے مخاطب نہ ہوتیں۔ کوئی بات کرتا تو جواب دے دیتیں۔ مرضی نہ ہوتی تو اس طرح بیٹھی رہتیں جسے کچھ سنا ہی نہیں۔ ابھی شفیق سے باپ کی محبت سے جی بھر کر سیراب بھی نہ ہو پائی تھیں کہ وہ بھی چل بے۔ شاید جوان بہن کا دکھ انھیں اندر ہی اندر کھا گیا تھا۔ پھر دوسرے بیٹی کی افتاد..... کس طرح پاگل ہو رہے تھے۔ وہ روجی کی خاطر۔ کہاں کہاں اسے لے کر نہ پھرے تھے علاج کی غرض سے؟ ان ہی کی محنتوں کا ثمر تھا کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں واپس آ گئی تھیں۔

مگر..... جس رات بڑی چچی نے ماں کی کلائی سے اترنے والی چھ سونے کی چوڑیاں انھیں تھما کر کہا۔

”روچی! انھیں حفاظت سے رکھ دو۔“ اس رات سے پھر ان کا ذہن خلاؤں میں تیرنے لگا تھا۔

ابو جان کے چہلم کے فوراً بعد انھوں نے ماں کو صاف صاف کہہ دیا، وہ شادی نہیں کریں گی۔ نہ مسعود شاہ سے نہ کسی اور سے۔ گھر میں ایک نیا طوفان برپا ہو گیا۔ مسعود شاہ تو جیسے ریزہ ریزہ ہو گئے۔ مگر وہ کسی طرح بھی ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ نہ وجہ بتائی۔ بڑی چچی جوان کے ”نفسیاتی کیس“ بننے کے بعد سے پریشان رہنے لگی تھیں۔ دل ہی دل میں شکر کا کلمہ پڑھ ہی تھیں۔ مگر روجی کی ماں، بڑے چچا اور مسعود شاہ کو اپنا آپ سنبھالنے میں خاصا عرصہ لگا۔ بڑی چچی نے ان کے دکھ کا مداوا تو اس طرح کیا کہ اپنی خوبصورت بھتیجی بیاہ لائیں۔ روجی اور مسعود شاہ کی نسبت کا ذکر تو سارے خاندان میں ہو چکا تھا اور یہ بھی کہ مسعود شاہ بادل خواستہ شادی پر رضامند ہوئے۔ یہی ایک بات رختی کو ڈستی رہتی تھی کہ جس کے سبب مسعود شاہ کا دل ویران ہوا، وہ ہر وقت سامنے رہتی ہے۔ ان کے اعصاب کی مصروفیت، ان کے حواس کا پرتو، اور نری یادداشت ہے جو چوبیس گھنٹوں میں کسی بھی لمحے محو ہونے کا امکان نہیں رکھتی۔ مسعود شاہ سے

قربت کے وہ لمحے جو کسی بھی بیوی کا حق ہوتے ہیں۔ ان کے دوسروں کی نذر ہو جاتے تھے۔
مسعود شاہ کی ہر مہربانی پر ان کی تلخی بڑھ جاتی تھی۔ انھیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے حق
نہ دیا جا رہا ہو ”ذیوٹی“ ادا کی جا رہی ہو۔

حالانکہ مسعود شاہ، روجی کو رحم سے تو دیکھتے تھے۔ آلودہ نظری سے نہیں۔ وہ مرد تھے۔
جب پھوپھو گھٹ گھٹ کے روتی تھیں، تو وہ پھوٹ پھوٹ کے روتی تھیں۔

نماز پڑھتیں تو سجدے طویل ہوتے جاتے۔ ان کے سجدوں کی طوالت۔ آنسوؤں سے
بھیگی جائے نماز۔ ان کے فکرا نہ مزاج کے افق پر نئے نئے معنوں کا سورج بن کر طلوع ہوتی۔ ان
دنوں انھوں نے تھوک کے بھاؤ پینٹنگز بنائی تھیں جو سب کی سب غم و ملال کی عکاس تھیں۔

ابھی تو پھوپھی کے غم سے اکتساب جاری تھا۔ زندگی حقیقتوں کے پردے سر کا کر کچھ
دکھانے اور سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ان سے بڑی دردانہ کے جواں سال شوہر کے حادثے
میں چل بے۔ زندگی سے بھرپور آب پابی سونی کلائیاں لیے دلہیز پہ آ کھڑی ہوئیں۔ اسی رات
پھوپھو کو برین ہیمرج ہوا تھا۔ یعنی غم کا سلسلہ دراز ہوا تھا۔ وہ اپنے خدائے مجاز سے زیادہ دن
دور نہ رہ سکی تھیں۔

پھوپھو کی ویرانیاں جو زندگی کو نئے عنوان دے رہی تھیں۔ وہ اب آب پابی کو منتقل ہو
گئیں۔ پردے پر وہی..... منظر چلنے لگے۔ صرف چہرہ بدلا تھا۔ روجی کی چپ اب گہری اور
مستقل ہو چکی تھی۔

ان کے اندر اتنی خاموشی سے تبدیلیاں در آئی تھیں کہ کسی کو احساس تک نہ ہو سکا نہ
ان کی ماں کو اور نہ مسعود شاہ کو جن سے وہ بچپن سے منسوب تھیں۔ آب پابی کا راتوں کو جاگنا، لان
میں ٹہلنا، تسبیح کرتے ہوئے آنکھوں سے موتی برسنا۔

شادیوں کی تقریبات اور عید کے دنوں میں بند کمرے میں ان کی بیوگی بال کھولے
بین کرتی محسوس ہوتی تو ان کے برش سے راتوں رات ایک تصویر مکمل ہو جاتی۔ آب پابی کو انھوں نے
کبھی رات کو پر سکون سوتے نہیں دیکھا۔ جب آنکھ کھلی ان کا بستر خالی پایا۔ یا تو جائے نماز پر
ملتیں یا لان میں ٹہتی ہوئی۔ ان کا دل بہت نازک تھا شاید۔ مسلسل حزن کی تاب نہ لاسکا۔ دوسری
شادی کا ذکر انھیں گالی کی طرح لگتا۔ ان کا غم بڑھ جاتا۔ بے قراری سوا ہو جاتی۔ دل نا صورت ایک
رات پھڑک پھڑک کر ہمیشہ کے لیے ٹھہر گیا۔ گڑیاسی آب پابی ہمیشہ کے لیے سوتی رہ گئیں۔

اور اس شب کرب و بلا میں بہت سے ہوش مند چونک پڑے تھے۔ روجی کے انداز
اس دن بہت اجنبی و غیر معمولی محسوس ہوئے تھے۔ جنھیں شدت غم کا عنوان دے کر نظر انداز کر
دیا گیا تھا۔ مگر دن گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی عجیب و غریب حرکات سامنے آنے لگیں۔
نہانے جاتیں تو گھنٹوں کے لیے غسل خانے میں بند ہو جاتیں۔

ہاتھ دھوئیں تو دھوئے چلی جاتیں۔

انھیں دکھ کے بعد سمجھوتے کے ہنر آ گئے تھے۔ پھر ان کا ضمیر بھی مجرم نہیں تھا۔ اسی
لیے وہ سکون باطنی سے عاری نہیں تھے کہ روجی کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ فطری تھا۔ اس میں ان کا
ہاتھ نہ تھا۔ وہ فرسٹ کزن ہونے کے ناتے اور روشن ضمیر کی وجہ سے اپنی تائی اور روجی کو اپنی
ذمہ داری جانتے تھے مگر رنجی کی تنگ ذہنیت نے ان کا ذہنی سکون برباد کر دیا تھا۔

بیلا ابھی ان کی طعن بازی سن کر افسردہ سی لان میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے مسعود
بھائی روجی آپ سے بھی زیادہ مظلوم دکھائی دیتے تھے۔

واہ روجی آپ۔ آپ نے تو اپنے سارے غم اور خوف کے امکانات کو موت کی نیند سلا
دیا خلاؤں سے نانا جوڑ لیا۔ مگر بے چارے مسعود بھائی۔ آہ۔“

چوڑیوں کی جھنکار پر اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ دوسو گز سے زائد رقبے پر
بنے لان کے ایک انتہائی کونے میں جامن کے پیڑ تلے روجی عجیب سی ترنگ میں جھولا جھول رہی
تھیں۔ اڑتے بالوں کو ہاتھوں سے سمیٹتیں تو چوڑیاں چھن چھن بجنے لگتیں۔ بلا کا اطمینان ان
کے انداز سے ظاہر تھا۔ پیڑ گرین کر نکل کے کرتا شلوار اور دوپٹے میں اپنی کھوئی کیفیت
کے ساتھ وہ اتنی ماورائی سی لگیں کہ بیلا ایک ٹک انھیں دیکھتی چلی گئی۔

اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ کوئی جوگن ہوں۔ جو کسی خوش آئند امکان کو سامنے رکھ
کے روز سنورتی ہے۔ پھول چھتی ہے۔ گجرے بناتی ہے۔

آس کا دیا جلا کر۔ جیسے چاند کی زمین کے رومان سوچتی ہے۔ مسکراتی ہے۔ کھلکھلاتی
ہے۔ دنیا سے نانا توڑ کر محض فطرت سے رشتہ جوڑ لیتی ہے۔ جس کے روپ سنگھار کو کسی
”حادثے“ کا خطرہ نہیں ہوتا۔ دنیا دہی تغیرات اسے نہیں ڈراتے جسے وہم و ناامیدی کے ناگ
نہیں ڈستے۔ ایک دھن میں رہتی ہے۔ ایک کی دھن میں رہتی ہے۔ جو طلب کا دامن سمیٹ
لیتی ہے۔ جو نقصانات کے شمار بند کر دیتی ہے۔ جس کے حسین ہاتھ دیا جلاتے ہیں یا پھول

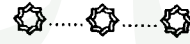
پروتے ہیں۔

”یہا!“ معاً قریب سے اسے روجی کی آواز سنائی دی۔ وہ خیالات کی رو میں بہہ کر جانے کس طرف نکل گئی تھی کہ اسے پتا ہی نہ چلا وہ جھولے سے اتر کر کب اس کے قریب چلی آئیں۔

”جی آپ؟“

”میں نے سرخ اور ہری چوڑیوں کا ایک سیٹ بنایا تھا۔ رکھ کر بھول گئی ہوں۔ تم نے تو نہیں دیکھا۔“ وہ اس سے پوچھنے کے دوران بھی ذہن پر زور ڈال رہی تھیں۔

”نہیں آپ!“ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں آنسو چپکنے لگے۔



حسب، نسب، کسب

مطلق العنانی وہ کہ موروثی بادشاہ و راجے مہاراجے غش کھائیں۔ (مارے رشک کے) کروفر کہ وہ ملکہ و کنوریہ کے بُت کو پسینے چھوٹیں، انداز بیاں پڑتھم اور بلا کا پڑ جوش کہ لیڈر اپنے لیڈر کا۔۔۔ لیڈر مانیں بصد کمال اکسار و احترام ابامیاں اور اماں جان علامہ اقبال و چودھری سر شہاب الدین کی چلتی پھرتی یادگار میں نظر آتے تھے۔ (نوک جھونک کرتے ہوئے) خدا معلوم ابامیاں ان کی حکومت میں ایک رائے و ہندہ کی حیثیت سے بھی پرے کیوں تھے۔ مذاق و موڈ میں ہنستیاں ضرور کس دیا کرتے۔ جن سے اماں جان مزید نخرے میں آ جاتی تھیں۔ نہایت ناز و نخوت سے سر جھٹک دیتی تھیں۔ ابا جان علامہ موصوف کی طرح شگفتگی کا مظاہرہ کرتے اور اماں جان ان کے مذاق پر مزید تیکھی ہو جاتیں یا شاید ابامیاں کے مرعوب یا محکوم ہونے کا یہ سبب تھا کہ اماں جان نے انھیں گھریلو بکھیروں سے کوسوں دور رکھا تھا۔ کیا خاندانی ذمہ داریاں ہیں کیا بچوں کے اسکول کالجوں کے جھگڑے۔ کیا ریتوں، رسموں پر لینا دینا۔ ابامیاں کی جانے بلا۔ شاید چپ اظہار قدروانی تھا۔

بچے جب تک چھوٹے رہے بھلے رہے کہ برداشت کر جاتے تھے مگر اب بچوں کو بھی جائز ناجائز کی سمجھ آ رہی تھی بلکہ آ گئی تھی۔ مبالغہ تو ہے مگر زیادہ نہیں کہ پانی تک پوچھ کر پو۔ عبد الصمد جب چھوٹے تھے تو دوست بھی اماں کے مرضی اور پسند سے منتخب کرتے تھے۔ انھیں یاد تھا کہ کوئی نیا بچہ ان کے ہمراہ نظر آتا فوراً پوچھ گچھ ہوتی۔

”کون ہے؟“

”کہاں سے آیا ہے؟“

”باپ کیا کرتا ہے؟“

”کتنی دیر پڑھتا ہے؟ کتنی دیر کھیلتا ہے؟“

جوابات تسلی بخش مل جاتے تو بنا کچھ مزید کہے اندر ہو جاتیں۔ ابا جان کو اس انٹرویو کی

تھا۔ گھر کے شہنشاہی ماحول میں ان کا دم گھٹنے لگا تھا۔

”یہ نیا سوٹ کب سلوایا؟“

”اتنے کپڑے بنانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”سوٹ کی تو سلائی ہزاروں پہ جاتی ہے۔ باہر رہ کر تم فضول خرچ ہو گئے ہو۔“

وہ وکیل تھے سرکاری ملازم تو نہیں کہ ان کے وقت کا حساب رکھا جائے۔

ماں سدا اس کروفر سے رہی تھیں کہ سامنے بسا رکوشش کے زبان نہیں کھلتی تھی۔ چھ

فٹ کے مضبوط جسم کے مالک تھے اتنے ہی مضبوط اعصاب کے۔

تابندہ کی شادی انھوں نے اپنی مرضی سے طے کی۔ وہ جانتے تھے کہ تابندہ کو خالہ

کے گھر کا ماحول اور ان کی اولادیں بالکل پسند نہیں۔ انھوں نے رشتہ طے ہو جانے پر تابندہ کی

آنکھیں کئی بار متورم دیکھی تھیں۔

ابا میاں سے کوئی بات کرنا بیکار تھی ان کا ایک ہی جواب تھا ”بھئی تمہاری ماں بہت

سمجھدار ہیں۔“

وہ رخصت ہوئی تو ستر مرتبہ بیہوش ہوئی۔ یہ بیہوشیاں محض غم جدائی نہیں تھیں۔ غلط

فیصلوں کے تیز زہر لیے خنجر اس کی سانسوں کو چنپنے نہیں دے رہے تھے۔

وہ جانتے تھے کہ اباں جان اس بات سے لاعلم ہیں کہ تابندہ راگھ کی ڈھیری ہے جو

بکھرتی رہے گی۔ وہ اس روز عدالت جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے کہ جلدی میں کف کا بٹن

ٹوٹ گیا۔ وہ تابندہ، درخشندہ کے مشترکہ کمرے کی طرف بڑھے تو اندر سے آواز آئی۔

”رختی! قسم سے انہوں نے کل میری دونوں سہیلیوں کے سامنے مجھے برا بھلا کہا۔

میری بھی حیثیت ہے۔ کوئی ہستی ہے اللہ کرے میں مر جاؤں یا۔ یہ۔“

”ہائے تو بہ بابی۔ ماں کو بھی کوئی ایسے کہتا ہے۔ استغفار کریں۔“ رختی کانپ گئی۔

”اپنی ناک چوٹی کی لمحہ لگ رہی ہے۔ ہماری کوئی عزت ہی نہیں۔“ تابندہ بوڑبائی۔

عبدالصمد اندر داخل ہوئے تو تابندہ غسل خانے میں گھس گئی انھوں نے رختی سے بٹن

لگوایا۔ مگر تابندہ کا طرزِ مخاطب ان کے اعصاب پر ہتھوڑے برساتا رہا۔ سارا وقت وہ یہی

سوچتے رہے کہ اس نے ایسا کیوں کہا؟

تابندہ کی شادی پر انھوں نے ثریا کو دیکھا تھا اور سو جان سے فریفتہ ہو گئے تھے۔ وہ

وجہ تسمیہ یہ بتائیں۔

”صحبت سرلیع الاثر نشہ ہے اچھی ہو یا بُری۔ بچوں کی بنیاد اچھی اٹھے تو ساری عمر چین

کی بانسری بجاتے گزرتی ہے۔ ماں باپ کی بھی اور بچوں کی بھی۔“ ابا میاں قائل ہو کر گردن ہلا

دیتے یہ ہلٹی گردن اماں جان کی کرسی مضبوط کرتی گئی۔

بچوں کے کھیلنے، کودنے، پڑھنے کے اوقات مقرر تھے۔ بے وقت کبھی کھانا نہیں ملتا

تھا۔ خواہ کوئی بھوکا پڑا سو رہے۔ اماں جان کے تمام تر احسانات میں قوی تر احساس ”احساس

فخر“ تھا۔ جب سسرال کی چوکھٹ پر قدم دھرا سوائے بوڑھے سر کے گھر میں کوئی نہ تھا۔ تین

نندیں اپنے اپنے گھر کی تھیں۔ دیور کوئی نہ تھا، جینٹل الگ رہتے تھے نوکری کے سلسلے میں۔ میکے

میں بھی سب سے بڑی تھیں۔ گویا بلا مقابلہ منتخب ہوتی چلی گئیں اور یہ اعزاز کوئی کم تھا۔ سید زادی

بھی کوئی بنا پستی نہیں تھیں۔

مگر اب ان کے نادر شاہی احکامات بچوں کے لیے احساسِ خفت بن جایا کرتے تھے۔

تابندہ، رخشندہ، عبدالصمد سے چھوٹی تھیں۔ کبھی اپنی سہیلیوں کے ہمراہ بیٹھی ہوتیں۔

اماں جان اندر آ کر ان پر نظرِ غائر دوڑاتیں۔

”یہ تم کیا چار چار گھنٹے تک باتیں کیا کرتی ہو؟ یہ تمہارا پڑھنے کا وقت ہے۔“ پھر

سہیلیوں سے مخاطب ہوتیں ”کیوں بھی لڑکیو! تمہارے گھروں میں کوئی پوچھنے کھنے والا نہیں

ہے؟ کیسے ماں باپ ہیں تمہارے جو اس قدر لاپرواہ ہیں کبھی ملوانا مجھے اپنی ماؤں سے۔“

غالباً اماں جان ماؤں تک پہنچ کر اپنی حکومت کی وسعت کے خواب دیکھتیں۔ تابندہ،

درخشندہ کڑھ کر رہ جاتیں، مارے شرمندگی کے آنکھیں بھر آتیں۔ رختی کے وقت چپکے سے

سہیلیوں کے کانوں میں کہتیں ”برامت منانا۔ اماں جان تم لوگوں کو بھی ہماری طرح سمجھتی ہیں

یعنی بیٹیوں جیسا۔ دل کی بڑی نہیں۔“

اور تو اور عبدالصمد پورے اٹھائیس برس کے مرد ہو گئے تھے مگر اماں اب بھی اٹھائیس

دن کے بچوں کی طرح ان پر نگاہ رکھتی تھیں۔ پہلے پہل تو انھوں نے ان پابندیوں پر کچھ بھی

محسوس نہیں کیا تھا۔ ماں نے غیر معمولی صاف ستھرا اور پرسکون گھر لیا ماحول دے رکھا تھا۔ انھیں

احساس تک نہ ہوا کہ ماں ان کے اوڑھنے سونے میں بھی دخیل ہیں۔

مگر جب سے بار ایٹ لاء کر کے جرمنی سے لوٹے تھے۔ ذہن جمہوریت پسند ہو گیا

رشتوں کے ریشم
خدا کی ضد بحث نہ کرو۔" یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئیں۔



ایک پیچیدہ کیس تھا۔ اغوا کا کیس تھا۔ ملزم کا بیان تھا۔ لڑکی خود اپنی رضا سے اس کے ہمراہ فرار ہوئی تھی۔ لڑکی کی ماں کا کہنا تھا کہ اسے اغوا کیا گیا تھا اور لڑکی بھی یہی کہہ رہی تھی کہ اسے کالج سے واپسی پر اٹھایا گیا۔ آج مقدمے کی پہلی سماعت تھی وہ بار روم میں بیٹھے اپنے مقدمے کی سماعت کا انتظار کر رہے تھے ان کے خیال میں ان کا نمبر لچ کے بعد ہی آنا تھا۔ وہ فائلیں کھول کر بیٹھ رہے۔

"السلام علیکم جی.....!"

انہوں نے سامنے دیکھا چست کپڑوں میں ملبوس اسی مغویہ کی ماں تھی اس کے ہمراہ برقعے میں لڑکی تھی جس کے دیدار سے وہ ہنوز محروم تھے.....
"دیکھیں جی..... ہم نے ساری باتیں سچ سچ بتائی ہیں۔ یہ شخص بہت عرصے سے آتا جاتا تھا۔ ہمارے گھر..... ذلیل ہے پکا..... بڑی جب تھی تو اس کے پاس رقم نہیں تھی اسے تو کویت کا شیخ لے گیا اللہ رکھے سکھی ہے..... البتہ میں اسے ڈاکٹری پڑھانا چاہتی ہوں۔
ہزار بار جتانے پر بھی کہ میں اس کا ہاتھ کسی شریف آدمی کے ہاتھ میں دوں گی، یہ منہوں پیچھے ہی پڑا رہا۔ یہ کرتب دکھائے اس نے..... وہ تو قسمت اچھی تھی....."
"آپ.....؟" عبدالصمد انک گئے۔

"مقدر کے لکھے ہیں..... جب میں اس کے جتنی تھی دلی سے حیدر آباد آئی تھی۔ تین برس دھندہ کیا تھا پھر ایک ساہوکار سے، وہ فلمیں بھی بناتا تھا نکاح کر لیا جس سے یہ..... کیااں ہوئیں۔ مگر ہماری بات کو لوگ سچ کب مانتے ہیں۔ وہ ساہوکار تو دل کے دورے میں پس بسا۔ اب بچوں کا پیٹ تو پالنا ہی تھا پھر دھندا کرنے لگی۔ مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ بچوں کو دوری رکھوں گی۔ بڑی کی تصویر کیلنڈر پر چھپی تو شیخ نے در کی مٹی لے لی۔ وہ تو وہاں راج کر رہی ہے۔ مگر اس کینے نے ہم پر زندگی تنگ کر رکھی ہے۔"

وہ نہ جانے کون سے شجرے پر نازاں ماورزادنگی گالیاں مہذب وکیل کے سامنے دے رہی تھی۔

"مقدمہ میرے حق میں ہو گیا تو سونے سے لاد دوں گی۔"

رشتوں کے ریشم
تابی کی سہیلی تھی۔

دو برس بعد ان کی شادی کا ذکر چھڑا تو انہوں نے ثریا کا نام لے دیا۔ جس پر چند لمحے گنگ رہ کر ماں نے بیٹے کو دیکھا۔ پھر ماتھے پر سینکڑوں بل ڈال کر بولیں۔
"کیا میں اس قدر گئی گزری ہوں کہ ڈھنگ کی بہو بھی نہیں لاسکتی یا مجھ میں پرکھ کا سلیقہ نہیں۔ یا تم بیہوش ہو کر ماں کو کسی قابل ہی نہیں گردانتے؟"
"یہ بات نہیں اماں جان۔"

"نہیں میاں! یہی بات ہے۔ میں نے تو تمہاری پرورش اس منہ پر نہیں کی تھی کہ تم پرائی بچیوں پر آنکھیں لگاؤ۔ تاکتے پھرو....."
گویا انہیں بے شرمی کا طمانچہ مارا گیا تھا۔

ان کا جی چاہا ماں سے کہہ دیں کہ ہماری پرورش میں اس بات کا بھی خیال رکھنا تھا کہ جذبات دل میں پال ہی نہ سکیں۔ یا غیر سیدوں سے میل ہی نہ رکھنا تھا۔
"بہر حال..... اماں جان....."

"کیا بہر حال اور کیا غیر حال غیر سید زادی لا کر میں اپنے خاندان کی لٹیا نہیں ڈبو سکتی۔ سنا تم نے۔ کوئی حسب نسب ہو ڈھنگ کا تو بات بھی ہو۔ یہاں تو نائی، قصائی، سقے، چمار، شیخ سید بنے بیٹھے ہیں۔ تم کل کے بچے کیا جانو..... غیر خاندان میں تو کبھی مٹی لینے بھی نہ جاؤں گی۔ صحیح شجرہ کون بتاتا ہے۔"

خاندان میں دیکھی بھالی لڑکیاں ہیں۔ جب تم نے اڑنگا لگا ہی لیا ہے تو ان میں سے بتا دو۔"

اماں نے گویا سات پستوں پر احسان عظیم کیا۔

"ان میں سے کوئی بھی نہیں۔"

"یعنی کہ..... کیا مطلب.....؟" (صفا چٹ جواب پر حیرانی)

"صرف وہی..... صرف اور صرف..... اس وقت ان پر بیہوشی سوار تھی دھن میں بولے۔"

"اے کیا اٹو کا گوشت کھلا گئی تھی؟ دیکھو آج کل کی چلتے لڑے۔"

"اماں..... اس بیچاری سے تو میری بات بھی نہیں ہوئی کبھی....."

"اے جانے دو بیچاری کو..... خوب جانتی ہوں..... دیکھو صدمہ میاں تم سمجھا رہو، خواہ

وکیل صاحب!“ وہ گویا جوش دلاتے ہوئے بولی۔

”جی نہیں شکریہ۔ مجھے فقط اپنی فیس درکار ہوگی۔“ انھوں نے رسانیت سے جواب دیا۔
لڑکی ہنوز خاموش تھی۔ مہربانی ذرا باہر گئی تو وہ ایک کرسی پر ٹنگ گئی۔

وہ اسی طرح سر جھکائے مصروف رہے۔

کافی دیر بعد سر اٹھایا تو اس پر اتفاقیہ نظر پڑ گئی۔ انھیں اس کا وجود لرزتا محسوس ہوا۔
اس کی نقابیں بھیگی ہوئی لگیں۔ غالباً وہ رو رہی تھی۔ مگر کیوں؟ وہ نہ جان سکے۔
باروم میں ہلچل سی ہو گئی تھی۔ پہلے مقدمے کے وکلاء گاؤں اتارتے ہوئے بولتے
ہوئے داخل ہو رہے تھے ان کے موکل بھی ان کے پیچھے گھسٹ رہے تھے۔
وہ فائلیں سمیٹنے لگے۔ ان کا نمبر تھا اب۔



ساعت کے دوران لڑکی نے آنکھیں نقاب سے آزاد کر لی تھیں باقی چہرے پر نقاب
موجود تھی۔

تیسری پیشی پر وہ پہلی مرتبہ باروم میں ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھی۔
”وکیل صاحب! اگر ہم مقدمہ ہار گئے تو میں فنا ہو جاؤں گی، مجھے اپنی ماں کے
ماحول سے نفرت ہے۔ مجھے قطعی احساس تحفظ نہیں ہے۔ خدا را۔ یہ شخص۔ مجھے اس سے بہت
خوف آتا ہے۔“ وہ رو دی۔

”دیکھیں محترمہ۔ میں سخت محنت کر رہا ہوں۔ اگر ہم حق پر ہیں تو خدا ہماری ضرورت مدد
کرے گا۔ انشاء اللہ۔“
عبدالصمد نے تسلی دی۔



روز گاڑی صاف ہو رہی تھی روز ماں جان لڑکیاں ”چھاننے“ نکل رہی تھیں۔
خاندان اور ہم پلہ لوگوں میں۔

جھٹ پنا سا تھا۔ کل رات وہ صدمیاں سے پھر ابھی تھیں ابھی تک اس کا اثر
موڈ پر تھا۔

کچن پر نگاہ ڈالنے چلی تھیں کہ ٹھٹھک کر رہ گئیں صدمیاں کسی برقع پوش کے ہمراہ

داخل ہو رہے تھے۔

”اے یہ کون ہے؟“ وہ دل ہی دل میں حیران ہوئیں۔ تابندہ بھی گھر آئی ہوئی تھی۔
صدمیاں ماں کو دیکھ کر لمحہ بھر کو ٹھٹھکے اور ایک ہاتھ سے برقع پوش خاتون کا
نقاب الٹ دیا۔

”یہ میری اماں جان ہیں۔ سلام کرو۔“

”آداب!“ وہ لکھنوی انداز میں بولی۔

”کیا تماشا ہے صدمیاں کون ہے یہ.....؟“

”میری منکوحہ..... اماں جان.....“

ماں کو غش آ گیا..... خدا کس قدر دلیر تھا۔

ان کے شیشے کے تخت پر دراز پڑ گئی۔

”میرا تم سے مذاق کا کوئی رشتہ نہیں ہے..... سمجھے.....؟“

”یہ مذاق نہیں ہے.....“ وہ وقار سے بولے۔

تابندہ ورخندہ بھی آکھڑی ہوئیں۔

”آپ خود ہی تو فرماتی ہیں کہ ہر کام کا وقت ہوتا ہے آپ تو وقت نکالے دے رہی

تھیں۔ حسب نسب کے چکروں میں۔ میں نے آپ کا کام آسان کر دیا ہے۔“

”ہاں۔ بہت ہی آسان۔ ہائے میری قسمت۔“

وہ سر پر دو ہتھ مار کر بولیں بلکہ چیخیں۔ بنا سازش تخت الٹ دیا تھا۔ وہ بھی وارث نے

ابامیاں نے احساس شکست خوردگی سے چور چور بیگم کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ گویا تسلی دی۔

”آپ پوچھیں گی اس کا حسب نسب کیا ہے تو سن لیجیے کہ اس کا حسب نسب

”کسب“ ہے۔“

”کیا.....؟“ ان کی آنکھیں پھٹیں۔ کیا کہہ رہا ہے۔ کسی؟“

”کسب کہہ رہا ہے بیگم۔“ ابامیاں کی جان بھی پانی پانی ہو گئی۔



مجھے جیت لو

دن رات کی طعنے بازی سے جی تو یہ چاہتا تھا کہ خود بھی مری جاؤں اور بچوں کو بھی۔ تمہارے باپ الگ چپ رہنے لگے تھے۔ وہ تو خدا نے بہت کرم کیا کہ دولڑکوں سے نواز دیا۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ پھول ہی بھاگوں تھی۔ دو بھائی لائی تھی ساتھ۔ خالہ کے گھر گئی تو وہاں پہلے کیا کی تھی۔ پاؤں تلے کی مٹی بھی سونا بننے لگی۔“ امی جان سنا تیں سب بڑے رشک سے سنا کرتے تھے۔

خدا معلوم اس کو اپنے حسین ہونے کا احساس تھا یا خوش قسمت ہونے کا۔ بچپن ہی سے لوگوں نے اس کی ناک کو خنوت سے سکڑے دیکھا۔ خالہ کبھی اسے بہن کے ہاں لاتیں تو وہ تمام وقت ان کے ساتھ ہی چپکی رہتی۔ مجال ہے کہ جو بچوں کے ساتھ کھیل میں شامل ہو جاتی۔ امی جان وغیرہ بھی خوش حال لوگ تھے مگر امی بچوں میں بری طرح مصروف رہا کرتی تھیں۔ ایک روز جب وہ سات سال کی تھی تو خالہ کے ہمراہ اپنی سگی پھوپھی کے ہاں آئی اور حسب عادت خالہ کے پہلو سے لگی بیٹھی رہی۔ پھوپھی نے بہت کہا کہ باہر لان میں جا کر کھیل لو بہن بھائیوں کے ساتھ، مگر وہ ہونٹ لٹکائے اسی طرح بیٹھی رہی۔ جب پھوپھی نے دوسری بار کہا تو خالہ کے کان میں منمنائی۔

”ممی! میں نہیں کھیلوں گی۔ ان کے بچے کتنے گندے ہیں۔ دیکھیں بغیر شوز کے کرکٹ کھیل رہے ہیں۔“

پھوپھی نے اس کی بڑبڑاہٹ سن لی۔ وہ تو ”اُن کے“ سن کر ہی تپ گئی تھیں۔

”ارے بیٹا! یہ اُن کے کیا ہوتا ہے؟ شامینہ! پال رہی ہو، اسے رشتے بھی بتاؤ۔ اُن دن نہیں ہوں، پھوپھی ہوں، سگی پھوپھی اور ہاں بچے گندے کیوں نہ لگیں گے۔ تمہاری ماں عطر، لوبان، بلکہ کستوری میں نہلاتی ہے تمہیں۔ نوکر پھونکیں مار مار کر گرداڑاتے رہتے ہیں۔“

پھوپھی طبعاً حساس تھیں۔ دوسرے بھادج کی دولت مند بہن کے سامنے اپنی کم مائیگی کا احساس بھی تھا۔ چپ نہ رہ سکیں، سنا ہی گئیں۔

”ارے بابا! آپ تو بچی کی بات کا برا مان گئیں۔ رشتے سمجھانے کے لیے ہی تو آپ لوگوں سے ملاتی رہتی ہوں۔ آپ تو بچی کی بات کا بہت ہی برا مان گئیں، چلیں معاف کر دیں۔“

پھوپھی تو مزید سنانے کا ارادہ رکھتی تھیں مگر شاہینہ کے معذرتی انداز پر ہنسنی پڑ گئیں۔

”خیر بڑا تو نہیں مانا میں نے۔ میرا مقصد تو یہ تھا کہ لڑکی ذات ہے، پرانے گھر جانا ہے۔ خود سری اور ضد اچھی نہیں ہوتی۔ آج بچی ہے خیر سے کل بڑی بھی ہوگی۔“

اتنی بد دماغ، اتنی خود سر، اس قدر منہ پھٹ لڑکی اس خاندان کی پچھلی سات پشتوں میں نہیں ہوئی تھی نہ اگلی سات پشتوں میں ہونے کا امکان تھا۔

اور اس کے ساتھ نہ ہی اس جیسا حسن خاندان و خاندان سے باہر نظر آتا تھا۔ عجب خود نگر اور خود پسند لڑکی تھی جس کی نہ کوئی سہیلی تھی نہ ہم جولی۔ اس عظیم الشان گھر کی اکیلی ”جیو“ پاپا تو شادی سے پہلے سے ہی دیار غیر میں رزق تلاشتے تھے۔

امی اس لاڈلی کے نخرے سمینا کرتیں۔

درحقیقت نہ یہ اس کی امی تھیں نہ پاپا اس کے والد، دونوں اس کے سگے خالہ خالو تھے اور وہ اس خبر سے باخبر تھی۔ خالہ کو خدا نے ہیروں سونے میں ڈھانپ دیا تھا مگر اولاد جیسے جوہر سے ان کا خزانہ خالی رہا تھا۔ ان کی چھوٹی بہن کے ہاں جب چوتھی بیٹی ہوئی اور ماں چوتھی بیٹی کی پیدائش پر حسب روایت ملول ہوئی تو بڑی بہن نے اپنے بازو وا کر دیے کہ تم تو ناشکری ہو، مجھے خدا سات دے تو میں چوم چوم مروں۔

اور وہ سب کی رضا مندی سے خالہ کے گھر آ گئی۔ خالہ نے جوہری سے بڑھ کر اس کی قدر کی۔ ایک تو صورت ایسی کہ برتن ادا بھی شہد لگے۔ اس کا حسین مکھڑا چومتے چومتے دل نہ بھرے۔ خالہ خود بھی سب بہنوں میں بے حد حسین تھیں۔ خالو بھی نہایت وجہہ و ہر وقار تھے۔ اس نے ہوش سنبھالنے پر نخرے اٹھانے والے حسین چہرے دیکھے۔ عظیم الشان محل جیسا گھر، دنیا کی ہر نعمت اپنے ارد گرد کھمری دیکھی۔ اس کے ایسے ٹھاٹھ دیکھ کر اس کی بہنیں سوچا کرتیں کاش ہم چوتھے نمبر پر آئے ہوتے۔

ان کی یہ بات سن کر ماں کہتیں۔ ”ارے میں نے اسے پھینکا تو نہیں تھا، نفرت تو نہیں ہے مجھے اس سے۔ وہ تو تمہاری دادی اور پھوپھی نے مجھے طعنے دے دے کر میرا کلیجہ چھلنی کر دیا تھا۔ میں نے سوچا خدا معلوم اس بچی کو اس کے حصے کی مامتا دے بھی سکوں گی یا نہیں کہ

بہن ہے۔ لڑکیاں حیران ہوئی تھیں کہ وہ ان کی حقیقی بہن ہے تو ان سے اتنا الگ کیوں رہتی ہے۔ ان کی گاڑیاں الگ الگ کیوں ہیں اور مختلف سستوں میں کیوں جاتی ہیں؟ بہر حال انھوں نے وضاحت کر دی تھی۔ ویسے وہ بھی اپنی بہنوں ساڑھ، جمیرا، ماہرہ میں جھلک ضرور مارتی تھی مگر ان سے ہر انداز میں مختلف اور الگ تھلگ۔ سردیوں میں جب وہ کالج کے احاطے میں بیٹھی کسی کتاب میں گم ہوتی اور اس کی ناک میں پڑی ہیرے کی لونگ سورج کی تیز روشنی میں منعکس ہوتی تو وہاں بیٹھی لڑکیاں مبہوت ہو کر اسے دکھا کرتیں۔

قدم قدم پر خود کو اہم دیکھ کر اس میں حد سے زیادہ سرد مہری اور بے نیازی آتی گئی۔ اسے خود اندازہ تھا کہ وہ کیا ہے۔ اس نے شاپنگ سینٹر میں جا کر جانا تھا کہ لوگ کس طرح آگے بچھ بچھ کر چیزیں دکھاتے ہیں۔ لوگوں کا مزہ کر دیکھنا اس کو خوب احساس دلانا تھا۔ اس کے باوجود وہ خود کو بے حد سادہ رکھتی تھی۔ سرو قامت ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے بال بھی بے حد دلکش تھے۔ لائے، گھنے اور چمک دار۔ خدانے بڑی فرصت سے بنایا تھا۔ رشتے تو اس کے اس وقت سے آنے شروع ہو گئے تھے جب وہ پالنے میں تھی۔ اب خاندان میں سے تو خیر کسی نے بھی ہمت نہیں کی تھی البتہ غیر بہت آتے تھے۔

ساڑھ کے فائل کرتے ہی شادی کی تاریخ ٹھہر گئی۔ خالہ ہونے کے ناتے شاہینہ کو تو اہمیت سے جانا تھا۔ انھوں نے اسے وقت کی نزاکت اور اہمیت سمجھاتے ہوئے آخر کار رام کر لیا تھا۔ یہ پہلی شادی تھی جس میں وہ اہتمام سے شریک ہو رہی تھی۔ آخر اس کی حقیقی بہن کی شادی تھی۔ شاہینہ نے اس کے بے حد حسین ملبوسات تیار کرائے تھے۔

جب وہ شاہینہ کے ہمراہ پورچ میں اتری تو سب نے خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا۔ وہ بھی رواداری سے مسکرائی۔ بچپن کی طرح اسی طرح شاہینہ کے ساتھ چمکی ہوئی تھی۔ لڑکیوں نے ڈھولک گیت گائے وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

پھوپھی جان کی شانہ نے اسے بھی دعوت دی کہ وہ بھی گائے، مگر اس نے انکار کر دیا۔ تب شانہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ ارے پھول آؤ ناں۔

پھول نے ایک دم ہاتھ کھینچ لیا۔

”ارے بھئی کیا بد تمیزی ہے؟ آپ تو بالکل آؤٹ آف میمز ہیں۔“

پھول کے ساتھ کب کسی نے بے تکلفی کی تھی۔ اس نے شانہ کو بڑی طرح جھاڑ دیا۔

”بیٹے یہ آپ کی پھوپھی اماں ہیں۔ پھوپھی اماں کہا کریں آپ۔“ انھوں نے پھول کا رخسار چوم کر تلقین کی جو بڑی بیزار بیزاری بیٹھی تھی۔ پھوپھی نے چائے پیش کی تو وہ پھوپھی کے بجائے ماں کی بغل میں گھس کر بولی۔

”میں چائے نہیں پیوں گی۔“

شاہینہ خفیف سی ہو کر بولیں۔

”یہ چائے نہیں پیتی آپ۔ صبح ناشتے میں بمشکل دووہ پلاتی ہوں۔“

”اے بیٹا! اللہ نے بڑا زورپ دیا ہے ماشاء اللہ۔ آج پی لوگی تو میلی نہیں ہوگی۔“

پھوپھی بڑی سادہ سی خاتون تھیں۔ ہر بات اپنی ذات تک لے جاتی تھیں۔ ان کو اس انکار میں بھی اپنی ہنک محسوس ہوئی۔ حالانکہ شاہینہ چائے بھی پی رہی تھیں، اسٹیکس وغیرہ بھی لے رہی تھیں مگر پھوپھی ہر بات میں پھول کو گھسیٹ رہی تھیں۔

گھر آتے ہی پھول نے اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ اس گندے بچوں والے گھر میں نہیں جائے گی۔ وہ تو خیر پھوپھی کا گھر تھا وہ حقیقی ماں کے گھر جاتی تو بھی شاہینہ کے پہلو سے لگی بیٹھی رہتی۔ بچپن ہی سے اس نے کہیں آنے جانے میں سرگرمی نہیں دکھائی تھی۔ رشتے داروں کے ہاں جانے سے تو بہت ہی کتراتے تھی۔ البتہ تقریبی مقامات پر شاہینہ کے ساتھ بہت شوق سے جاتی تھی، ان کا ہاتھ تھام کر دور دور ہو آتی۔ خوشی سے ہنسی کھلکھلاتی۔ سمندری مقامات پر شاہینہ کے ساتھ پانی سے کھیلتی۔ بس لوگوں کے گھر جانے سے ہمیشہ کتراتے۔ لوگوں کا جی چاہتا وہ ان کے ہاں آئے اور تقریبات میں شریک ہو مگر وہ شاہینہ سے لپٹ کر منہ بسور کر کہہ دیتی۔

”ممی! میرا دل نہیں چاہتا۔“ وہ اس انداز سے کہتی کہ وہ بے بس سی ہو جاتیں۔

اس کا منہ چوم کر کہتیں ”بیٹے ملنا جلنا بھی چاہیے نا؟“

”آپ تو مل لیتی ہیں۔“ وہ ان کے زانو پر سر رکھ کر خرخرے سے کہتی۔

”مگر لوگ تمہیں بھی تو بلاتے ہیں۔“

وہ کوئی جواب نہ دیتی۔ اسی طرح ہونٹ لٹکائے ہاتھ میں پکڑی چیز نوچتی رہتی۔

وہ اور اس کی حقیقی بہنیں ایک ہی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ اب کالج میں بھی آگے

پیچھے کلاسز میں تھیں، شہر کا بہترین کالج تھا۔ اعلیٰ گھرانوں کی لڑکیاں وہاں آتی تھیں، مگر کالج میں

بھی وہ بے حد نمایاں نظر آتی تھی۔ اس کی تینوں بہنوں نے سہیلیوں کو بتایا تھا کہ وہ ان کی حقیقی

سوچ کر مسکرا دیا۔

ندیم امینہ بیگم کے جیٹھ کا لڑکا اور فواد ان کی نند کا لڑکا تھا۔

دوسرے دن ندیم کھڑکی میں کھڑا تھا، غالباً نہا کر آیا تھا تو لیے سے سر رگڑ رہا تھا۔ اس نے امینہ بیگم کو اس کمرے کی سمت ٹرے اٹھائے دیکھا جس میں پھول کا قیام تھا۔ وہ تو لیے کو صوفے پر ڈال کر تیزی سے نیچے آیا۔

”چچی جان یہ کیا ہے؟“ اس نے ٹرے کی سمت اشارہ کیا۔

”بیٹا یہ پھول کا ناشتا ہے دیر سے اٹھتی ہے ناں، وہ سب تو کر چکے ہیں۔“

”غضب خدا کا چچی جان آپ بزرگ ہو کر یہ کام کر رہی ہیں، لائیے مجھے دیکھنے میں لے جاتا ہوں۔“

اس سے بیش تر وہ کچھ بولتیں اس نے ٹرے ہاتھ سے لے لی۔

دروازے کی دستک پر اس نے تھوڑے وقفے کے بعد دروازہ کھول دیا، سامنے ندیم کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

”فرمائیے!“ اس نے رکھائی سے کہا۔

”شہزادی عالیہ کا ناشتا ہے۔ چچی جان لے کر آ رہی تھیں مجھے اچھا محسوس نہیں ہوا کہ وہ بزرگ ہو کر، اگرچہ بڑا تو میں بھی ہوں مگر بزرگ تو بہر حال پھر بھی نہیں ہوں۔“

وہ جتانے کے انداز میں مسکرایا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ٹرے لے کر سرد انداز میں دروازہ بند کر دیا۔ لمحہ بھر کو وہ وہیں کھڑا رہا، پھر واپس پلٹ گیا۔

ہزار کہنے پر بھی وہ مہندی میں جانے کے لیے تیار نہیں ہوئی، اگرچہ شاہینہ بھی آگئی تھیں اور انھوں نے بھی اس سے کہا تب اس نے بے زاری سے کہا۔

”مئی! اس قدر ہنگاموں میں میرے سر میں درد ہو جاتا ہے، بس کہہ جو دیا نہیں جاؤں گی۔“

فرل لگی چھوٹی چھوٹی آستینوں والی قمیص اور ہم رنگ چست پانچامے میں وہ نظروں میں کھٹی جا رہی تھی۔ وہ شاہینہ کے گلے میں انہیں ڈال کر کوئی بات کہے اور شاہینہ نہ مانیں تو یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ ہمیشہ کی طرح ماتھا چوم کر بولیں۔

”اچھی بات میری جان نہ جاؤ، آرام کرو۔“

شانہ تو خفیف سی ہو کر رہ گئی۔

سب ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔ پھول اسی طرح بیٹھی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

رات کو شاہینہ جانے لگیں تو وہ بچوں کی طرح بسور کر ہمارا چلنے کو کہنے لگی تب شاہینہ نے سمجھایا کہ سب لوگ مجھے بڑا بھلا کہیں گے کہ نہ خود رک رہی ہوں اور نہ بیٹی کو بھڑا رہی ہوں۔ تم رک جاؤ میں صبح پھر آ جاؤں گی، گھر پر جو کوئی نہیں ہے ورنہ میں بھی رک جاتی۔ ویسے بھی آج بچپن تاریخ ہے ہو سکتا ہے، پایا آ جائیں تمہارے۔“

انھوں نے اسے دوسروں سے چھپ کر سمجھایا کیونکہ سب بچپن سے یہی کہتے تھے کہ شاہینہ ڈانٹ ڈپٹ بھی کرنا چاہیے۔ بچے سر پر چڑھ جاتے ہیں مگر شاہینہ آج تک نہ ڈانٹ پائی تھیں۔ ان کی بہن یعنی پھول کی ”جنم ماتا“ امینہ بھی بہن کو سمجھاتی تھیں کہ بچوں کو سونے کا نوالہ کھلانا چاہیے مگر ساتھ نگاہ شیر کی رکھنا چاہیے مگر شاہینہ پر کسی کے کہنے کا اثر نہ تھا۔

وہ شاہینہ کو رخصت کر کے پورچ سے واپس آ رہی تھی تب ہی سامنے سے دو نوجوان آتے دکھائی دیے۔ وہ اپنی سمت آتا دیکھ کر ایک طرف ہو کر چلنے لگی۔

”بات سنیں، محترمہ!“ ان میں سے ایک بولا۔

وہ بولی نہیں بلکہ ناک سکون کران کی طرف دیکھنے لگی۔

”آپ غالباً پھول ہیں۔ شاہینہ آنٹی کے گلشن کا؟“ دوسرے نے ٹکڑا لگایا۔

”کیا بدتمیزی ہے!“ (یہاں تو کسی کو بھی بات کرنے کی تمیز نہیں) پھول کا خون

کھول گیا۔

”یہ بدتمیزی نہیں بکرے کا مغز ہے۔ اندر کچن میں پہنچا دیجیے اور بتا دیجیے کہ فضل کہہ رہا تھا پائے نہیں ملے۔“ پھول سمجھ تو گئی کہ یہ نوکر کا لایا ہوا سودا سلف ہے مگر اسے تو یہ بات انتہائی ناگوار گزری کہ اس سے کام کرنے کو کہا جا رہا تھا، وہ بھی اس قسم کے کام کو۔ اس نے بڑی رکھائی سے کہا۔

”آپ کے بھی تو ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ خود دے آئیے۔“ وہ یہ کہہ کر بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔

”جیسا تھا ویسا ہی پایا؟“ ندیم نے فواد کو آنکھ ماری تو فواد نے جوابا کہا۔

”کچھ زیادہ ہی میرے یار۔“ ندیم نے اسے دور جاتے ہوئے دیکھا۔ جانے کیا

بدماغ کہیں، میں ان لوگوں میں کس ہو کر نہیں بیٹھ سکتی۔ اتنے دن سے جو وہ سرگوشیاں سن رہی تھی۔ اس کی بھڑاس اس نے بہن کے سامنے اس طرح نکالی تھی۔

سارہ جیسی سادہ لڑکی کے پاس اس کی ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کچھ نفسیاتی طور پر بھی وہ خود کو اس سے کمتر محسوس کرتی تھی۔

اس کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیر کر بولی۔

”اب کیسا بھی سہی خاندان تو ہونا ناں۔ رہنا تو انہی لوگوں کے درمیان ہے۔“

”میں تو نہیں رہوں گی آپ کی وجہ سے مجبوراً مجھے یہاں آنا پڑا ہے۔“ اس نے

احسان بتایا، اسی دم ندیم اندر آ گیا۔

”ارے ندیم بھائی! آپ نہیں گئے؟“

”بے فکر رہو اور بہت لوگ گئے ہیں، تمہارے ہاں، مایوس نہیں ہوں گے وہ لوگ

ایک میرے نہ جانے سے کیا فرق پڑے گا؟“ وہ شرارت سے مسکرا دیا۔ سارہ جھینپ گئی۔

وہ اسی طرح نیم دراز تھی۔

”اور بھی کئی لوگ نہیں گئے۔“ وہ نکلیوں سے پھول کو دیکھ کر مسکرایا۔

سارہ بھی مسکرا دی۔

”ایک تو کراچی کا موسم بھی خوب ہے۔ لوگ کہتے ہیں یہاں صحت ٹھیک نہیں رہتی

حالانکہ صحت تو یہاں بھی اچھی خاصی ہوتی ہے، ہاں بعض انسانوں کے چہرے پر سمٹ آتی ہے

ساری کی ساری۔“ وہ کھلے ہوئے کوٹ کے پٹ پیچھے کر کے پینٹ کی جیسوں میں ہاتھ ڈال کر

کھڑا ہو گیا۔ ”کیوں مس؟“ وہ پھول کی طرف متوجہ تھا۔

”دیکھیے مسٹر! آپ جو کوئی بھی ہیں زیادہ فری ہونے کی کوشش نہ کیجیے۔ میں کل سے

برداشت کر رہی ہوں۔ جہالت تو آپ کی پور پور سے چھلکتی ہے۔“ وہ ایک دم غضب ناک ہو گئی۔

”ارے نہیں پھول! ایسے نہیں کہتے ہیں اور ندیم بھائی جاہل کیوں ہونے لگے سول

انجینئر ہیں۔“ سارہ کو پھول کا اس طرح لتاڑنا بہت ناگوار گزارا مگر وہ پھر بھی تحمل سے گویا ہوئی تھی۔

”چھوڑیں اپنا! ایسے ایسے سول انجینئر تو پاکستان میں بکھرے پڑے ہیں۔ روزگار تو

ملتا نہیں، ہونہ۔“ اس نے مغرور انداز میں ناک سکڑی۔

”لیکن محترمہ! یہ سن کر آپ کو بہت افسوس ہوگا کہ میں بین الاقوامی کنسرکشن کمپنی

سب لوگ چلے گئے تھے نوجے تک امینہ ان کی ایک دو مندریں بس گھر میں تھیں اور دلہن، وہ کمرے میں لیٹی میگزین پڑھتی رہی پھر ہاتھ روم میں گھس گئی۔ نہا دھو کر ڈارک بلیو شلوار سوٹ میں ملبوس باہر نکلی، بال سلجھائے، تھوڑا سا فیس پاؤڈر لگایا، ہلکی پنک لپ اسٹک ہونٹوں پر لگائی اور دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر باہر آ گئی۔ امینہ غالباً کچن میں تھیں۔ گھر میں متوقع خاموشی طاری تھی وہ دلہن کے کمرے میں چلی آئی۔

سارہ آنکھوں پر بازو رکھے شاید سو رہی تھی۔

”سو رہی ہیں اپنا؟“ اس نے عام سے انداز میں پوچھا۔

سارہ نے چونک کر بازو ہٹایا، اسے سامنے دیکھ کر ایک دم بیٹھ گئی۔ ”ارے پھول! تم

نہیں گئیں؟“

”نہیں اپنا! میرے تو سر میں درد ہو رہا ہے، ان ہنگاموں میں، سچ بے حد احمقانہ

رسمیں لگتی ہیں مجھے تو یہ۔ بس خاموشی سے نکاح ہو جائے۔ دلہا کے ماں باپ اور بہن بھائی دلہن

کے ماں باپ اور بہن بھائی اور بس۔“ وہ سارہ کے بستر پر لیٹ گئی۔

”ارے نہیں پھول! مشرق میں انہی، گیدرنگز، سے تو فطری خوشی کا اظہار جھلکتا

ہے۔ کون سا لوگ روز روز ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں۔“

اس نے پھول کو پیار سے دیکھا۔

”چھوڑیں اپنا! ایسا بھی کیا ضروری ہے خوشی کا اظہار؟“ وہ لاپرواہی سے بولی۔

سارہ چپ ہو گئی۔

”ایک تو اپنا یہ ہمارے ریلیئوز (رشتے دار) بالکل بھی سویلائزڈ نہیں۔ کوئی مقاصد

نہیں زندگی گزارنے کے اور کچھ نہیں تو لوگ اپنی شان بڑھانے کے لیے ہی جدوجہد کریں۔“

”غالباً تم خود کو ’رائل فیملی‘ میں دیکھنا چاہتی تھی۔“ سارہ بھی تھوڑی تکیھی ہو گئی۔

”ارے نہیں اپنا! پاکستان میں بھی بعض فیملیز بہت ویل میزڈ اور سویلائزڈ ہیں۔

جن کے ہاں کی عورتیں دال گوشت، پان چھالیہ تک محدود نہیں، جن کے بچے انٹرنیشنل لیول پر

دنیا کے دوسرے لوگوں کے دوش بدوش کھڑے ہونے کے قابل ہیں، جن کے آئیڈیل میرا

مطلب ہے اباؤٹ لائف بہت نومٹی اونچے ہیں۔ جب ہی تو مجھے ان لوگوں سے بہت کوفت

ہوتی ہے۔ ہمارا خاندان تو ابھی تک محمد بن قاسم کے زمانے کا ہے۔ سچ یہ لوگ مجھے مغرور کہیں،

رکھ چھوڑا ہے۔ نواب ہوں کہ بادشاہ زادے، سسرال تو سسرال ہوتی ہے۔ دو کوڑی کا کر کے رکھ چھوڑا ہے۔“

”کوڑی کی ہے یا لاکھوں کی۔ ہے تو میری۔ خدا نے شہزادیوں جیسی صورت دی ہے، انشاء اللہ شہزادی کی طرح زندگی گزارے گی۔ یہ تو پہلے ہی نہیں آرہی تھی۔ میری ہی شامت نے دکھا دیا تھا۔“ شاہینہ اسے ساتھ لگائے لگائے باہر نکل گئیں۔

پھر کافی سمجھانے بھجانے پر وہ ٹھہرنے پر آمادہ ہوئی، وہ بھی شاہینہ کی ہزار منتوں پر۔ شادی کے بعد وہ گھر آگئی تھی اور بے حد ہر سکون تھی۔ اسے اس منہ زور نوجوان کے ہاتھوں اپنی توہین کا شدت سے احساس تھا مگر جلنے بجھنے کی وہ عادی نہیں تھی۔ سو فراموش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسی دوران اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ شاہینہ فجر کی نماز کے لیے اٹھی تھیں کہ ان پر فاج کا زبردست حملہ ہوا۔ شاہینہ کے شوہر کو فوراً اطلاع دی گئی مگر ان کے آنے تک وہ چٹ پٹ ہو گئی تھیں۔ عمر بھر کا پہلا مگر پھر پور صد مہ..... پھول کو تو گویا سکتہ ہو گیا۔

ایسی جان چھڑکنے والی سوسوناز اٹھانے والی ماں۔ خالہ کا تو کبھی اس کے ذہن میں تصور بھی نہ آیا تھا بلکہ وہ تو سگی ماں کو خالہ کہنے لگی تھی۔ پورے خاندان میں کس بچے کو شاہینہ جیسی ماں نصیب ہوئی تھی؟ جنازہ اٹھنے پر وہ بے ہوش ہوئی تھی پھر تو اس پر بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ پاپا اس کی پٹی سے نکلے تھے۔ امینہ سرتاپا اس کی خدمت میں غرق تھیں۔ اس کی حالت کے پیش نظر امینہ بمشکل اسے اپنے گھر لے آئی تھیں۔ سب اس کی دیکھ بھال میں لگے ہوئے تھے۔ جب مئی کہہ کر روٹی تو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔

وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی خالی خالی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ اسی دم ندیم کار کی چابیاں گھماتا تیزی سے برآمدے کی سمت بڑھا تھا۔ سیاہ ہاتھ گاؤن میں ملبوس گیلے بال لیے ہونٹ چپاتی وہ اس کے دل میں اتر گئی۔ پھول کی نظر جیسے ہی ندیم پر پڑی وہ اٹھ کر اندر بھاگ گئی۔ حمیرا کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ رونے کے تو آج کل بھانے ڈھونڈ رہی تھی۔

”بجو! اس چپ مین کو کہیں میرے سامنے نہ آیا کرے۔“

حمیرا تو پہلے ہی اس کے اس طرح رونے سے حیران پریشان تھی، یہ سن کر اور ہونٹ

سے وابستہ ہوں اور اتنا کماتا ہوں کہ آپ جیسی بد دماغ لڑکیوں کو۔“ وہ ایک بہت نازیبا بات کہتے کہتے رک گیا۔ سارہ نے بہت مت سے ندیم کو دیکھا تھا اور خوشامد کے انداز میں پھول کے ہاتھ بھی سہلائے تھے۔

پھول کو اتنی بات آج تک کس نے کہی تھی؟ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سارہ کی جان علیحدہ عذاب میں پھنس گئی تھی۔ ندیم فوراً باہر نکل گیا تھا۔ ”اللہ، پھول، گڑیا مت رو۔ سب لوگ کیا کہیں گے؟“ وہ پریشان ہو رہی تھی۔

”اپنا کیا نام ہے اس فوٹش کا۔ میں اسے شوٹ کر دوں گی۔ میں اسے.....“

”ارے نہیں گزریا! ایسے نہیں کہتے، وہ ایسے ہی مذاق کر رہے تھے، ان کی تو عادت ہے۔“

”گوٹو ہیل ہیز پیٹ (جنہم میں جائے اس کی عادت)“ وہ روتے روتے پھر کر بولی۔

”میں اسے مار ڈالوں گی۔“ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ”بائی گاڈ! آئی ول کل ہم۔“

(خدا کی قسم میں اسے ضرور مار ڈالوں گی)“

سارہ نے بمشکل اسے چپ کرایا۔ وقتی طور پر وہ خاموش ہو گئی مگر شاہینہ کو دیکھ کر پھر شروع ہو گئی۔

شاہینہ کے گلے لگ کر سسک پڑی۔

”ممی! میں ابھی گھر جاؤں گی۔“

”کیا ہو گیا زندگی؟“ وہ بری طرح پریشان ہو گئیں۔

”ممی! وہ سارہ اپنا کافوٹش کزن ہے اس نے مجھے بڑا بھلا کہا ہے۔ ہی از چپ مین۔ ہی از کری ایچر۔“ (وہ گھٹیا آدمی ہے۔ وہ حیوان ہے)۔ اس نے اس طرح ٹپ ٹپ کر کہا کہ شاہینہ کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

”ارے غضب خدا کا کس نے کہہ دیا، کیا کہہ دیا؟“

تب سارہ نے ٹوڈی پوائنٹ بات بتا دی۔

شاہینہ بڑا مان کر بولیں۔ ”بھی جب میری بیٹی کسی کے ساتھ مذاق نہیں کرتی تو کوئی اس کے ساتھ مذاق کیوں کرے؟ اسے عادت نہیں ہے اس قسم کی باتیں سننے کی۔“

امینہ بیگم کو بہن کی حمایت پر تھوڑا تاؤ آ گیا۔

”اے شاہینہ آپا! بہت ہو گئی ہے۔ پرانے گھر جانا ہے اس کو۔ اپنے ہی قابل بنا کر

ہو گئی کہ جانے اس گھر میں کون ”چپ مین“ آ گیا ہے۔ وہ بنا بات کیے اسے اپنے کمرے میں لے آئی اور اسے بیڈ پر بٹھا کر چپ مین کو دیکھنے باہر نکل آئی۔ اسکی آنکھیں ماہرہ نے دور کر دی کہ وہ ندیم بھائی کی صورت سے جڑتی ہے۔ ندیم کے متعلق پھول کے خیالات سن کر حمیرا کو ناگواری تو محسوس ہوئی مگر اس نے ظاہر نہیں کی۔

شام کو وہ اپنا بیگ اٹھا کر کھڑی ہو گئی اور ماں کے سر ہو گئی۔ ”خالہ جان! میں گھر جاؤں گی، میرا یہاں دل نہیں لگتا۔“ امینہ نے بہت سمجھانا چاہا مگر وہ مان کر نہیں دی۔

”بس میں گھر جاؤں گی۔ میرے بابا اکیلے ہیں۔ میں یہاں بور ہوتی ہوں۔“

تب امینہ نے ڈرائیور کے ہاتھ اسے بھجوا دیا۔

گھر آ کر اس پر طمانیت سی چھا گئی۔ اگرچہ شاہینہ کو یاد کر کے راتوں کو روتی تھی کہ تکیہ بھیک جاتا تھا۔ غم کیسا ہی ہو اس کی لَو آہستہ آہستہ مدہم پڑ ہی جاتی ہے۔

پاپا کو اب اس کی فکر رہنے لگی کہ وہ تنہا کیسے رہے گی؟ تین ماہ کے لیے تو وہ اس کے پاس تھے مگر اس کے بعد؟ انھوں نے پھول کو سمجھایا کہ وہ امینہ کے پاس چلی جائے۔

”کیوں میں کیوں جاؤں؟ آپ ان لوگوں سے کہیے کہ وہ خود یہاں آ جائیں۔“ وہ ٹھنک کر بولی۔

”بیٹا تم تو اکیلی ہو۔ وہ لوگ کس طرح آ سکتے ہیں۔ پھر میں اس قسم کی بات ان سے کیسے کہہ سکتا ہوں؟“

”پاپا! میں نے کہہ دیا میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

پھر انھیں پھول کو تنہا چھوڑ کر ہی جانا پڑا۔ امینہ وغیرہ سے کہہ گئے تھے کہ گھر کا خیال رکھیں۔ اب اتنا پھیلا ہوا بزنس ایک دم بند کر کے بیٹھنے سے تورہے تھے۔

اس نے خود کو بے حد مصروف کر لیا تھا۔ گل رعنا جا کر فلاور میکنگ کورس کرنے لگی تھی۔ کالج تو بند تھے۔ فور تھ ایئر کے ایگزام ابھی دور تھے۔

تنہائی سے تو کبھی بور نہیں ہوتی تھی۔ سارا دن پھول بناتی رہتی۔ خوبصورت گلہان خرید کر لاتی، اپنے تیار کردہ پھولوں سے انھیں آراستہ کرتی۔ گھر کی آرائش میں لگی رہتی۔

پاپا کے بیڈروم کی سینگ تبدیل کی، ان کے کمرے میں گرمیوں کے حساب سے کپڑے لگوائے، فرنیچر بدلا، کمرے کی عظیم الشان سجاوٹ دیکھ کر پھر قالین پر

بیٹھ کر رونے لگی۔

”اللہ! آج میری مٹی ہوتی، کمرے کو دیکھتیں تو مجھے کتنا پیار کرتیں۔ ایک بار جب میں نے ان کا کرتا کاڑھا تھا تو انھوں نے مجھے کتنا پیار کیا تھا۔ میری آنکھیں چوٹی تھیں، میری ہتھیلیوں کو بوسے دیے تھے۔ آہ، میری مٹی۔“

ایک صبح جب وہ سو کر اٹھی تو نوکر نے اسے خوش خبری سنائی کہ رات پاپا آ گئے تھے۔ وہ خوش بھی ہوئی اور حیران بھی کہ اتنی جلدی تو پاپا کبھی نہیں آتے تھے۔

پاپا نے کمرہ دیکھ کر اس کی بہت تعریف کی تھی، دعا دی تھی، مگر رات کو اس کی خوشی یک دم کا فور ہو گئی جب پاپا نے اسے دھماکہ خیز خبر سنائی۔

”پھول دیکھو بیٹا! تم بڑی ہو سمجھ دار ہو۔ تمہیں ایک دن اپنے اصل گھر جانا ہے اور شاید یہ دن نزدیک آ گیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے بیٹا امینہ نے مجھے خط لکھا تھا اسی لیے میں آیا ہوں۔ اگر رشتے داروں میں اچھے لڑکے مل جائیں تو یہ خوش قسمتی ہوتی ہے۔ امینہ نے جس رشتے کا ذکر کیا ہے وہ بہت اچھا ہے۔ شاہینہ بھی اس گھر آنے کی بہت تعریف کرتی تھیں۔ یہاں کراچی میں بھی میں لڑکے کو دیکھ چکا ہوں۔ گزشتہ سال وہ مجھے کینیڈا میں بھی ملا تھا۔ ملاقات رہی تھی۔ تمہاری۔ میرا مطلب ہے سارہ کی بڑی پھوپھی کا لڑکا ہے۔ اکلوتا بیٹا دو بہنیں ہیں۔ امینہ مجھے تفصیل لکھ چکی ہے۔ میں اس لیے جلدی کر رہا ہوں کہ تمہاری طرف سے بہت فکر رہتی ہے۔“

وہ واضح طور پر نہ کہہ سکے۔ امینہ نے اس کی خود سری، ضدی پن، مستقبل کے خدشات ایک ایک بات بہنوں کو لکھ دی تھی۔ یہ باتیں اگرچہ کسی نے پہلی مرتبہ انھیں بتائی تھیں مگر بہت دفعہ وہ شاہینہ کے بے جالا ڈیپار کا اندازہ کر چکے تھے۔

اسے تو خاندان کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ خدا معلوم کون سی پھوپھی تھیں اور کیسا لڑکا تھا۔ سارے زمانے میں ایک پاپا ہی سے اس کی رگ دیتی تھی۔ شاہینہ ہوتیں اسے ہر بات منوانا آسان تھی۔ اس کا دل تو چاہا کہ پاپا سے کہے مجھے اس کی صورت تو کم از کم دکھا دیجیے۔ پاپا تو اس کی خاموشی کو رضا مندی سمجھے۔ ان کے خیال میں وہ کراچی میں مقیم ہر رشتے دار سے واقف تھی۔ ”بڑی پھوپھی۔“ کا اشارہ ہی کافی تھا۔ اب انھیں کیا پتا تھا کہ اسے اتنا تو پتا ہے کہ پھوپھیاں ڈھیروں ہیں مگر یہ نہیں معلوم تھا بڑی کون ہیں، منجھلی کون ہیں، چھوٹی کون ہیں؟

پاپا نے اس رشتے کو ترجیح اس لیے دی تھی کہ ایک تو وہ اس کی سگی پھوپھی کا گھر تھا۔

سب سے بڑا مقصد تھیں اور میں نے اتنی آسانی سے۔“ وہ سوچ کر رہ گیا۔
رخصتی تو ظاہر ہے رات ڈنر کے بعد تھی۔

وہ بھی دوپہر کا کھانا کھا کر سو گئی تھی۔ چار بجے حمیرا نے اسے جگایا کہ تیاری بھی کرنا تھی۔ پانچ بجے بیوٹیشن کو آ جانا تھا۔ اس کی مرضی کے عین مطابق دوسروں سے قدرے مختلف شادی ہو رہی تھی۔

ابھی وہ چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر دلہن بننے کی تیاری کر رہی تھی کہ بیوٹیشن بھی آ گئی۔ وہ سہاگ کے پر شکوہ غرارہ سوٹ میں ملبوس ڈریسنگ روم سے باہر آئی۔ سلام و جواب کے دوران بیوٹیشن اس کا چہرہ نظروں میں جانچتی رہی۔ اس کی نظروں میں پسندیدگی کا تاثر جھلک رہا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسے بٹھا کر ماہر آرائش حسن نے اس کا چہرہ تھما۔

”بہت خوبصورت اسکن ہے آپ کی۔“

”میں میک اپ نہیں کرتی، اس لیے شاید۔“ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

بیوٹیشن اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اس نے پھول کے اصلی بالوں کا بے حد خوبصورت اسٹائل بنایا جو وہاں موجود سب لڑکیوں کو بہت پسند آیا۔ سب کی آنکھوں سے رشک جھانک رہا تھا۔ بڑی مہارت سے پھول کا میک اپ کیا۔ گلاب کی ادھ کھلی کلیوں اور موتیوں کی منہ بند کلیوں کا خوبصورت گجرا اس کے بائیں جانب انکایا تو ایسا ٹوٹ کے رُوپ آیا کہ حمیرا سے برداشت نہ ہو سکا، اس نے جھک کر پھول کا رخسار چوم لیا۔

”اے خیانت نہ کرو، بخشی نہیں جاؤ گی۔“ حمیرا کی چچا زاد بہن بولی۔ کمرے میں قہقہے گونج اٹھے۔ پھول جھینپ گئی پہلی بار۔ پھول کا یہ نخوت سے پاک اسٹائل سب کے دل میں اتر گیا۔

سرخ دیکھتے گینوں کا طلائی سیٹ پہنا کر سارہ نے آگے بڑھ کر ماتھے پر بندیا نکائی۔
بیوٹیشن نے سرخ و سنہری زرتار آئینل اس پر پھیلا دیا۔
”چشم بد دور۔“ سارہ نہال ہو گئی۔

”ان کے سپینڈ کیسے ہیں؟“ بیوٹیشن نے شیشوں اور ڈبیوں کو دھکن لگاتے ہوئے تجسس سے پوچھا۔

”بھئی خاص طور پر اس کے لیے ہی بنائے گئے ہیں۔ بہت گریس فل، چارمنگ اور

دوسرے فیملی بہت مختصر تھی۔ سوئم لڑکا لائق خوبصورت اور آگے بڑھنے کا جذبہ رکھتا تھا۔

جب تک شادی کی تاریخ نہ ٹھہر گئی اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے امینہ کو کھلوایا تھا کہ گھر میں کوئی فضول رسم نہیں ہوگی۔ آخر اس کی بات ہی مانی گئی حالانکہ لوگوں کو اس گھر سے ایسی شادی کی توقع تھی جو برسوں یاد رہتی۔

صبح گیارہ بجے اس کا نکاح ہونا تھا، شام کو ہوٹل میں ڈنر تھا۔

آتش گلابی بناری شلوار سوٹ میں نشو کا دوپٹہ سر پر پھیلائے وہ بے حد سادہ تھی۔ بال سلجھا کر ایسے ہی چھوڑ دیے تھے۔ امینہ نے شگون کے طور پر زبردستی اس کی ناک میں نتھ ڈالی۔ ایک نتھ ڈالنے سے ہی اس پر ایسا رُوپ آیا تھا کہ امینہ نے اسی وقت اس کی نظر اتاری۔ وہ آج بہت خوش تھیں کہ وہ اپنے بہنوئی سے زیادہ اس کی طرف سے فکر مند تھیں۔

اس کے حقیقی باپ ”دنیاوی“ باپ ایک دو خاندان کے دوسرے مردوں کے ہمراہ نکاح خوانی کو آئے تو وہ بڑے ضبط سے بیٹھی رہی۔

نکاح کے دوران جب اس نے سنا عارف ندیم کے ساتھ نکاح قبول ہے؟ تو اس کی ہتھیلیوں اور تلوؤں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ کک، کہیں، ند، ندیم..... اس کی آواز نہ نکل سکی۔

”بیٹی! کہو بیٹی! قبول ہے۔“ وہ سسک پڑی۔ آج اس کی کوئی سننے والا نہیں تھا۔ صبح سننے والا بھی نہیں تھا کہ اس کی ماں شاہینہ نہیں تھی جو اس کی غلط بھی مانتی تھی۔ غلط بھی سنتی تھی۔

اسی دم پاپا کی آواز ابھری ”پھول بیٹی!“ امینہ نے اس کے ہاتھ دبائے۔ انجانے واہموں سے امینہ کے ہاتھ لرزنے لگے تھے۔ انھوں نے اس کا سراپے سینے سے لگا کر آہستگی سے کہا۔

”روتے نہیں بیٹی۔“ پھر آہستہ سے اس کے کان میں بولیں۔ ”خدا کے لیے پھول۔“ جب اس نے نم آواز میں کہا ”جی۔“

تین بار اقرار کیا تھا اس نے کہ جس کی صورت دیکھنے کی رودار نہیں تھی، اسے جیون بھر کا ہمسفر مان لیا ہے۔

اعصاب تو اس کے سدا ہی سے نازک تھے۔ مچی کہہ کر فوراً بے ہوش ہو گئی تھی۔
باہر عارف ندیم نے کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔

”حیرت ہے پھول بیگم! کہیں یہ دستخط جعلی تو نہیں؟ تم میرے مقاصد زندگی میں

ویل ڈریسڈ۔“ سارہ نے خوش ہو کر تعریفوں کے پل باندھے۔

وہ کرسی سے اٹھ کر صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ اسی وقت امینہ اندر داخل ہوئیں۔

”ارے بھی لڑکیو جلدی کرو۔ اوہ، پھول تیار ہو گئی۔ ماشاء اللہ میری بیٹی کو کسی کی نظر نہ لگے۔ ذرا فضل سے کہو کالابکرا ادھر ہی لے آئے میں اس کا ہاتھ چھوا دوں۔ آؤ پھول ذرا تم دروازے تک آ جاؤ۔“ انھوں نے پھول کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چومی۔

”ماشاء اللہ“

فضل بکرا برآمدے میں لے آیا۔ امینہ اسے تھام کر دروازے تک لائیں، اس کا ہاتھ لگوا یا اور فضل سے کہا کہ ذبح کروا کر گوشت غریبوں میں تقسیم کر دے پھر لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”بھئی، اب جلدی کرو۔ مہمان تو پہنچ گئے ہوں گے۔ چلو جلدی کرو شبا بش۔ بھائی

صاحب باہر انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔

ایک گھنٹہ تو نکلتے نکلتے ہی لگ گیا۔ ایک گاڑی میں امینہ ان کے شوہر پھول کے پاپا،

سارہ اور حمیرا انھیں۔ باقی لوگ دوسری گاڑی میں تھے۔

ہوٹل کا استقبال یہ خصہ دور ہی سے جگمگ کر رہا تھا۔ سلونی شام دے پے پاؤں رخصت ہو رہی تھی۔ جب پھول کو تھام کر گاڑی سے اتارا گیا، کئی جھماکے ایک ساتھ ہوئے۔ کئی لوگ کیمرے سے فیض اٹھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ دلہن کی آمد کا شور مچ گیا۔ سارہ نے آتش شوق بھڑکانے کے لیے اس کا گھونگھٹ مزید آگے کھینچ دیا۔ ندیم اپنے دوستوں اور رشتے دار بھائیوں کے ہمراہ استقبال پر ہی تھا۔ کیمروں کی فلش نے اسے سیراب کر دیا تھا جن کے نورانی جھماکوں نے پھول کا چہرہ بے حد واضح کر دیا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار ایک انوکھی سی مسرت اپنی رگ و پے میں اترتی محسوس کی۔

”ارے دلہا میاں بھی کھڑے ہوئے ہیں، دلہن کا چہرہ چھپاؤ۔“ لڑکیوں نے شور مچایا۔

ندیم سر جھکا کر مسکرا دیا۔ پھول کی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لڑکیاں اسے مسند کی سمت لے جا رہی تھیں اور وہ چابی بھری ہوئی گڑیا کی طرح عمل کر رہی تھی۔

اسے شوپیس کی طرح ایسا تادہ کر دیا گیا۔

ڈنر کے بعد تصاویر و موزیک کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ایک صوفے پر پھول کو بٹھا کر ندیم

کے لیے منادی کی گئی جو جانے کس کو نے میں دوستوں سے منٹ رہا تھا۔ اس کے غیر ملکی دوستوں کو بھی دلہن بہت پسند آئی تھی انھوں نے ابے مبارکبادی تھی وہ انھیں ہی رخصت کر رہا تھا۔

جب وہ داخلی دروازے سے اندر داخل ہوا تو پھول سامنے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ نائے میں رہ گئی۔ گویا یہ عارف ندیم میری اتنی نفرت کے باوجود کہیں انتقاماً؟ بے شمار سوالات اس کے ذہن میں ابھرے لیکن اس کا دل بجھ گیا تھا۔ پاپا یہ آپ نے کیا کیا؟ یہی آپ کو کینیڈا میں ملا تھا؟ یہی ہے وہ خوش شکل؟ یہی ہے وہ مؤدب و مہذب؟ پاپا میں نے آپ پر، آپ کی محبتوں پر اندھا اعتماد کیا۔ پاپا آپ نے یہ کیا کیا؟ میں دنیا میں کئی لوگوں سے چڑی مگر کبھی کسی کے سائے سے پناہ نہیں مانگی جس کے سائے تک سے پناہ مانگی۔ پھول کے لیے یہ ایک بڑا دھچکے تھا۔ وہ جس کزن جس دلہا کی تعریفیں گزشتہ پندرہ دن سے سن رہی تھی۔ وہ یہ تھا؟

اس کا دل بجھ گیا۔ جس جیون ساتھی کے بارے میں وہ افتخار محسوس کر رہی تھی وہ یہ ہے؟ ندیم کو اس کے پاس بٹھا دیا گیا۔ وہ اس کا وجود محسوس کرتے ہی دوسری طرف تھوڑا سا کھسک گئی۔ اس کی یہ حرکت قطعی غیر ارادی تھی۔

”ارے سول انجینئر ضرور ہیں، سینٹ کے نہیں بنے ہوئے ہیں جو جیجی ہیں گے۔“ اس کی کزن نے سرگوشی کی جو ندیم نے بھی سن لی وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ اسی وقت کیمرہ چلا اور ایک حسین پوز ہمیشہ کے لیے مقید ہو گیا۔ رات گئے تک ہنگامہ رہا۔ رخصتی ہوئی اور وہ بہت ضبط سے گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔ سارے ہنگامے میں وہ شاہینہ کو ایک پل فراموش نہ کر سکی تھی۔ آج می ہوتیں تو اس تقریب کا چہرہ ہی بدلا ہوتا۔ اس نے دکھ سے سوچا تھا۔ گاڑی ندیم ڈرائیو کر رہا تھا۔ ساتھ میں چھوٹی بہن تھی۔ پچھلی نشست پر پھول اپنی ساس یعنی بڑی پھوپھی اور دونوں نندوں کے ہمراہ تھی۔ ندیم نے گاڑی میں بیٹھتے ہی اندرونی بیک ویو مرر کا زاویہ بدلا تو ساتھ بیٹھی بہن شوفی سے کھنکھاری تھی۔ پھوپھو ان سب باتوں سے بے نیاز ایک طرفہ گفتگو میں مصروف تھیں۔

”ارے دلہن! یہ کڑے چھوٹے تو نہیں پڑے۔ اب اتنی جلدی کیسے بننے، بننے، بننے لینے پڑے۔ مجھے تو فکر ہو رہی تھی کہ چھوٹے نہ پڑ جائیں۔ وہ سینٹ کی انگوٹھی تو ڈھیلی ہو گئی۔ دھا کہ پیٹ لینا، کبھی رگر جائے۔“

”ارے امی! اتنی سمجھ تو پھول بھابی کو بھی ہوگی۔“ آگے بیٹھی روشن نے سرگھا کر ماں سے کہا۔

میں کھوئی تھی کہ وہ ہزار منہ بھٹ، بد دماغ اور مغرور تھی مگر مشرقی لڑکی تھی۔ ایسے گھرانے کی لڑکی جہاں لڑکیاں ماؤں سے تو الجھ کر بات منوا سکتی ہیں مگر باپ کے سامنے حد ادب ان کے پاؤں کی بیڑی بن جاتی ہے اور عارف ندیم کو تو اس نے خود قبول کیا تھا جس کی تعریفوں میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے پاپا نے زمین آسمان کے قلابے ملا دیے تھے۔ یہ فیصلہ اس باپ کا تھا جس نے پھول نام رکھ کر بالکل پھولوں کی طرح رکھا تھا؟ چند گھنٹے قبل جب شکست کا احساس کر کے اس کے اعصاب چیخنے لگے تھے ایک اور خوبصورت احساس کسی کو نے سے ابھرا۔

”ندیم ایک بہادر، پر عزم مرد۔ عورت اگر مضبوط کردار کی ہو تو چیلنج کرنے اور جیتنے والے مرد سے ضرور متاثر ہوتی ہے۔ پھر سے پھر عورت بھی اس وقت کچھل جاتی ہے جب مرد اسے جیتتا ہے، اسے سر کرتا ہے، مغرور و مضبوط عورت کبھی شکست نہیں کھاتی۔ کھاتی ہے تو تسلیم نہیں کرتی لیکن صحیح معنوں میں پر عزم مرد مل جائے تو قدر کرتی ہے۔“

پھول کو اس کا جیت لینا اچھا لگا۔ وہ کسی کے اعصاب پر سوار ہے کسی نے اسے اپنانے کے جتن کیے۔ پھول کو اپنے مقام کا پتا تھا مگر آج غرور بے توڑ نشہ بن گیا تھا۔ گویا اس نے سمجھوتا کر لیا تھا لیکن اس وقت ندیم کا انداز، نہ وہ پروانہ بنا اور نہ بھسم ہوا، نہ وہ عاشق بنا اور نثار ہوا۔ یہ انداز محبت کرنے والوں کے جیتنے والوں کے تو نہیں ہوتے۔ پھول اسی طرح دراز رہی۔

وہ ننگے پاؤں قالین پر جاتا آہستہ آہستہ اس کے نزدیک چلا آیا۔ آنکھیں بند کیے وہ نڈھال تھی۔ بند آنکھوں کی پلکیں تھر تھرا رہی تھیں۔ وہ ایک لمحے کو مبہوت ہو گیا۔ اسی دم پٹ سے پھول نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ ایک دم سنبھل گیا۔ ”ارے شکر ہے زندہ ہو۔“ وہ مسکرایا ”میں تو ڈری گیا تھا کہ.....“ کیسی نفرت انگیز بات جو محبت کرنے والے سوچتے بھی نہیں۔ اتنی خوبصورت رات اور مرنے مارنے والی بات!

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، ضبط کی پرت پرت اترنے لگی۔

”میں اس لب و لہجے اور اس قسم کی باتوں کی عادی نہیں ہوں۔“ وہ زیادہ نیکی کی راہ نہ چل سکی، گزرا نہی۔ اب اس کے تصور میں عارف ندیم نہیں بلکہ ندیم تھا جس کی تلخ باتیں سن کر اسے اپنے ہار جانے کا احساس ہو رہا تھا۔

”مسٹر! زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے پاپا اتنے

”ارے ان ہنگاموں میں تو سمجھ بھی پھر جاتی ہے۔ اس۔“

”امی! گھر جا کر پہلی فرصت میں چیک کر لیجیے گا۔“ ندیم نے مسکراہٹ دبا کر ایک

موڑ کاٹا۔

وہی چہیتا ہوا لہجہ جو پھول کے تن بدن میں آگ بھردیتا تھا۔ پھوپھی کی تو سمجھ میں نہیں آئی ندیم کی بات مگر روشن نے بھائی کو گھورا۔

”بڑی بات بھائی جان۔“

مگر پھول کا ذہن گاڑی میں نہیں تھا اس کے ذہن میں الگ ہی کچھڑی پک رہی تھی۔ وہ پھوپھی کی ہدایتوں سے بیزار ہو رہی تھی۔ تو بہ پھوپھی کا نام توصیف کے بجائے ہدایت جہاں یا مشورہ ہیگم ہونا چاہیے تھا۔ پھول نے بیزار ہو کر سوچا۔ اس نے کاہے کو یہ نصیحتیں و ہدایتیں سنیں تھیں۔

گھر جا کر پھوپھی کو کچھ شگون اور یاد آ گئے۔ نازک مزاج پھول تھک کر چور چور تھی۔ ضبط کرنے کی تو اس کی عادت نہیں تھی، روشن کے کان میں بولی۔

”خدا کے لیے مجھے کہیں لٹا دو، مجھے چکر آ رہے ہیں۔“ چکر کاسن کر تو روشن حواس باختہ ہو گئی اور لمحہ ضائع کیے بغیر اسے آراستہ کمرے میں لے آئی۔

کمرہ ایئر کنڈیشنر سے ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ وسیع بیڈ پر بے دم ہو کر لیٹ گئی اور لگی زیور اتارنے۔

”ار، رے نہیں بھابی! پلیز جہاں اتنی دیر، وہاں.....“ روشن نے اس کے ہاتھ تھام لیے منت سے۔ وہ بھی نیکی کے موڈ میں تھی، نند کی بات مان گئی۔

روشن کے جاتے ہی ندیم کو بھیج دیا گیا کہ وہ دلہن کی دل جوئی کرے۔ وہ اندر آیا تو اس کا نصیب بلکہ خوش نصیبی نیکی پر سر نیکی بالکل بے دم تھی۔

اس نے صوفے پر بیٹھ کر آرام سے جوتے اتارے، ساتھ اس کا جائزہ بھی لیتا رہا۔

”میں نے کہا محترمہ! آج کی جمع شدہ توانائیاں بھی آج کے دن کام نہ آئیں۔ جو شخص کبھی ہل کر پانی نہ پئے اس کی توانائی کا ذخیرہ اس قدر تو ہوگا کہ ایک چھوٹا موٹا ایٹمی بجلی گھر چل سکے۔“ اس نے میز پر پاؤں پھیلا دیے۔

پھول کے تھکے ہوئے اعصاب پر اس کی بات ہتھوڑا بن کر گئی۔ وہ نباہ کے تصورات

”اگر میری مئی زندہ ہوتیں تو مجھ پر کبھی بڑا وقت نہیں آتا۔ آہ! میری مئی۔“

”چپ ہو جاؤ پھول! مت تماشنا بناؤ۔ با اختیار ہو۔ خدا تو نہیں ہو۔ بہت شوق سے جانا اور مت واپس آنا۔ سن لو پھول جو دلہن پہلی رات سسرال گزار کر جائے اور پھر اس کا شوہر پلٹ کر اسے لینے کبھی نہ جائے تو ٹھیکرا ہوتی ہے اس معاشرے میں۔ خواہ وہ کتنی خوبصورت کیوں نہ ہو۔ ایک حسین عورت کو اس کا شوہر لینے نہ جائے تو لوگوں کے لیے یہ بڑی آسان بات ہوتی ہے خواہ وجہ اور کوئی بھی ہو۔ سب کوئی دوسرا بھی ہو، میں ابھی تک تمہارا خیر خواہ ہوں۔ تمہیں سمجھانے کو کہ رہا ہوں۔“

”نہیں چاہیے مجھے تمہاری خیر خواہی۔ دھمکیاں دے رہے ہو مجھے؟“

”تمیز سے بات کرو۔“ ندیم نے گرج کر کہا اور فوراً باہر نکل گیا۔

”ہونہ؟“ اس نے سر جھٹکا ”سیدھا کر دیں مجھے نہ کر دیا تمہیں الٹا تو پھول نام نہیں۔“ وہ ناک پونچھتے ہوئے پھنکاری۔

صبح اس نے سناروشن پھوپھی جان سے کہہ رہی تھی۔

”امی ندیم بھائی کہہ رہے ہیں کہ بھابی ابھی نہیں جائیں گی اپنے میکے۔ وہ کہہ رہے ہیں شام کو ویسے کے بعد چلی جائیں گی اور کل ہم لوگ لے آئیں گے۔“

”ٹھیک ہے، جیسے اس کی مرضی۔“ پھوپھی نے قصہ کوتاہ کیا تھا۔

روشن دونوں کا ناشتا کمرے میں لے آئی تھی۔ اس نے صرف ایک کپ چائے کا لیا۔

”ارے بھی! ناشتا کرو، موٹی ہو جاؤ گی تو بھی کوئی بات نہیں۔“ آخر ندیم کو اس پر ترس آ گیا مگر وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

وہ ناشتا کرنے کے بعد اخبار کھول کر بیٹھ گیا۔ اس نے آج تک کسی دلہا کو ویسے کی صبح دلہن کے پاس بیٹھ کر اخبار پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اٹھ کر سنگھار میز کے سامنے بیٹھ کر کیونکس چینیج کرنے لگی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ باہر نکل گیا، بنا کوئی بات کیے ہوئے۔

پھول نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ سفید کرتے پانچاے میں وہ نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں لگ رہا تھا۔

”ہونہ، بہت اچھا کیا عارف جو اپنے ارادے ظاہر کر دیے۔ تم کیا سیدھا کرو گے

سیدھے ہیں کہ ان نوجوانوں سے متاثر ہو جاتے ہیں جو قرض حسد کے ذریعے کینیڈا پہنچتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے میری حیثیت؟ شاید نہیں معلوم جب ہی اس طرح کی باتیں کرتے ہیں، گویا میں آپ کی بے دام ہوں۔ ہمارے گھر سے لوگ اپنے اسکولوں کے لیے فنڈ لے کر جاتے ہیں۔ آپ جیسے لوگوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے اخراجات اٹھاتے ہیں۔ آپ اگر غیر ہوتے تو شاید میری ذمہ داری نہ پاتے۔ پاپا نے آپ کو رشتے دار ہونے کے ناتے ترجیح دی اور آپ۔“

پھول نے شکست کا لاوا بہاتے ہوئے لمحہ بھر کو بھی نہ سوچا کہ اس وقت وہ ندیم سے نہیں اپنے قانونی دندہ بی شوہر سے مخاطب ہے۔ وہ مشرق میں شوہر کی حیثیت سے شاید قطعی نابلد تھی۔

”ختم ہو گئی آپ کی تقریر؟“ وہ کئیلے انداز میں مسکرایا۔

”ارے پھول بیگم! کیا سمجھتی ہیں آپ کہ حسن آپ پر ختم ہے؟ ہم جیسے سیلف میڈ لوگوں کو آپر کلاس جال پھینک کر کھینچتی ہے۔ ان کے اپنے لڑکے تو عیاشیوں میں پڑ جاتے ہیں یا باہر شادیاں کر لیتے ہیں۔ پھر یہ طبقہ مڈل کلاس، تازہ ترقی پسند اور ذہین نوجوانوں کو کاروبار میں شیر کے ساتھ داماد بناتا ہے۔ ایک سے ایک لڑکی مجھے مل سکتی تھی۔ تم سے تو میں نے ثواب کمانے کے لیے شادی کی ہے۔“ اس کا لہجہ دو دھاری تلوار ہو گیا اور لفظ ”ثواب“ سن کر تو پھول کے جیسے بھڑیں چٹ گئیں وہ ہسٹریائی انداز میں رونے کا پروگرام بنانے لگی تھی کہ ندیم نزدیک آ گیا۔

”میں تم جیسی بد زبان، مغرور لڑکی کو سیدھا کرنے کا عزم لے کر اس آگ میں کودا ہوں اور ظاہر ہے یہ ثواب کا کام ہے۔ اچھا خیر چھوڑو۔ یہ آج کیا بے سرد پابائیں شروع ہو گئیں۔“

اس نے مسکرا کر بڑی چال بازی سے کہا اور پھول بری طرح بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔

اسے اس وقت اپنی بے بسی کا پورا پورا احساس ہو چکا تھا۔ وہ سسک پڑی۔

”آپ اگر میرے پاس آئے ناں تو میں جان دے دوں گی۔ دیکھیے گا صبح سب کو بتا دوں گی کہ یہ شادی نہیں انتقام ہے۔ جو جو آپ نے کہا ہے وہ بھی سب کو بتا دوں گی۔“ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

”آپ مجھے ٹھیک کریں گے؟ صبح ہو جائے تو ہوش ٹھکانے لگا دوں گی۔“ اس نے روتے روتے ناک پونچھی ”اور میں صبح ہی چلی جاؤں گی کسی سے بات نہیں کروں گی نہ امینہ خالہ سے نہ پاپا سے۔ ایسا بوجو وغیرہ تو میری پکی دشمن ہیں، جلتی ہیں مجھ سے جب ہی تو صاف صاف نہیں بتایا کہ..... میں سمجھی پتا نہیں کون اوتار آسمان سے اترا ہے اس خاندان میں۔ میں سب پر لعنت بھیجتی ہوں۔“ اس کا انداز ہسٹریائی ہو گیا تھا۔ وہ باقاعدہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

مجھے؟“ اس نے نخوت سے سوچا۔

ویسے کے بعد پاپا اور دوسرے لوگوں کے ہمراہ وہ گھر چلی آئی تھی۔ اگرچہ اس نے اپنے کمرے میں آ کر بہت سکون محسوس کیا لیکن آج اسے سب کچھ اجنبی لگ رہا تھا۔ شام کو روشن کافون آیا تھا کہ میں اور امی آپ کو نو بجے تک لینے پہنچ جائیں گے۔ ایک منہ ندیم کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرا کر گونجی ”جس دہن کو دلہا لینے نہ پہنچے.....“

”روشن! ندیم نہیں آئیں گے؟“ اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔
 ”بھابی! ظاہر ہے انھیں ہی پہنچنا چاہیے لیکن شام سے بھائی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“
 اس نے مردوتا یہ بھی نہیں پوچھا کہ کیا ہوا اتنی بات بھی اس نے اپنی غرض و عزت نفس کی خاطر کر لی تھی۔

”روشن! جب وہ ٹھیک ہو جائیں تو آ جائیں۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے؟“
 ”مطلب یہ ہوا بھابی! کہ آپ صرف بھائی جان کے ہمراہ ہی آئیں گی۔“ روشن نے شریر لہجے میں پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔ روشن نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے فون رکھ دیا۔
 نو بجے تک اس نے انتظار کیا پھر پاپا کے ہمراہ کھانا کھا کر اپنی خواب گاہ میں آ گئی اور ایزی چیئر پر بیٹھ کر میگزین کی ورق گردانی کرنے لگی۔ جانے کیوں اس کا دل کہہ رہا تھا وہ آئے گا اور بعض اوقات جب دھڑکنیں سمٹ کر سکز کر ایک خدشہ ظاہر کرتی ہیں تو دل کی بات سچ نکل آتی ہے۔ وہ آ گیا تھا، دندانہا سیدھا خواب گاہ میں۔ دروازہ تھپتھپانے کے ساتھ ہی وا ہو گیا تھا۔ صبح والے کرتے پانچا مے اور گرلیں فل ہیمز اسٹائل کے ہمراہ آتے ہی گویا ہوا تھا۔ وہ فیروزی کرتے پانچا مے اور بناری دوپٹے میں میک اپ وزیورات کے ہمراہ اسے گھائل کرنے کو تیار بیٹھی تھی مگر اس نے نظر چرا کر فوراً کہا تھا۔

”بھئی اب جلدی سے کھڑی ہو جاؤ۔ آدھی رات تو ہو چکی ہے۔“ اس کا جی چاہا کہ پوچھے کہ پھوپھی جان اور روشن نہیں آئیں؟ مگر وہ خاموش رہی۔ بس اتنا کہا۔

”پاپا سے تو مل لیں۔“

”بھئی! انہی کے درشن یا ترا سے فارغ ہو کر آ رہا ہوں اور ان کا ہی حکم ہوا تھا کہ ”دیوان خاص“ میں حاضری دوں۔ انھوں نے شاید ہمیں تنہائی کا موقع دیا تھا مگر اس کی کوئی

ضرورت نہیں تھی۔ میں نیچے ہوں آ جاؤ۔“

اس کا حکم لہجہ پھول کو پھر سلگا گیا مگر وہ وٹنی پرس اٹھا کر اس کے پیچھے ہی نکل آئی۔ پاپا سے اجازت لے کر وہ سرخ کرولا میں آ کر بیٹھ گئی۔ دوسری سمت سے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا اور اندرونی لائٹ آن کر دی۔ نظر پچا کر پھول کو دیکھا اور غزلوں کی کیسٹ لگا دی۔ زہرہ نگاہ کی خوبصورت غزل طاہرہ سیدی کی آواز میں ابھری:

اپنا ہر انداز آنکھوں کو تر و تازہ لگا
 کتنے دن کے بعد مجھ کو آئینہ اچھا لگا
 وہ بدستور کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

”ارے بھئی روشن اور امی بھی تمہیں گاڑی میں لے کر جاتیں، گدھا گاڑی میں تو نہیں۔ تمہیں تو کسی کی بیماری کا بھی احساس نہیں۔“ وہ زیادہ دیر پتھر نہ بن سکا۔
 ”میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ آپ لوگ آج ضرور لینے آئیں۔“ اس نے بڑی خود اعتمادی اور تہیہ سے ندیم کو دیکھا جو سامنے بہت توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ غزل کا آخری شعر ابھرا۔

میں تو اپنے آپ کو اس دن بہت اچھی لگی
 وہ جو تھک کر دیر سے آیا اسے کیسا لگا؟

”بہت اچھا لگا۔“ ندیم سوچ کر رہ گیا اور بہت ضبط سے ڈرائیو کرتا رہا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ ستائش اس کر لیے کے لیے ”نیم“ ثابت ہوگی۔
 اس نے گاڑی پورچ میں داخل کر کے اس پر ایک نگاہ ڈالی۔

”ابھی گھر میں مہمان بھرے ہوئے ہیں کیوں ہماری کرکری کرانے پر تلی ہوئی ہے؟ کم از کم دہن ہونے کے ناتے آنچل سر پر ڈال لو۔“ اس نے جیسے ندیم کی بات ہی نہیں سنی۔ وہ تو روشن بھاگتی ہوئی آ گئی تھی اور اسے اتارتے ہوئے بڑی ترنگ میں آنچل بھابی کے سر پر ڈال کر تمام کراندر لے گئی تھی۔

رات کو ندیم نے اس سے کہا تھا۔

”دیکھو بھئی! میں تو گرمیوں میں کھلی ہوا میں سونے کا عادی ہوں اور اوپر مچھردانی لگا کر سوتا ہوں۔ تم سو سکتی ہو تو تم بھی چھت پر چلو۔ ایک مچھردانی اور بھی ہے۔“ اس نے بڑی فراخ دلی سے کہا۔

”میں نے یہ واہیات چیزیں کبھی استعمال نہیں کیں اور نہ ہی مجھے چھتوں پر سونے کا

شوق ہے۔“ وہ بھٹا کر گویا ہوئی تھی۔

ندیم نکیہ بغل میں داب باہر نکل گیا اور وہ سر ہاتھوں میں تھام کر رگ میں نفرت کا زہر اتارنے لگی۔

پھر تو ہر روز اس کے پندار کے شیشے پر ضرب پڑنے لگی۔

شاید اس کی شادی کو پندرہ روز ہوئے تھے۔ پاپائیو یارک جا چکے تھے۔ اب تو گھر پر بھی کوئی نہ رہا تھا۔ آج صبح جب وہ ہمیشہ کی سی بے فکر نیند میں ڈوبی ہوئی تھی، کسی نے اس کا کندھا ہلایا۔ اس کی میٹھی نیند ٹوٹ گئی۔ سامنے ندیم کھڑا تھا۔

”ارے بھئی! مجھے پونے چھ بجے ناشتا کرنے کی عادت ہے، اب میں اپنی بوڑھی ماں کو کب تک پریشان کرتا رہوں۔ ذرا ناشتا تو بناؤ۔ ایسا کوئی لمبا چوڑا ناشتا نہیں کرتا۔ آلیٹ اور ٹوسٹ۔ اٹھو بھئی، پونے چھ بجے کے بعد میری بھوک ختم ہو جاتی ہے۔“

وہ تو ایک دم حیران پریشان اس کی صورت دیکھ رہی تھی پونے چھ بجے؟ ناشتا؟ اس نے گھڑی دیکھی ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ باہر بھی ہلکی ہلکی روشنی ابھری تھی۔ اس کے پورے وجود میں ناگواری کی لہر دوڑ گئی۔

”مجھے ناشتا بنانا نہیں آتا۔“ وہ بے زاری سے گویا ہوئی۔

”ارے بھئی! میں کون سا تم سے حلیم پکوار ہا ہوں۔ سیدھا سادا آلیٹ۔ انڈا توڑنا تو آتا ہوگا اسی بہانے جلدی اٹھ جایا کروگی، فجر کی نماز بھی پڑھ لیا کرنا۔ حضور ﷺ نے معراج کی شب ایک ایسا مسلمان گروہ دیکھا جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے تھے پتا چلا یہ وہ لوگ ہیں جو فجر کے وقت پڑے سویا کرتے تھے۔“ اس نے کھڑے کھڑے ایک اور حربہ آزمایا۔

پھول کے اعصاب پر ابھی تک نیند کا غلاف چڑھا تھا۔ منہ اندھیرے سرمہ کچلنے کا سن کر بھبھک سے نیند اڑ گئی۔ پھر منہ موڑ کر بولی۔

”میں نماز پڑھ لوں گی، مگر مجھ سے یہ آدھی رات کو اٹھ کر ناشتا نہیں بنے گا۔“

ندیم زیر لب مسکرا دیا۔ ”چلو کچھ تو کرو۔ آہستہ آہستہ ناشتا بھی بنانے لگو گی۔“

وہ جاتے جاتے پلٹ پڑی۔

”میں کچن کا کام کرنے کی عادی نہیں ہوں۔ پھوپھی نہیں کر سکتیں تو خانا ماں رکھ لیں۔“ نماز پڑھ کر وہ پھر سو گئی تھی۔

پھول اپنی عادت کے خلاف حیرت انگیز طور پر بہت ضبط کر رہی تھی۔ یہ سارے ضبط

اس کی اپنی انا، اپنے پندار کے لیے تھے۔ ندیم سے بہت کم اس کا سامنا ہو رہا تھا۔

رات کو وہ اپنی چھگردانی میں ہوتا تھا اور وہ ایئر کنڈیشنڈ خواب گاہ میں۔ چار پانچ مرتبہ کے ضبط کے بعد وہ بری طرح پھٹ پڑی۔

کئی روز سے دعوؤں کا سلسلہ جاری تھا اور وہ اس کی تیاری میں دخل دیا کرتا تھا جن پر وہ عمل تو نہیں کرتی تھی مگر جان تو جلتی تھی۔

اس نے سبز ساڑھی پھیلانی تو ندیم نے مشورہ دیا کہ اس کے ساتھ براؤن بلاؤز پہنو۔ وہ ایک دم سلگ اٹھی۔

”یہ سبز کے ساتھ براؤن کا کیا کنٹراسٹ ہے؟“

”کیوں نہیں ہے، دیکھنا سب سراپیں گے۔ جوڑا دوڑا امت باندھنا۔ چوٹی میں سفید پرانہ ڈالو اور چاندی کا زیور پہنو۔ گرے سینڈل پہنو۔ تم گھبراؤ مت کوئی پوچھے گا تو میں کہہ دوں گا کہ قوس و قزح نیا فیشن ہے تم دیکھنا پھر سب تقلید کریں گے۔ قوس و قزح تو سب کو اچھی لگتی ہے۔“

وہ اتنا سیریس تھا کہ وہ سلگ اٹھی اور اپنے پرانے انداز میں چل کر اس کے پاس آئی۔

”ندیم صاحب! آپ میری نرمی سے خوش فہمی میں مبتلا مت ہوں۔ میں اس ملک کی ان لڑکیوں میں سے ہوں جو فیشن تخلیق کرتی ہیں تقلید نہیں۔ آپ حکم چلا کر خوب خوش ہوتے رہیے۔ میری مصلحت کوئی کو اپنی کامیابی سمجھئے۔ ندیم صاحب میں اس خاندان کی سب سے دولت مند لڑکی ہوں۔ دولت و حسن میرا اثاثہ ثانیہ ہے اور عزت و وقار اثاثہ اول کیونکہ اس کے بغیر وہ اثاثے وھندلا جائیں گے، بے تاثر ہو جائیں گے۔ میں اپنی قسمت کے اس تاریک دور میں کسی جذباتیت سے کام لے کر اپنے پاؤں پر کلبازی مارنا نہیں چاہتی۔ انسان اس دنیا میں زندگی گزارنے آیا ہے ناں، تو شان سے زندگی گزارے۔ آپ اپنی شان کی حفاظت کریں اور میں اپنی آن بان اور شان کی۔ براہ کرم مجھ پر احکام صادر کرنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ یہ کسی کے لیے بھی اچھا نہیں ہوگا۔“

ندیم کے لیے اس کا انداز ناقابل برداشت ہو گیا۔

”پھول! تمیز سے بات کیا کرو، کیا شان ہے تمہاری؟ تین بول کے عوض یہاں آئی ہو تین بول کے عوض یہاں سے واپس بھیج سکتا ہوں۔“

پھول سنائے میں رہ گئی۔ اس کے گمان جھوٹے نکلے۔ وہ جیتی نہیں گئی تھی انتقام کا

نشانہ بنی تھی۔ محبت کرنے والے فراق کے ذکر سے بھی ڈرتے ہیں اور یہ، یہ شخص..... وہ ندیم کے نزدیک چلی آئی۔

”ندیم صاحب! لوگ محبتوں سے جیتے جاتے ہیں، نفرتوں سے نہیں۔ آپ لوگ ہمارے معیار کے نہیں ہیں۔ میں پونے چھ بجے آپ کو ناشتا نہیں دے سکتی۔ میں آپ کے منتخب کیے ہوئے، آپ کی ذہنیت کے غماز لہاز نہیں پہن سکتی، میں چھتوں پر نہیں سو سکتی۔ میرے پاپا سیدھے سادے آدمی ہیں، آپ انھیں پھنسا سکتے ہیں مجھے نہیں۔ مجھ سے شادی کرنے سے پہلے آپ کو معلوم کر لینا چاہیے تھا کہ دولت مندوں کی اہلوتی بیٹیاں کیسے رکھی جاتی ہیں۔“ اس نے اپنا دہنٹی پرس اٹھایا، آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال سیٹ کیے۔

”تم تو چار بہنیں ہو، جن کی دولت پر تم نازاں ہو وہ۔“

”میں نے جس محل میں آنکھ کھولی ہے، وہ میری راجدھانی ہے، وہاں میرا حکم چلتا ہے۔ میں اس کی مالکن ہوں۔ جنھوں نے مجھے محبتوں سے نوازا وہ ہی میرے والدین ہیں۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر ترشی سے بولی۔

”اور ندیم صاحب ایک بار کینڈا اور ہوائے ہو سکتا ہے اس بار زیادہ اچھی آسامی۔“ چٹاخ..... ندیم کا ہاتھ میکا کی انداز میں اس کے رخسار پر جا پڑا تھا اور وہ نادم بھی نہیں تھا۔

”پھول! تم میری پہلی سے نکلی نہیں لگتیں۔ میری پہلی اتنی ٹیڑھی تو نہیں ہو سکتی۔ میں نے تو سوچا تھا مجھیں سب پر ایک سا اثر کرتی ہیں۔ جاؤ تم سونا بچھا کر سوؤ نوٹوں کی چادر بنا کر اوڑھو، بے وقوف لڑکی۔“ وہ پردہ اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔



ایمنہ پھوپھی، خاندان کے دیگر بڑے اسے سمجھا چکے تھے اور اس نے قطعیت سے کہہ دیا تھا کہ اس کا ندیم سے کوئی رشتہ نہیں۔ اس فیصلے کے بعد بے حد پراسکون تھی اور اپنی پرانی مصروفیات میں مصروف ہو گئی تھی۔ روشن فون پر رونا دھونا چپاتی تھی۔ پھول نے نوکر سے کہہ دیا کہ اگر روشن کا فون آئے تو اسے نہ بلایا جائے۔

”بھائی، بھائی، تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لو روشن بیگم، ہونہ۔“ رمضان شروع ہو گئے تھے۔ روزے تو اس نے ساری عمر میں گنتی کے رکھے تھے مگر عید اکثرت کی طرح بے حد اہتمام سے مناتی تھی۔

گھر کی نئے سرے سے سینک ہو رہی تھی۔ پاپا کے دوست، مٹی کی سہیلیاں، ان کے بچے اسے مبارکباد دینے آتے تھے جو اس کے گھر لباس حسن کی تعریفوں سے اس کی گردن میں مزید کلف لگاتے تھے۔

چاند رات تک تمام صفائی وغیرہ ہو چکی تھی۔ وہ اپنے ملبوسات وارڈروب میں لٹکا چکی تھی۔ مہندی کا تو اسے شوق نہیں تھا۔ وہ ایئر کنڈیشنر تیز کر کے نوکروں کو کوارٹروں میں بھیج کر لمبی تان کر سونگئی۔

ایک بجے کے قریب شور سے اس کی آنکھ کھل گئی، اسے گمان ہوا، نوکر جو اندر ہی رہتے تھے، بحری کرنے اٹھے ہیں۔ اس نے غور سے دیکھا تو ایک بچہ رہا تھا۔ اسی دم کسی کے بھاگنے کی آواز آئی۔ مردانہ قدموں سے کاریڈور میں دھمک پیدا ہو رہی تھی وہ چادر پھینک کر اٹھی اور نیچے جھانکا تو اس کا سانس چلنا بھول گیا۔ کالے کالے ڈھانٹے باندھے، اونچے لمبے ڈاکو نوکروں کو رسیوں سے جکڑ رہے تھے۔ غفور کے منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا تھا۔ وہ ستون سے بندھا ہوا تھا۔

پھول کی ٹانگیں بے جان ہو گئیں، وہ خود کو گھٹیت کر فون تک لائی اور تھانے کے بعد ایمنہ کے گھر ڈائل کیا اور شکر ادا کرنے لگی کہ فون کی تاریں نہیں کاٹی گئی تھیں۔

اتنی دیر تک گھنٹی بجتی رہی، فون کسی نے نہیں اٹھایا۔ اسی دم کسی کے زینہ طے کرنے کی آواز آئی تو پھول کی کھکھی بندھ گئی۔ اس نے روشن کا دیا فون نمبر ملایا۔

اسی دم دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔

”دروازہ کھول سیٹھانی۔“

پھول ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر ڈیرینگ روم میں گھس گئی۔ اس کے حواس جواب دینے لگے تھے۔

”سیٹھانی دروازہ کھول، ورنہ دروازہ توڑ دیں گے۔“ سندھی لمبے میں کوئی غرایا اور دروازہ بڑی طرح پیٹ ڈالا۔

اسی دم دوسری طرف کسی نے فون اٹھا لیا تھا۔ آواز ابھری تھی۔ ”ہیلو۔“

”مم..... میں، پھول۔“

”سیٹھانی تیری خبر نہیں۔“

”ہائے اللہ۔“ دوسری طرف پھول کی ہائے اللہ سنی گئی۔ اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔ ڈاکو، اسی دم کوئی کھڑکی توڑ کر کودا۔ پھول کے اعصاب جواب دینے لگے۔ اس نے فون لکڑی کی

میز کے نیچے چھپا دیا۔ اسی دم ایک سیاہ طوفان اندر جھانکا اور پھول تاب نہ لاسکی، اگلے لمحے وہ بے خبر تھی۔



”پھول، پھول۔“ کوئی اس کے رخسار تھپتھپا رہا تھا، غالباً اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گئے تھے۔ پھول نے آنکھیں کھولیں وہ اپنے دبیز بستر پر تھی کوئی اس پر جھکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دیکھنے کے قابل ہوئی۔ لائٹ براؤن نائٹ سوٹ میں ندیم اس کے بہت قریب تھا۔ اسے ایک دم خوفناک منظر یاد آیا جب ڈرینگ روم کا سرخ پردہ کھسکا تھا۔ وہ چیخ کر اٹھ بیٹھی۔ ندیم کے گلے سے لگ کر وہ بڑی اپنائیت سے پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

”وہ سب کہاں ہیں؟ آپ کیسے آئے؟“

”ارے بھئی! مجھے ان سب کی تو خبر نہیں فکر تو بس تمہاری تھی، شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو۔“

”وہ ڈاکو کہاں ہیں؟ کیا کیا لے گئے؟“

”بھئی! پکڑا تو ایک گیا ہے باقی شاید بھاگ گئے۔ تم نے شاید پولیس کو فون کر دیا تھا۔ دیکھو بھئی تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔ صبح کے پانچ بج رہے ہیں، گھر میں کسی کو نہیں معلوم کہ میں ادھر آیا ہوں۔ عید کا دن شروع ہو چکا ہے۔ امی اٹھ چکی ہوں گی مجھے نہ پا کر پریشان ہوں گی۔“ وہ ایک دم اجنبی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

پھول نے چونک کر دیکھا۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی۔ اس سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن اس کا زرد ٹھاپن دیکھ کر وہ اپنی انا پرست طبیعت کو آمادہ نہ کر سکی کچھ بھی کہنے پر۔

ندیم نے ٹیبل سے اپنی رسٹ وایج اٹھائی اور اس کی طرف پلٹا۔ ”اچھا بھئی عید مبارک، آئندہ ڈاکو آنے تک خدا حافظ۔“ کیا انداز تھا جتانے کا۔

”آپ نہ جائیں، فون کر دیں کہ میں یہاں ہوں۔“ اندر کی زبردست طاقتوں سے نبرد آزما ہو کر اس کی خالص آواز دھیسے سے ابھری۔

ندیم نے چونک کر اس کی سمت دیکھا۔ ”ارے نہیں بھئی! ماں بہنوں کے سامنے تھوڑی بہت عزت ہے۔ کیا سوچیں گی کہ ندیم صاحب بھی کیا بے حمیت انسان ہیں۔ بیوی آنے پر آمادہ نہیں اور یہ ہیں کہ راتوں رات عید مبارک کہنے فرار ہو گئے۔“ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ ندیم صرف ایک بار کہہ دے کہ گھر چلو، مگر وہ خاموش تھا۔

”ندیم چلیے، میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔ پھوپھی اور روشن کو عید مبارک بھی کہہ دوں گی۔“ اس نے میز ہی میز ہی بات کی۔

”اجی نہیں شکریہ! مبارکباد ہی تو دینا ہے، فون پر دے دیجیے گا۔“

پھول کا خون پھر جوش پر آنے لگا۔

وہ انا سے جنگ میں مصروف ہو گئی۔ ندیم باہر نکل گیا تھا۔ ندیم کا ہر آگے بڑھتا قدم پھول کا دل بھیجنے لیتا تھا وہ بھاگ کر گیلری میں آ گئی۔ ریڈنگ تھام کر نیچے جھانکنے لگی۔ ندیم گاڑی تک پہنچ گیا تھا۔ پھول ایک دم نائٹی میں الجھتی زینے طے کر گئی۔ ندیم ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے اپنے کان پھول کے قدموں کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے جب دیر تک چاپ نہ ابھری تو وہ بے حد شکستہ دل ہو گیا تھا۔ اب عین سامنے پھول کو دیکھ کر دل خوش گوار انداز میں دھڑکا۔

”سینس میں بھی چل رہی ہوں۔“ اپنی دانست میں پھول نے اپنی زندگی کا سب سے

کڑا امتحان دیا۔

”اگر تم ڈاکوؤں کے ڈر سے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو تو ڈاکو تو وہاں بھی آ سکتے ہیں۔“

پھول نے سامنے بیٹھے پتھر کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

”اچھا بھئی! اگر چلنا ہے تو لباس وغیرہ تو تبدیل کر لو۔“ اس نے پھول کے سر پرے پر

بھر پور نظر ڈالی گویا احسان سا توڑا۔ ”ویسے بھی میرے ناشتے کا وقت ہونے والا ہے۔ پونے چھ۔“

”آپ ناشتا کر لیجیے، آئیے ناں پلیز۔“ پھول نے ایک بار بھی نظر نہیں اٹھائی تھیں۔

”ناشتا کون بنائے گا؟ ایک نوکر تو اسپتال میں ہے باقی نظر نہیں آ رہے۔“ اس نے

تال کیا۔

”میں خود بنالوں گی۔“ اتنی دلفریب اداسی کہ ضبط مشکل ہو گیا۔

وہ ناشتا بنانے چلی گئی۔ ندیم نے گھر فون کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آلیٹ، ٹوسٹ اور چائے سے سنجی ٹرے لیے حاضر تھی۔ گلابی نائٹی میں صبح کے خوبصورت سمے وہ پھول ہی لگ

رہی تھی۔

”سینس! ہمیں تھانے وغیرہ تو جانا نہیں پڑے گا؟“ اس نے ٹرے رکھتے ہوئے پوچھا۔

”ارے نہیں بھئی! باقاعدہ گواہوں کے سامنے تمہیں قبول کیا ہے۔“

وہ تیزی سے بولا تھا۔ پھول نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر مسکراہٹ روکی۔

”میں ڈاکے کے متعلق کہہ رہی تھی، رپورٹ تو مرتب کر لی گئی ہوگی؟“

رشتوں کے ریشم

”چٹاخ“ کی زوردار آواز سے فیملی کورٹ میں موجود ہر ذی نفس چونک اٹھا تھا۔
 ”نہ تم محبت کرتی ہو نہ میرے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو۔ یہی کہا نا تم نے؟“ وہ سفید
 ٹرٹے پا جاے میں ملبوس سپر سادی مارے جذب کے سرخ ہو رہا تھا اور نیلو فر اپنے رخسار پر
 ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اب کیا ان سب کے سامنے وہ سارے منظر دہراؤں دعا باز لڑکی! جن کی وجہ سے
 دھوکا کھا کر آج میں ذلیل و خوار کھڑا ہوں۔ اچھا خاصا ذلیل و خوار کیے بغیر تو میں تمہیں نہیں
 چھوڑوں گا۔“ وہ ”کی رنگ“ مٹھی میں بھینچ کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔
 مگر راستے ہی میں نیلو فر کے پاپا نے اسے جالیا۔
 ”تم نے اس پر ہاتھ کس خوشی میں اٹھایا؟ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“ وہ گرج کر
 مزید آگے بڑھے۔

”ہاتھ خوشی میں اٹھایا ہو یا غم میں، آپ مجھے ٹوکنے والے کون؟ میں اپنی بیوی کے
 ساتھ جو چاہے سلوک کروں، میری مرضی۔“ وہ بھی غضبناک ہوا۔
 ”شاید تم بھول رہے ہو، یہی زبردستی کا رشتہ ختم کرنے کے لیے تم آج اس کورٹ
 میں مدعو تھے۔“

وہ سنی آن سنی کر کے پھر آگے بڑھ گیا تھا۔ کورٹ میں موجود لوگوں کو ایک متماثل گیا
 تھا دیکھنے کو۔ اسی وجہ سے نیلو فر کے پاپا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ قیہ بنا دیں اس کا۔
 ”رازی.....! زکیے، بٹھریے۔“ وہ جانے کیا سوچ کر اس کے پیچھے بھاگی۔
 ”نیل! پاپا نے اسے زوردار آواز میں پکارا مگر اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔
 ”رازی خدا کے لیے آپ زکیے۔ میں آپ کے ساتھ چل رہی ہوں۔“
 وہ گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ چکا تھا۔

”پتا نہیں؟“ وہ ناشتے میں مصروف ہو گیا۔ پھول لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔
 ”ارے بھئی پھول بیگم! یہ آلیٹ تو تمہارے اخلاق کی طرح بالکل جلا ہوا ہے۔“
 کف کے ٹن بند کرتی پھول بری طرح شرمندہ ہو گئی۔
 جب وہ گاڑی میں اس کے برابر بیٹھی تو ندیم نے اس کی سمت دیکھا۔

تم میرے پاس ہو پھول مگر مجھے بالکل خوشی نہیں کہ مجھے یہ خوشی ڈاکوؤں کی مرہون
 منت لگ رہی ہے۔ میں بہت احمق ہوں پھول۔ تمہیں دیکھا، تمہیں چاہا اور پیچھے پڑ گیا۔
 حالانکہ تم کوئی خوبصورت شوپین نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی لڑکی ہو۔ شادی کسی فریق کی بالادستی و
 شہنشاہیت کا نام نہیں۔ یقین کرو بعض اوقات مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔ دراصل میں مشکل پسند
 آدمی ہوں۔ سوچا تھا تمہیں محبت کرنا سکھاؤں گا، مگر پھول محبت سکھائی نہیں جاتی یہ تو.....“
 اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ہونٹ بھینچ لیے۔

”ندیم وہ مرد ہی کیا جس کا عزم راستے میں دم توڑ دے۔ ندیم وہ مرد ہی کیا جس کے
 فیصلے پختہ نہ ہوں۔ وہ مرد ہی نہیں جس کی زبان ایک نہ ہو۔ آپ اپنی خوبیوں پر افسوس کر کے
 مجھے مایوس نہ کریں۔ مجھے زندگی بخش کر زہر نہ پلائیں۔ آپ مجھے کبھی بھی برے نہیں لگے۔ میں
 نہیں چاہتی تھی کہ آپ پر ظاہر ہو جائے کہ آپ مجھے کتنے اچھے..... ندیم شاید ہمارا مٹھی اور شدید
 عمل اسی لیے ہوتا ہے کہ ہم اپنے حقیقی جذبات کو چھپانا چاہتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ حقیقت
 کو مٹنی انداز میں چھپا کر ہم خود پر کتنا ظلم کرتے ہیں۔“

اس نے ہاتھ ملتے ہوئے دھیرے سے اپنی خودداری، اپنے غرور کو موت کا آخری
 نشتر چھو دیا۔ اسی دم گاڑی کے بریک تیزی سے چرچائے اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے
 ٹکراتے بچا۔

”معاذ اللہ، ارے بھئی! اتنی خوبصورت بات کہنے سے پہلے یہ تو سوچ لیا ہوتا کہ میں
 گاڑی چلا رہا ہوں۔“
 پھول نے مسکراہٹ سر جھکا کر چھپانا چاہی۔

”پھول!“
 پھول نے نظریں اٹھائیں۔ ندیم نے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا اور مسکرا
 کر کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“ ساتھ ہی ایکسیلیٹر دبا دیا۔ ”پھول کھڑی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔“



ایک نگاہ غلط اس پر ڈالی اور انگلیشن میں چابی ڈال دی۔ ”بہت ہو چکا یہ ڈراما، میں تمہارا خون تو کر سکتا ہوں مگر تمہیں ایک پل اپنے قریب برداشت نہیں کر سکتا۔“ اس نے تیزی سے گاڑی بیک کی تو وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔

”میں آپ کے ساتھ چل رہی ہوں، چاہے آپ مجھے۔“

”بہت شکریہ، کوئی ضرورت نہیں مجھ پر احسان کرنے کی۔“ وہ زن سے گاڑی لے اُڑا۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی۔

”یہ کیا حرکت تھی؟“ غضبناک سے پایا اس کے سر پر کھڑے تھے اور عظیم بھائی علیحدہ اسے ناراضگی سے دیکھ رہے تھے۔ امی البتہ چپ چاپ سی تھیں۔

”کیا کر رہے ہیں آپ لوگ میرے ساتھ؟ کیوں تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں مجھے؟“ وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

”سنا تم نے؟ ہم اسے تباہ کر رہے ہیں۔ نادان لڑکی! تمہیں اتنا بھی احساس نہیں کہ وہ کچے دھاگے سے بندھا رشتہ اور ہم تمہارے ماں باپ ہیں۔“ وہ بیوی کی طرف متوجہ ہوئے پھر اگلے جملے بیٹی سے کہے۔

”یہ کچے دھاگے سے بندھا رشتہ نہیں ہے پایا!“ اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔
”تم..... دیکھ رہی ہو۔“ وہ موقع محل کا لحاظ کیے بغیر بیوی پر برس پڑے۔ ”ہزاروں روپیہ برباد کرنے کے بعد اسے دھیان آ رہا ہے رشتوں کی مضبوطی اور کمزوری کا۔“ ان کا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگا۔

”آپ لوگ خود ہی تو یہ تعلق توڑنا چاہ رہے ہیں۔ مجھ سے کب کس نے رائے لی ہے؟“ اس نے ایک ہاتھ ماں کے کاندھے پر رکھا اور دوسرے سے آنکھیں پونچھیں۔

”دیکھ لو وحیدہ بیگم..... دیکھ لیا..... ہماری اپنی اولاد ہمیں ذلیل کرانے پر تلی ہوئی ہے، وہ بھری عدالت میں طمانچہ مار کر ڈھنگا کر چلا گیا..... اور یہ اس کے گلے پڑ رہی ہے۔“

وہ چپ کھڑی باپ کی گرمی محسوس کرتی اور ڈانٹ کھاتی رہی۔
عبید الرحمن کچھ دیر نظریں نیچے کیے آنسو بہاتی بیٹی کو دیکھتے رہے پھر آس پاس نظر

ڈالی۔ ”نہ ہوا میرے پاس رویو اور شوٹ کر دیتا اسی وقت۔“
وہ پھر بھی چپ کھڑی رہی۔

”وحیدہ بیگم اسے کہو گاڑی میں بیٹھئے۔“ بلا واسطہ کلام ان کی حد درجہ ناراضگی ظاہر کر رہا تھا۔ ”میں خود اسے اس کے در پر چھوڑ کر آتا ہوں۔ جب وہ دس آدمیوں کی موجودگی میں اس کو تھپڑ مار سکتا ہے، تنہا گھر میں تو جو نہ کرے کم ہے۔“ انھوں نے گویا اس کو آنے والے وقت سے ہولایا بھی اور اپنی ”انا“ بھی دکھائی۔

وہ چپ چاپ گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی..... وحیدہ بیگم اس اچانک بدلتی صورت حال پر حیران پریشان میاں کے ساتھ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

اس وقت وہ اتنے خطرناک موڈ میں تھے کہ لب کھولنا اپنی شامت بلانے کے مصداق تھا۔ حالانکہ وہ سخت اضطرابی کیفیت میں پہلو بدل رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی سخت دھچکے سے رکی۔
”وحیدہ بیگم اس سے کہو اترے۔“ انھوں نے ان ڈائریکٹ حکم صادر کیا۔

”اے ہے۔ غضب خدا کا! کیا کرنے جا رہے ہیں۔ اتنی عمر کہاں گنوا دی ہے؟ اس کی کیا رخصتی ہوئی تھی جو آپ رازی کی چوکھٹ پر بیچ کر جا رہے ہیں؟ صرف نکاح ہی تو ہوا ہے۔“

”محترمہ! اصل چیز نکاح ہے۔ شادی ہزار آدمیوں کے پیٹ بھرنے کا نام نہیں ہے۔ یہ بے کار کے دھندے ہیں جن پر مذہب کا ٹھپہ لگا کر اہم بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، اسے کہو فوراً اتر کر اس کے گھر چلی جائے۔“ وہ غضبناک ہوئے۔ ”اس سے زیادہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس نے ایک غیر انسان کو ماں باپ پر ترجیح دے کر ثابت کر دیا ہے کہ یہ ہمیں کیا سمجھتی ہے۔“

”پاپا!“ وہ گاڑی سے اتر کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔
وحیدہ بیگم نے بھی اترنے کے لیے پرتولے۔

”تمہیں اس کے ساتھ جانے کی کوئی ضرورت نہیں، اگر مجھ سے بحث کر دو گی تو ہمیشہ اس کے ساتھ رہو گی اور اسی وقت سے میرا تمہارا رشتہ.....“

وحیدہ بیگم توبد کر کھڑکی سے یوں پرے نہیں جیسے بچھونے ڈنک مار دیا ہو۔
”اے ہے غضب خدا کا! بڑھاپے میں سر میں خاک ڈلوائیں گے کیا؟ انسان کو غصے کے وقت کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ میں کہہ رہی ہوں اس کی ابھی رخصتی نہیں ہوئی ہے۔“

”اگر تم مجھ سے مزید بحث کر دو گی تو میں یہ گاڑی سامنے پول سے دے ماروں گا۔ دروازہ ٹھیک سے بند کرو۔“ جیسے ہی وحیدہ بیگم نے اُدھ کھلا دروازہ کھٹاک سے بند کیا، وہ گاڑی

تیزی سے آگے بڑھا گئے۔

یہ گھر سرفراز نے حال ہی میں خریدا تھا، وہ پہلے تو دم بخود سینے پر ہاتھ رکھے کھڑی رہ گئی۔ پھر مرے مرے قدموں سے سفید گیٹ کی طرف بڑھی اور کال ٹیل کا بٹن پُش کرنے لگی۔ بوڑھے ملازم نے گیٹ کھولا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ (یہ ملازم بھی نیا تھا) ”سامنے سے نہیں بابا!“ وہ جھٹلا سی گئی۔ ویسے ہی ذہن میں آنندھیاں چلنے لگی تھیں۔ ”آپ کو کس سے ملنا ہے بی بی؟“ بوڑھا ملازم خود الجھ گیا، اس کا الجھا ہوا انداز دیکھ کر۔ ”مجھے کسی سے نہیں ملنا ہے، گھر ہے میرا۔“

بوڑھا ملازم اسے یوں دیکھنے لگا جیسے اس کی ذہنی صحت پر شبہ ہو۔

وہ اندر کی طرف بڑھ گئی اور ٹی وی لاؤنج میں پڑی ایک آرام کرسی پر ڈھلے گئی اور اپنے انتہائی قدم پر غور کرنے لگی۔

وہ اس کی بیوی قانونی اور شرعی ہر لحاظ سے تھی مگر ابھی وہ ان جراتوں اور حوصلوں کی مالک نہیں تھی جو کسی لڑکی کو شوہر کے ساتھ بے تکلفی کا زویہ اپنانے میں مدد دیتے ہیں۔ وہ اس خاص معاشرتی ”پروسس“ سے نہیں گزری تھی جس سے دو بول پڑھنے کے بعد تقریباً ہر لڑکی کی گزرتی ہے۔

اس کا نکاح محض دس افراد کی موجودگی میں ہوا تھا جن میں گواہ دوکیل بھی شامل تھے۔ وہ اپنے اندر ہی اندر طوفانوں کی زد میں تھی۔

یہ میں نے کیا کر دیا؟

یہ صحیح ہے یا غلط..... وہ اس کے ساتھ کس طرح پیش آئے گا؟

اس نے پاؤں اٹھا کر کرسی پر رکھ لیے اور آنکھیں موند لیں۔

”آپ کس کی اجازت سے یہاں میرے گھر میں تشریف فرما ہیں اور کس خوشی میں؟“

اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں..... اتنا سخت اور اجنبی لہجہ۔

سارے مان یہاں وہاں گر کر چکنا چور ہو گئے۔

”میں پوچھ رہا ہوں آپ یہاں کس حیثیت سے تشریف لائی ہیں؟“ وہ بے حد

غضبناک نظر آ رہا تھا۔

وہ خاموش نظریں جھکا کر اپنے ناخن تکنے لگی۔

”میں کچھ بگ بگ کر رہا ہوں محترمہ! یہ میرا گھر ہے، میری اجازت کے بغیر یہاں

کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔“ اس کا لہجہ بدستور غیظ و غضب کا اظہار کر رہا تھا۔

”میں کوئی نہیں ہوں۔“ پلا خروہ بول پڑی۔

”خوب۔“ وہ تلخی سے مسکرایا۔ ”بابا.....!“ اس نے زور سے ملازم کو آواز دی۔

”جی صاحب؟“ وہ تیزی سے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا۔

”ان محترمہ کو عزت کے ساتھ گیٹ سے رخصت کر کے آؤ اور آئندہ مجھ سے پوچھے

بغیر کسی کو اندر داخل نہ ہونے دینا۔“ وہ پلٹ گیا۔

”آپ میری بات تو سن لیں۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”تم نے اپنی بات سنانے کے لیے جو دلیل کیا ہے، بہت اچھا بولتا ہے۔ میں اب جو

سنوں گا، اسی کے ذریعے سنوں گا۔“ وہ آگے بڑھ گیا۔

اسے چکر سا آ گیا۔

وہ دو مردوں کی ”انا“ کا مسئلہ بن چکی تھی۔ ایک مرد کی انا کتنی بڑی قیامت ہوتی

ہے۔ گجاکہ دو مردوں کی ”انا“ کا طوفانی سیلاب۔

جانے کیا کیا بنے گا؟

کیا کچھ تباہ ہوگا؟

”میں تو ازلی الحق ہوں شاید۔ مجھے آج تک فیصلہ ہی کرنا نہیں آیا۔ مجھے اہم اور غیر

اہم کا فرق نکالنا ہی نہیں آیا آج تک۔“ اس نے خود کو مورد الزام ٹھہرایا۔

ملازم ہاتھ باندھے منتظر کھڑا تھا۔ جسے ابھی کچھ دیر پہلے بڑے مان سے بتایا تھا کہ یہ

میرا گھر ہے۔ وہ جھل سی ہو گئی۔

”میں جارہی ہوں بابا! آپ امتحان میں نہ پڑیں..... لیکن یہ واقعی میرا گھر ہے، فی

الحال جسے میں نے خود توڑنے کا احقنا فیصلہ کیا ہے۔ میں اپنے مستقبل کی تباہی کی خود ذمے دار

ہوں۔“ اشک روانی سے بہہ نکلے۔

بوڑھے انسان کا دل مضطرب ہو گیا۔

مگر اس کا مقام یہ نہیں تھا کہ وہ اس سے سوالات کر سکتا اور حالات کی تہ تک پہنچتا۔

”توبہ آ پا جان۔ بس اسی کی کسر باقی تھی۔“ عطیہ بیگم نے ناگواری سے کہا۔
 ”ویسے دے کیسے دی؟ وہ تو خاندان میں گھلنا ملنا بھی پسند نہیں کرتے؟“ اب انھوں نے تعجب کا اظہار بھی کیا۔

سادہ خاتون خاموشی سے بیٹھی پان بناتی رہیں۔ ان پر جیسے بہن کے جملوں کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا۔

”صلاح الدین بھائی (دونوں کے مشترکہ بہنوئی) بھی کہہ رہے تھے کہ آپا جان تو اپنے گھر کو چڑیا گھر بنانے پر تکی ہوئی ہیں۔ پہلے ایک پرانی یتیم لڑکی کو بیٹی بنا کر گھر میں لے آئیں، پھر محمود بھائی کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ چلو خیر وہ تو ہے ہی ہمارا خون اور اس کا سہارا ہمارے آپ کے علاوہ بن بھی کون سکتا تھا؟ اب وہ وحیدہ کی بیٹی.....“

”بس کرو عطیہ..... اس میں برا ماننے کی کون سی بات ہے۔ وہ بھی ہماری اپنی بچی ہے، زیادہ دور کا رشتہ تو نہیں ہے۔“ انھوں نے بہن کی طرف پان بڑھایا۔

”وحیدہ کی حالت تم دیکھتیں، مرتے مرتے بچی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔ چھوٹا سا کاروبار ہے۔ کہاں گزرا رہتا ہے آج کل اتنے بچوں کے ساتھ اتنی تھوڑی آمدنی میں۔ پھر ماشاء اللہ وحیدہ کے اوپر تلے پانچ بیٹیاں ہو گئیں۔ اب میں بے اولاد، سونا گھر میرا، کیسی بہار ہے ان بچوں سے۔ اوپر سے اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ اگر مشکل میں انسان کسی کے کام آ جائے تو کیا برائی ہے؟ ان بچوں نے میری گود میں پلنا تھا۔ شاید اسی لیے قدرت نے میری گود خالی رکھی۔ اس کی حکمت کون سمجھ سکتا ہے؟ لوگوں کو شاید اس لیے برا لگتا ہے کہ کہیں یہ بچے میرے مال و دولت کے وارث نہ ٹھہریں۔ میں اپنے مال و دولت کی مختار ہوں، پاگل نہیں ہوں، اگر میری وجہ سے کسی کو آسائیاں مل جائیں تو میری زندگی کا رآمد ہو جائے۔ ان بچیوں کا کیا ہے۔ کل کلاں کو یہ تو پرانی ہو جائیں گی۔ اپنی قسمت کا ساتھ لے جائیں گی۔ شاید ان کی قسمت سے خدا نے مجھے یہ سب کچھ دیا ہو۔“ وہ بڑی خدا پرست خاتون تھیں۔ ہر بات میں خدا کی مصلحت ڈھونڈ لیتی تھیں۔

”لیکن یہ بھی تو سوچیں۔ محمود بھائی کی اور عبید بھائی کی جنم جنم کی دشمنی چل رہی تھی۔ محمود بھائی نے ہمیشہ عبید بھائی کو غاصب سمجھا۔ وحیدہ کے پیچھے جو دشمنی چلی تھی اس نے کتنے موڑ لیے اور میں تو سمجھتی ہوں کہ اسی بات نے محمود بھائی کی جان لی تھی۔ اندر ہی اندر سلگتے رہے وہ۔“

اسی ہر وقت کے جلنے کڑھنے نے انھیں کئی بیماریاں لگا دی تھیں۔“ عطیہ بیگم تلی بیٹھی تھیں کہ بہن کو احساس دلا ہی دیں کہ ان کا یہ اقدام سنگین غلطی ہے۔

”رات گئی، بات گئی، عطیہ۔ دشمنی عبید کی محمود کے ساتھ تھی۔ اللہ بخشے اسے، ہمارے ساتھ تو نہیں اور پھر بڑوں کی دشمنیوں کو ان کے بچوں کے کھاتے میں کیوں ڈالیں؟“

”مرضی ہے آپ کی۔ مگر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کچھ اچھا نہیں ہوا۔“
 ”اب بد فالیں منہ سے مت نکالو، عطیہ! خدا نے چاہا تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ دعا کرو ان بچوں کی خوشیاں دیکھوں۔ میرے آنگن کی بہاریں قائم رہیں۔ خدا مجھے توفیق دے، جو ذمے داریاں میں نے لی ہیں ان سے خوش اسلوبی سے عہدہ برا ہو سکوں۔“

بہن کے کڑدے لہجے کے باوجود ان کا قتل اسی طرح قائم تھا۔ ہر بات کا جواب بہت رसान اور ٹھنڈے انداز میں دے رہی تھیں۔

عطیہ بیگم کو احساس ہو چلا تھا کہ ان کی بہن ان کی ہر بات کو معمولی جان کر کوئی اثر قبول نہیں کریں گی۔ چپ چاپ پاؤں میں چپل ڈالنے لگیں۔

”ابھی سے جارہی ہو۔ کھانا کھا کر جانا عطیہ! اس بھری دھوپ میں کہاں جاؤ گی؟“
 ”نہیں آپا جان! کھانا دانا تو تیار کر کے چلی تھی۔ پھر سہی۔“

انھوں نے چھوٹی بہن کے موڈ کا اندازہ کر کے مزید اصرار مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے چھالیا کترنے لگیں۔

ناملکہ کی ماں تو موجود تھی مگر بیوگی کی زندگی مزدوری مشقت کر کے کاٹ رہی تھی۔ ناملکہ کی ماں سے آپا جان کا کوئی خاندانی و قلبی تعلق نہیں تھا۔ بس اس سے کپڑے وغیرہ سلايا کرتی تھیں۔ برسوں سے وہ ان کے کپڑے ہی رہی تھی۔

اس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر، اپنی فطری خدا ترسی سے مجبور ہو کر اس کی بیٹی کو گود لے لیا تھا۔ گود کیا لیا تھا، اچھی بھلی پانچ برس کی بچی تھی، جب وہ اسے اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ انھوں نے تو اس کی ماں کو بھی اپنے گھر میں ایک کمرہ دینے کی پیشکش کی تھی۔ مگر وہ بہت خوددار عورت تھی اس لیے کڑے سے کڑے وقت میں بھی کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا یا تھا۔

آپا نے اس کے انکار کے بعد اس کی خودداری اور غیرت کو مزید امتحان میں نہیں ڈالا تھا۔ ناملکہ کو بھی یہ کہہ کر اپنے ساتھ لائی تھیں کہ ان کی بڑی آرزدہ تھی کہ ان کی کوئی لڑکی ہوتی اور

وہ اسے اعلیٰ تعلیم دلاتی، ہنرمند بناتیں، بڑے ناز سے پالتیں۔ نالکھ کی ماں نے شاید یہ سوچ کر ہامی بھری تھی کہ اس کی بیٹی کلفتوں سے دور خوش باش زندگی گزار سکے گی اور بد قسمتی کی آگ سے دور رہے گی۔ جس میں وہ خود برسوں سے جمل رہی تھی۔ اپنی بیٹی کا خوشحال مستقبل اس کے سامنے تھا کہ وہ ساجدہ بیگم سے خوب واقف تھی اور اس بات سے بھی کہ سونی گوڈ کا دکھ ان کی زندگی پر چھا کر رہ گیا ہے۔ اس نے اتنی بڑی قربانی بیٹی کے شکھ کے عوض قبول کر لی تھی بلکہ وہ اسے اپنی بیٹی بنا رہی تھیں۔ عزت دے رہی تھیں، برابری دے رہی تھیں۔

سرفراز احمد تو ان کا اپنا سا بھتیجا تھا۔ بھائی نے بڑی مختصر زندگی پائی تھی۔ شادی کے پانچ سال بعد تو ان کے ہاں کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی اور جب سرفراز کی پیدائش کا وقت آیا تو وہ خود اس جان فانی سے رخصت ہو گئے۔ شاید یہ بیوگی کا دکھ تھا جو سرفراز کی ماں کو بے ہمت اور کمزور بنا گیا۔ وہ سرفراز کی پیدائش کے چند منٹ بعد ہی اپنے شوہر سے جاملی تھیں اور یوں وہ آنکھیں کھولنے سے پہلے ہی ساجدہ بیگم کی بانہوں میں آ گیا تھا۔

جب وہ سات برس کا ہوا تو ساجدہ بیگم کے گھر میں ایک نئے وجود کا اضافہ ہو گیا۔ یہ نیلوفر تھی۔ اس کا نام ساجدہ بیگم ہی نے رکھا تھا۔

ساجدہ بیگم کا دوستانہ وحیدہ سے بچپن سے تھا۔ وہ انھیں بہت پسند تھی۔ وہ دل سے اپنی سہیلی کو بھابی بنانا چاہتی تھیں مگر عبید الرحمن نے درمیان میں آ کر سارا کھیل بگاڑ دیا۔ یہاں سے ان کے بھائی محمود اور عبید الرحمن کی دشمنی کا آغاز ہوا اور ساجدہ بیگم پر یہ عقدہ کھلا کہ ان کا بھائی وحیدہ کو جنون کی حد تک چاہتا ہے۔ مگر عبید الرحمن کی اس وقت کی خوشحالی جیت گئی۔

محمود کا موقف یہ تھا کہ عبید الرحمن کیونکہ ان کا کزن تھا اس لیے دوستی بھی تھی اور وہ اس راز سے واقف تھا کہ وہ یعنی محمود، وحیدہ کو کتنی شدت سے چاہتا ہے۔ اس تمام صورت حال سے واقف ہونے کے باوجود اس نے وحیدہ کا طلب گار بن کر اس پر شب خون مارا ہے۔

اس دشمنی کا آغاز ہوا تو بڑھتی چلی گئی۔ حالانکہ محمود کی شادی بھی ایک خوبصورت لڑکی سے ہو گئی جو بہت معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر محمود کے دل کو قرار نہ مل کر دیا۔..... آئیڈیل پرست انسان یا تو آئیڈیل پالیتا ہے یا مٹ جاتا ہے۔

وہ کوئی اتفاقی اور اچانک ملنے والی چیز کو برداشت نہیں کر پاتا۔

وہ خواب دیکھنے والا اور منصوبہ ساز ہوتا ہے۔

ہر کام مرحلہ وار کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہے۔

ایسا ہی آئیڈیل پرست انسان شاید محمود بھی تھا۔

وہ اپنے خواب سے ہٹ کر کچھ پانے اور ملنے کی تمنا نہیں رکھتا تھا۔

دشمنی بڑھی اور نفرت و کدورت انتہا کو پہنچی۔

ایک دوسرے سے بدظنی کی بناء پر خود ساختہ اور بے بنیاد الزامات بھی لگائے جانے لگے۔ عبید الرحمن ٹھیکیداری کرتے تھے۔

ان کو شکایت ہوئی کہ محمود اپنے پولیس آفیسر سالے کی بدولت انھیں معاشی بد حالی کی طرف لے جا رہا ہے۔ کیونکہ وہ خود داری ٹھیکیداری کرتا ہے اس لیے اثر و رسوخ کی بنا پر پہلے سے ہی ٹینڈر کے ”راز“ سے واقف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اسے پہلے سے پتہ چل جاتا ہے کہ کم سے کم ٹینڈر کی حد کیا ہے۔ لہذا جو بھی ٹینڈر منظور ہوتا ہے، وہ محمود کا ہوتا ہے۔ جب عبید الرحمن شدید معاشی بحران کا شکار ہوئے تو نفرت کبھی نہ مٹنے والی سیاہی بن کر ان کے قلب پر پھیل گئی۔ محمود کی نفرت کی وجہ ”وحیدہ“ تھی۔

اور عبید الرحمن کی کدورت کا سبب ان کا معاشی بحران۔

دونوں طرف کے پلڑے متوازن ہو گئے اور رتی، ماشے کی بھی گنجائش نہ رہی۔ ہر چند کہ ساجدہ بیگم نے ”امن کے سفیر“ والے متعدد وفاق انجام دیے۔

عبید الرحمن بھی ساجدہ بیگم کی بڑی بہن کی طرح عزت کرتے تھے۔ مگر عبید الرحمن اور محمود کے دلوں میں بال برابر بھی نرمی کا اثر نہیں پایا گیا۔ اب وہ اٹل ہو چکے تھے۔ وہ تو شاید کسی طور پر اپنی نوازائیدہ بچی ساجدہ بیگم کے حوالے نہ کرتے کہ ان کے دشمن کا بیٹا بھی انہی کی چھت کے نیچے پل رہا تھا۔

مگر بیوی کی نقابت اور شدید بیماری، چار بیٹیوں اور ایک معصوم بیٹے کا ساتھ پہلے سے تھا۔ پھر اس پر معاشی پریشانی بھی۔

جب ساجدہ بیگم نے بڑے پیار سے نیلوفر کو سینے سے لگا کر عبید الرحمن سے اپنی بیٹی بنانے کی درخواست کی تو پریشانی میں یہی حل سوچا کہ بچی ان کی گود میں دے دی جائے۔ وہ ساجدہ بیگم کی شخصیت اور پیار کو تسلیم کرتے تھے، بلکہ پورا خاندان ہی تسلیم کرتا تھا جس طرح وہ نالکھ اور سرفراز کو ناز و نعم سے پال رہی تھی، اس طرح تو خاندان میں دوسرے بچے اپنے حقیقی

والدین کے پاس بھی نہیں پل رہے تھے۔ سہولتوں سے مزین گھر تھا اور بہترین تعلیمی اداروں میں وہ تعلیم پا رہے تھے۔ اچھا کھاتے اور عمدہ پہنتے تھے۔ خوش رہتے تھے اور بلا کی خود اعتمادی کے مالک تھے جس کا اعتراف بھی کرتے تھے۔

وحیدہ بیگم نے بھی شاید اسی لیے نیلوفر کو ان کی گود میں دے دیا کہ ان کی بچی بھی ساجدہ بیگم کے گھر میں آسودگی کی زندگی گزار لے گی کہ وہاں محض معاشی آسودگی ہی نہیں ہے بلکہ ساجدہ بیگم کی بے پناہ شفقتیں اور بے کراں محبتیں بھی ہیں۔ پھر انھیں یہ بھی ڈرتھا کہ ان کی شدید بیماریاں کہیں ان کی جان نہ لے لیں، بہتر یہی ہے کہ ان کی یہ معصوم بچی پہلے ہی محفوظ ہاتھوں میں ہو۔

اور یوں نیلوفر ساجدہ بیگم کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن گئی۔

نانکد اور سرفراز تو اسکول چلے جاتے تھے۔

اب نیلوفر ہی ان کی توجہ کا مرکز اور دل کا بہلاوا تھی۔ بقول عطیہ بیگم اور دوسرے لوگوں کے، آپا جان دوسری شادی کر لیتیں تو شاید خدا انھیں اولاد سے نواز دیتا۔ مگر وہ دوسری شادی پر کبھی آمادہ ہوئی تھیں، نہ ہوئیں۔ ان کا ایک جواب تھا۔ ”بس جو میرا ساتھی تھا مل گیا تھا اور دل کا ساتھی بھی بن گیا تھا۔ اب کسی کی جگہ کسی اور کو دینے کو دل نہیں چاہتا اور وہ جو اتنی دولت میرے حساب میں چھوڑ گیا ہے، میں کسی غرض مند اور لالچی کے حوالے کیوں کروں؟ کیوں نہ اس سے اچھے کام کروں۔

ان کا خیال تھا، وہ لوگ جو کنوارے رشتے ان کے لیے لارہے ہیں وہ سب مطلبی ہیں ورنہ کیا ضرورت پڑی کسی کو بیوہ سے شادی کرنے کی۔ کیا دنیا میں کنواری لڑکیوں کا کال پڑ گیا ہے؟ ہمدرد چپ ہو گئے، پھر کبھی نہ بولے۔ چند ایک نے تب بھی دبی زبان سے کہا تھا تو کسی رٹو دے ہی سے کر لیں ویسے بھی تو ادھر ادھر کے بچے سمیٹ کر پال رہی ہیں۔ کسی ایک ہی کے پال لیں۔ مگر یہاں وہ ”دل“ کا معاملہ رکھ دیتیں کہ ان کے دل میں سوائے اپنے مرحوم شوہر کے کسی کے لیے گنجائش نہیں ہے۔

دراصل وہ دوسری شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ اس کا اندازہ بھی ان کے ہمدردوں کو آخر کار ہو ہی گیا تھا۔

ٹیلی فون کی بیل کب سے بج رہی تھی۔ وہ باتھ روم میں تھا اور بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ وہ جلدی سے باتھ روم سے نکلا۔ گیلے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے وہ ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھا۔

”ہیلو؟“ اس نے ریسپور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں کہا۔

”ہیلو..... سرفراز بیٹے؟“ دوسری طرف وحیدہ بیگم تھیں۔

وہ الجھ سا گیا۔ ”جی فرمائیے؟“

”بیٹے جلدی سے نیلی کو بلا دو۔ اس کے باپ اس وقت باہر گئے ہوئے ہیں۔ وہ ٹھیک تو ہے نا؟“

”جی!“ اس نے حیران ہو کر ریسپور کو گھورا۔

”بیٹے نا تم نہیں ہے، جلدی سے نیلی کو بلا دو۔“ دوسری طرف شدید بے چینی تھی۔

”جی..... نیلی.....؟ اچھا۔ اچھا..... وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے۔“ اسے فوری یہی جواب سوچھا۔

”کہاں چلی گئی؟“ دوسری طرف پریشانی تھی۔

اس نے آہستگی سے ریسپور کریڈل پر ڈال دیا۔

کہاں چلی گئی؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ کل دوپہر کو تو اس نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ عبید الرحمن کے ہاں نہیں گئی تو پھر کہاں چلی گئی؟ وہ بے حد پریشان ہو گیا۔ یہ کیا ہو گیا؟ وہ گرنے کے انداز میں پاس پڑی کرسی پر ڈھکے گیا۔ عجیب لڑکی ہے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ خود ہی تو خلع مانگا پھر خود ہی آ گئی۔

کیا وہ اپنے ماں باپ سے تعلق توڑ کر آئی تھی؟ مگر کیوں؟

جب وہ عدالت میں اس کے مقابل آ گئی تھی پھر اس نے یہ سب کیوں کیا؟

اس کی نظروں کے سامنے تمام مناظر ماضی کی جھلکیاں دکھانے لگے۔

اس بے وقوف سی لڑکی کو اس نے نوٹ کر چاہا تھا۔ وہ جو اس سے بہت دور دور رہتی تھی۔ ڈری ڈری، سبھی سبھی۔ اس کے غصے سے تو سب ہی ڈرتے تھے مگر وہ تو کچھ زیادہ ہی خوف زدہ رہتی تھی۔ اس احمق لڑکی کو ادراک نہیں تھا۔ کوئی کتنی شدتوں سے اسے چاہا کرتا ہے۔

نانکد کی شادی کے ہنگاموں میں آخر اس پر عقدہ کھل ہی گیا تھا۔ وہ جو اس سے دور

دور ڈری ڈری رہتی ہے۔ وہ خود اس کے سلسلے میں تقدیر سے ڈرا ڈرا رہتا ہے۔

اس روز نائلہ آپا کی مہندی تھی۔ جب وہ مہمانوں کی بھیڑ سے پریشان ہو کر اس کا کمرہ خالی دیکھ کر وہ تیار ہونے چلی آئی تھی۔

مگر تھوڑی دیر بعد پریشان پریشان ہی گھنٹوں کے بل جھک کر کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔ کبھی قالین پر ہاتھ مارتی، کبھی اپنا دوپٹہ پھیلا کر دیکھتی۔ کبھی اپنے جسم پر ہاتھ پھیر کر کچھ ٹٹولتی۔

”کچھ کھو گیا ہے؟“ وہ چپکے سے اس کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔

”آں..... ہاں۔“ وہ بے تحاشا چونک اٹھی تھی بلکہ گھبرا بھی گئی تھی۔

”جی میرا ایک سونے کا بُندہ گر گیا ہے۔ امی نے مجھے آج پہننے کے لیے سیٹ دیا تھا۔“ وہ روپائی سی ہو گئی۔ ساجدہ بیگم کو وہ سب امی ہی کہتے تھے۔

”کہاں گرا دیا؟“ اس نے بھی زمین پر نظر ڈالی۔

”یہیں تھا..... میری مٹھی میں تھے دونوں بُندے۔“ وہ پریشانی سے بولی۔

”صرف بُندے ہی تھے مٹھی میں..... کسی سرفراز نام کے آدمی کا دل تو نہیں تھا مٹھی میں بُندوں کے ساتھ۔“ اس کا لہجہ شریر مگر دھیمہ تھا۔

”جی.....؟“ اس کی پریشانی سے پسینا پھوٹ نکلا..... وہ اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہیں تھی کہ جو اس سے سخت بیزار رہتا ہے..... اسے ناپسند کرتا ہے۔ وہ ابھی ابھی کیا کہہ گیا تھا۔ بات من چاہی تھی۔ وہ نظریں جھکا کر کھڑی رہ گئی تھی۔ بُندے دندے سب ذہن سے اڑنچھو ہو گئے..... اب تو وہ بھاگنے کا راستہ تلاش کرنے لگی تھی۔

اسے اس کی بے چارگی پر ترس آ گیا۔

”جب یہاں لائی تھیں تو یہیں ہوگا۔ جائے گا کہاں؟ آؤ ڈھونڈتے ہیں۔“ وہ صلح

جو انداز میں بولا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بیڈ کے پاس پڑا مل گیا۔ سرفراز نے اٹھا لیا اور ہتھیلی پر سجا کر اس کے سامنے پیش کیا۔

”ایک ذرا سے بُندے کے گم ہونے پر اتنی پریشانی؟ مجھے دیکھو دل گنوا کر بھی پریشان نہیں ہوا۔“ وہ اس کے بے حد قریب کھڑا تھا اور نیلوفر کی جان پر بن رہی تھی۔

وہ اس کی ہتھیلی سے بُندہ اٹھانے کی ہمت بھی نہیں پا رہی تھی خود میں۔ یہ اس پر اچانک کیسی افتاد آ پڑی تھی۔

”اگر اجازت ہو تو ڈال دوں کان میں؟ اگرچہ اتاڑی ہوں مگر اب مجھے پریکٹس شروع کر دینی چاہیے۔“ وہ کتنا بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ خاموشی خاموش اور اکھڑ سا انسان۔ جس کا خشک چہرہ دیکھ کر اس کا سانس اٹکنے لگتا تھا۔

سبز بناری سوٹ میں دو چوٹیاں سینے پر پھیلانے، وہ ساکت سی کھڑی تھی۔ دوپٹہ دائیں شانے سے پھسل کر قالین پر جا پڑا تھا۔

اس نے آہستگی سے اس کے کان میں آویزہ ڈال دیا۔ نیلوفر کی تو حالت غیر ہو گئی۔ نہ جائے ماند نہ پائے رفتن والی کیفیت اس پر غالب تھی۔

”کم از کم شکریہ تو ادا کر دو۔ اگر برا لگا ہے تو گالیاں ہی سنا دو۔“

”پلیز، مجھے جانے دیں۔“

”تو چلی جاؤ، میں نے تمہیں پکڑا ہوا تو نہیں ہے۔“ وہ مسکرا دیا۔ اس کی پریشانی سے بہت محظوظ ہو رہا تھا۔

”سامنے سے نہیں پلیز؟“

”ہنا دو چٹان تو نہیں ہوں۔ دن رات تمہارے عشق میں جل کر ویسے ہی کمزور ہو گیا ہوں۔“ وہ مزید شریر ہوا۔

اب تو مزید کھڑا ہنا دو بھر ہو گیا تھا۔ وہ سائیڈ میں جگہ پا کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ سارے حواس، ساری چوڑیاں وہ جیسے اس کمرے میں بھول آئی تھی۔

پھر سرفراز کی زندگی میں بہاریں آئی تھیں۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ بازی جیت چکا ہے۔ اسے ٹھکرایا نہیں گیا ہے.....

مگر جب چند رومان پرور واقعات اور اس کی طرف سے یقین کر لینے کے بعد اس نے ساجدہ بیگم کے سامنے مدعا پیش کیا تو وہ پریشانی کے عالم میں سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

پھر اس سے کہا تھا:

”بیٹے! یہ خوشی کی بات ہے کہ تم نے نیلوفر کا انتخاب کیا ہے۔ میری بھی یہی تمنا تھی۔ مگر تم جانتے ہو نیلو کے باپ کی تمہارے باپ سے کس قدر دشمنی تھی۔ مجھے پورا یقین ہے، وہ

”کبھی بھی اس پر راضی نہیں ہوں گے۔ میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“
”مگر نیلو کو تو آپ نے پالا ہے۔ آپ اس کی ذمہ دار ہیں اور پھر“ وہ ذرا ہلکا۔

”نیلو خود اس بات پر آمادہ ہے۔“

ساجدہ بیگم چونکیں۔ ”ہیں! وہ اتنی چپ چاپ سی لڑکی کس وقت یہ مدارج طے کر گئی؟“ اگرچہ انھیں بھی یہ بات سن کر تعویذ سی ہوئی تھی۔

”پھر بھی..... بیٹے! اس کے باپ سے پوچھنا بے حد ضروری ہے۔ اللہ رکھے وہ حیات ہیں۔ اور پھر نیلو سے بھی پوچھوں گی، اپنی تسلی کے لیے۔“

”اس کے والد کے بارے میں تو آپ اندازہ لگا ہی چکی ہیں۔ میرا خیال ہے، آپ صرف نیلو سے پوچھ لیں۔“

وہ سمجھ سا گیا تھا۔ اسے ان کھٹائیوں کا احساس نہیں تھا۔

”تم جی چھوٹا نہ کرو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ انھوں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی شفقت سے کہا۔

اور پھر۔

وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ عبید الرحمن تو ہتھ سے اکھڑ گئے تھے۔

”آپ نے ایسا سوچا ہی کیوں؟ آپ نے اسے پرورش کیا ہے، آپ اس کی ذمہ دار ہیں، اس پر آپ کا پورا حق ہے۔ اگر آپ اسے خاکروب سے بیاہ دیں گی تو میں اعتراض نہیں کروں گا۔“

انھوں نے ایک خاکروب کو سرفراز پر ترجیح دے کر انھیں معاملے کی سنگینی کا احساس دلادیا تھا۔

ہر چند انھوں نے عبید الرحمن کو بہت سے دلائل دیے تھے کہ دشمنی اس کے باپ سے تھی، بچے کا کیا قصور مگر سب بے کار اور لا حاصل رہا۔

اور جب انھوں نے اپنے چہیتے بھتیجے کی بڑی حالت دیکھی تو ان سے رہا نہ گیا۔ ایک شب وہ نیلوفر کے پاس گئیں اور اس کا عندیہ معلوم کیا۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

”بیٹی تمہاری چپ سے معاملہ طے نہیں ہوگا۔ تمہاری شادی کہیں نہ کہیں ہونا ہی ہے، نہ تمہیں سدا میرے ساتھ رہنا ہے نہ اپنے ماں باپ کے پاس۔ اگر تم راضی ہو تو میں تمہارا نکاح

کیے دیتی ہوں۔ جانتی ہوں، اس کے بعد تمہارے باپ کی دشمنی میرا مقدر ہوگی۔ مگر میں تم لوگوں سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ میں ہر قیمت پر تمہاری خوشیاں چاہتی ہوں۔ تم عاقل و بالغ ہو۔ قانون اور شریعت دونوں تمہیں تمہارا حق دیتے ہیں۔“

اس نے ساری عمر ساجدہ بیگم کے ساتھ گزاری تھی۔ اسے صرف ان ہی سے محبت بھی تھی اور انیت بھی۔ اسے صرف انہی کے فیصلوں سے دلچسپی تھی جنہوں نے اسے دنیا کے ہر عیش و آرام اور چاہت سے نوازا تھا۔

اور پھر بات اس کے اپنے دل کی بھی تھی۔ وہ جو اس کی خاموش پجاری تھی۔ جبکہ اسے تو اس کا احساس بھی نہیں تھا کہ وہ بھی اس کے لیے اپنے دل میں طوفان چھپائے بیٹھا ہے۔ اس نے خاموشی سے اپنی رضامندی دے دی۔

ساجدہ بیگم نے بڑا جرأت مندانہ قدم اٹھایا تھا۔ خاموشی سے نکاح ہو گیا۔ نکاح میں کل دس افراد تھے۔ نائلہ اور اس کا شوہر، نائلہ کی ماں، دو نیلوفر کی سہیلیاں اور دو سرفراز کے دوست اور ایک سرفراز کے ماموں، ذلہا ذلہن اور ساجدہ بیگم۔ انہی افراد میں سے دو دو گواہ دونوں طرف سے بن گئے تھے۔ انہی میں سے وکیل۔

اور یوں وہ ہمیشہ کے لیے ایک ہو گئے۔ خوش اور مطمئن دونوں تھے مگر یہ خوشی چند روزہ ثابت ہوئی۔ ساجدہ بیگم خون کے سرطان میں مبتلا ہو کر چند مہینوں میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔

اس افتاد پر سب ہی پریشان ہوئے۔ گھر کا نظام ٹکٹ ہو کر رہ گیا۔ چہلم تک تو نائلہ گھر میں رہیں پھر وہ بھی چلی گئیں۔

اور عبید الرحمن اپنی بیٹی کو آ کر لے گئے۔ وہ اسے روکنا چاہتا تھا۔ روکنے کا حق رکھتا تھا مگر وقتی طور پر مصلحتاً خاموش ہو رہا کہ اب اس سے بندھن بہت پکا بندھ گیا تھا۔ سب واہموں کو جھٹک کر اس کو باپ کے ساتھ جاتا دیکھتا رہا۔

ہر چند کہ اس کے بعد وہ خاصا پریشان رہا کہ فون بھی نہیں کر سکتا تھا اور خط بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔ وہ اسے جاتے ہوئے ہدایت کر گئی تھی کہ وہ عجلت میں کام نہ بگاڑ ڈالے، ساتھ ہی تسلی دی تھی کہ وہ بے فکر رہے، کچھ نہیں ہوگا۔

اور پھر جانے کے بعد اس نے موقع نکال کر سرفراز کو فون بھی کیا تھا اور تسلی دی تھی کہ

وہ ماں کو راز دار بنا کر معاملہ سلجھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے ماں کو بتا دیا ہے کیونکہ وہ اس کے لیے آنے والا ایک پیغام منظور کر رہے تھے۔ امی کا ردِ عمل تو شدید نہیں تھا مگر وہ پاپا کی طرف سے فکر مند ہیں۔

اسے کچھ اطمینان سا ہوا تھا۔

پھر کافی دن گزرنے کے بعد اس کا فون آفس میں آ گیا تھا۔

وہ خاصی پریشان تھی اور کہہ رہی تھی کہ امی نے پاپا کو بتا دیا ہے کیونکہ صورتِ حال ہی ایسی ہو گئی تھی۔ پاپا سخت غصے میں ہیں اور آپ کے ابو کا کیا دھرایا کر رہے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ان کی معاشی بد حالی کے ذمے دار بھی محمود انکل تھے۔ جس کی وجہ سے انھوں نے اپنی زندگی کا قیمتی وقت سخت مصیبتوں میں گزارا اور بہت جدوجہد کے بعد اس عمر میں وہ دوبارہ خوشحالی حاصل کر سکے ہیں اور انھیں یقین ہے کہ محمود انکل نے ان کی زندگی برباد کی تھی۔ وہ کسی قیمت پر بھی آپ کو اپنا داماد قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔

وہ تو بے اندازہ پریشان ہوا تھا۔

ابھی وہ کوئی حل سوچ ہی رہا تھا کہ عدالت سے ”سمن“ آ گیا جس میں بتایا گیا تھا کہ مسماۃ نیلوفر خلع چاہتی ہے کیونکہ سرفراز کے ساتھ اس کا نکاح زبردستی کیا گیا تھا۔

اس کے سامنے تو زمین آسمان گھوم گئے۔

کسی طور یقین آ کر نہیں دیا کہ نیلوفر کی طرف سے یہ سمن آیا ہے۔

اپنے ہر شک کو مٹانے ہی وہ عدالت گیا تھا۔

مگر وہاں یقین کی سب جمع پونجی لٹ گئی تھی۔ جب نیلوفر نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔ وہ سرفراز سے نہ محبت کرتی ہے نہ اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہے کیونکہ اس کا نکاح زبردستی کا نتیجہ ہے۔

اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔ محبت بھری نظریں بدل چکی تھیں۔ وہ اس سے نظریں چرا رہی تھی۔ اس کی کیفیت کیا تھی۔ سرفراز کو جذبات کے اس بھونچال میں کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ اپنے جنون و جذبات کا اظہار اس نے یوں کیا تھا کہ اس کے رخسار پر اپنی پانچوں انگلیوں کے نشان چھوڑ دیے تھے۔

اسی بنا پر اس نے نیلوفر کو گھر سے نکال دیا تھا۔

اور اب وحیدہ بیگم کا ٹیلی فون آیا تو ایک نئی مصیبت سامنے آ کھڑی ہوئی۔

آخر یہ سب چکر کیا ہے؟

اس نے میرے سامنے ہی تو بیان دیا تھا۔

پھر وہ اس کی جانب بھاگتی ہوئی کیوں آئی تھی؟

پھر وہ گھر میں کیوں چلی آئی تھی؟

اسے عبید انکل نے یہاں تک آنے ہی کیوں دیا تھا۔ وہ تو خود اس دقتِ عدالت میں

موجود فاتحانہ نظروں سے اسے ذلیل ہوتا دیکھ رہے تھے۔

اور اب آخر وہ کہاں چلی گئی؟

کچھ کچھ معاملہ وہ سمجھ چکا تھا۔

وحیدہ بیگم کا یہ کہنا کہ اس کے باپ باہر گئے ہوئے ہیں، جلدی سے نیلی کو بلا دو۔ اس

کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سب عبید انکل کے جبر کا نتیجہ تھا۔

اور وہ ان کی مرضی کے خلاف شاید ان سے لڑ کر اس کے پاس آئی تھی۔ مگر یہ قدم اس

نے پہلے کیوں نہیں اٹھایا؟

وہ از حد اضطراب کا شکار تھا۔

وہ تو اس کا سب کچھ تھی۔ اب اس کی وجہ سے ہی تو در بدر تھی۔ اس کی مشکل یہ بھی تھی

کہ وہ حقائق سے وحیدہ بیگم کو بھی مطلع نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کا ذمے دار اب وہ خود تھا۔ کوئی

پریشانی ہی پریشانی تھی۔



پورے تین ہفتے گزر گئے تھے۔ اس نے کہاں کہاں کی خاک نہ چھان ماری تھی اور

آج جب وہ گاڑی پورچ میں لے جانے کے لیے موڑ رہا تھا تو وہ سیاہ چادر میں برابر والی کوٹھی کا

گیٹ کھول کر باہر نکلتی نظر آئی۔

پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ نیلو ہی ہے مگر اسے یقین کرنا پڑا۔ وہ کار سمیت

اس کے سر پر جا پہنچا۔

وہ چونک کر ایک طرف ہو گئی۔ پھر اس کی سمت نظر ڈال کر اس طرح آگے بڑھ گئی

گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔

میں سوال داغ دیا۔

”میں ان کے بچوں کو پڑھاتی ہوں اور انہی کی انکسی کے ایک کمرے میں بطور کرایہ وار رہتی ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”کیا، کچھ پوچھا نہیں ان لوگوں نے؟“ وہ حیران ہوا۔

”انہیں میں نے سب بتا دیا ہے۔“

”گویا مجھے ذالالت کی انتہا پر پہنچا دیا ہے۔“ وہ بولا۔

”یہ بھی آپ ہی کا کیا دھرا ہے۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ یہ سب بابا کی زبردستی کی وجہ سے ہو رہا ہوگا۔“ وہ بیڈروم میں پہنچ کر شکایتی انداز میں بولی۔

”اور تم یہ قدم پہلے نہیں اٹھا سکتی تھیں۔“ اس نے بھی جواب شکوہ داغا۔

”میں خود میں باپ کے مقابل میں آنے کی ہمت نہیں پاتی تھی۔ پتہ نہیں رازی! لوگ اپنے جذبات اور انا کی بھینٹ بے قصور کو کیوں چڑھا دیتے ہیں۔ اپنی عارضی پریشانیوں سے تنگ آ کر اپنے بچے دوسروں کو کیوں دے دیتے ہیں۔ رازی! لوگ فرض نہیں پہنچاتے تو حق کیوں مانگتے ہیں؟ نفرتیں کرتے ہیں تو نشانہ غیر متعلقہ لوگوں کو کیوں بناتے ہیں؟ جذبات میں انصاف کے لمحے تسخیر نہیں ہوتے۔ ہمارے چاہنے والے اتنے خود غرض اور بے انصاف کیوں ہوتے ہیں؟ اپنی گم گشتہ دشمنیوں کے عوض بے گناہ کی پوری زندگی تادان میں کیوں دے دیتے ہیں؟“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”اگر میں اپنے والدین کا فرض تھی تو اتنے سالوں میں انھوں نے اپنے فرض سے غفلت کیوں برتی؟

اگر انھوں نے میری ذمہ داری امی (ساجدہ بیگم) کو سونپی تھی تو ان کے فیصلے کو کیوں تسلیم نہیں کیا تھا۔

محمود انکل کا کیا یا بابا کا کیا اگلی نسل کس جرم کی پاداش میں بھگتے؟

یہ لوگ ساری عمر دانائی کا منہج سمجھتے ہیں خود کو۔ اور نہیں جانتے کہ جذبات دانائی کا رنگ بھی بن جاتے ہیں۔

اور رنگ آلود دانائی انصاف نہیں کر سکتی۔

آپ کو کیا پتہ مجھے کس طرح اور کیا کیا کہہ کر عدالت تک لایا گیا۔ مگر آپ پر نظر

وہ دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلا اور اسے جالیا۔

”اے محترمہ! کیا ڈراما ہے یہ؟“

”یہ ڈراما نہیں، حقیقت ہے۔“ وہ ترشی سے کہہ کر پھر چل پڑی۔

”آپ اس گھر میں کیا کر رہی تھیں؟“

”پیٹ پال رہی ہوں اپنا۔ انسان ہوں۔ کھانا پینا بھی تو ضروری ہے جب تک

زندگی ہے۔“ وہ پھنکار بولی۔

”چہ خوب، اور وہ جو تمہارے والد بڑے ٹھسے سے تمہیں لے گئے تھے۔ چار دن

روٹی بھی نہ کھلا سکے۔“ وہ استہزائیہ بولا۔ ”چلو گھر میں۔“ اس نے حکم دیا۔

”میرا کوئی گھر نہیں ہے۔“ اس کی آواز زندہ گئی۔

”دیکھو زیادہ..... گڑبڑ کرنے کی ضرورت نہیں۔ تین ہفتے ہو گئے ہیں نہ کھاتا ہوں،

نہ پیتا ہوں، نہ سو سکا ہوں۔“

”کس خوشی میں؟“ وہ زہر ہو رہی تھی۔

”خوشی میں نہیں، تمہارے غم میں۔“ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بولا۔

”اب برائے مہربانی اندر گھر میں چلو۔ ورنہ تم سے زیادہ ڈراما کرنا آتا ہے مجھے۔

مہسایوں پر انوغا کا مقدمہ دائر کر دوں گا۔ سمجھیں!“ وہ دھمکی آمیز انداز میں بولا۔

”میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ وہ اٹل لہجے میں بولی۔

”دیکھو زیادہ اکڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں کوئی فلمی ہیرو نہیں ہوں جو تمہارے

ساتھ سڑک پر نفعے گاٹا پھروں..... روٹھنے منانے کے۔ دیکھو اگر تم میرے ساتھ نہیں چلو گی تو

صبح اخبار میں میری خودکشی کی خبر پڑھو گی۔“

وہ از حد سنجیدہ ہو گیا۔

اس پر فوری اثر ہوا اور وہ چلتے چلتے رک گئی۔ ”آخر آپ کیوں مجھے عذاب میں

ڈالنے پر تلے ہیں۔ آپ بھی اور بابا بھی۔“ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

”اگر تم یہ سوال گھر کے اندر چل کر کرو تو میں جواب ایک ضمیمہ جتنا دوں گا لکھ کر۔“

وہ زچ سی ہو گئی اور واپس پلٹ پڑی۔

”پہلے تو یہ بتا دو کہ ساتھ والے گھر میں کیا کرنے آئی تھیں؟“ اس نے راستے ہی

”کیا ضرورت تھی؟“ وہ ناراضگی سے بولی۔

اور فون کی طرف بڑھ گیا۔

وہ وحیدہ بیگم سے مخاطب تھا۔ تمام تفصیل سے آگاہ کر رہا تھا۔

”اگر نیلو فر کو کچھ ہو جاتا تو اس کے ذمے دار سر اسر آپ لوگ ہوتے۔ اس کی حالت

بے حد خراب ہے۔ آپ آنا چاہیں تو آ جائیں۔ کسی باتیں کرتی ہیں آنٹی آپ، گھر ہے آپ

کا“ پھر ماذتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”اور آپ کی بیٹی کا۔“ مگر وہ اسی طرح خفگی کے انداز میں

بیٹھی رہی۔

”میں انکل کو منانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا..... آپ چھپ کر آ رہی ہیں؟ آ

جائیں، بے فکر رہیں، انھیں پتہ نہیں چلے گا اور نہ علیم کو۔“

وہ چادر اتار کر ہاتھ روم میں منہ دھونے چلی گئی تھی۔

واپس آئی تو وہ دٹامن کی شیشی کھولے کھڑا تھا۔

نیلو دوبارہ مہمانوں کی طرح کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس نے ایک ٹیبلٹ منہ میں ڈالی اور پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا۔ وہ چوری چوری

اسے دیکھ رہا تھا۔

”ناراض ہوا تنے دھواں دار مکالموں کے بعد بھی؟“ وہ گھونٹ بھر کر بولا۔

وہ چپ رہی۔

”دکھ درد ملے جس میں وہی پیارا امر ہے۔“

اس نے رفیع کے انداز میں اونچے سر سے نغمہ شروع کیا۔ انداز وہی شریعہ تھا جس

سے صرف وہی آشنا تھی۔

اسے اس قدر ”بے سُر“ پا کر نیلو نے بمشکل منہ پھیر کر مسکراہٹ چھپائی تھی۔



پڑتے ہی میں.....

وہ میرے باپ ہیں۔ اگر وہ آپ کی مخالفت میں کوئی عقلی دلیل دیتے تو میں دے

دیتی قربانی مگر محض ”باپ“ کی دشمنی کوئی دلیل نہیں تھی۔“

”اس کے باوجود بھی تم عدالت تک آ گئیں؟“ وہ نہ سکا، کہہ گیا۔

”آپ ان حالات سے واقف نہیں ہیں جن کا سامنا میں نے کیا ہے۔“ اس نے

اشک پونچھے۔ ”آپ کو کیا پتا جب حقیقی والدین سامنے ہوں اور محبتوں کو قرض کی صورت مانگ

رہے ہوں۔ جنم دینے کا خراج طلب کر رہے ہوں تو کسی کی پوزیشن کیا ہو جاتی ہے؟ مگر جب

عدالت میں آپ پر نگاہ پڑی تو مجھے یاد آیا کہ میں گذشتہ کئی مہینوں سے گھٹن کا شکار ہوں پھر بھی

مجھ میں ہمت نہیں ہوئی۔ لیکن آپ کا طمانچہ..... جو آپ کی محبت اور جنون کی علامت تھا۔ اس

نے جیسے میرے ہر سوائے ہوئے جذبے کو جگا دیا۔ میں آپ کے پاس چلی آئی کہ آپ میری

بات ٹھنڈے دل سے سنیں گے مگر آپ.....“ وہ اب ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

وہ واقعی بہت نادم سا تھا اور خود کو بہت بڑا مجرم سمجھ رہا تھا۔

”واقعی ہم انسان جذبات میں روشنی جیسا واضح انصاف نہیں کر پاتے۔ خود پرستی اور

محض انا کے گرداب میں پھنس کر اپنے سے وابستہ زندگیوں کو خواہ مخواہ سزا دیتے ہیں۔ وہ سوچ

رہا تھا۔

”کیا عبید انکل نے تمہیں گھر سے نکال دیا تھا؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ مجھے خود یہاں چھوڑ کر گئے تھے۔ یہ کہہ کر کہ آئندہ کبھی ان کے سامنے آنے کی

کوشش نہ کروں۔“

”امی بھی تھیں؟“

”ہوں؟“ نیلو نے چادر کے کونے سے آنکھیں صاف کیں۔

”اور علیم؟“

”نہیں، بھائی جان نہیں تھے۔“

”اور تم برابر میں رہنے لگیں؟“

”ہاں، یہ یقین تھا کہ یہ غیر ہیں مگر مدد کریں گے۔“ وہ روٹھے روٹھے انداز میں بولی۔

”بالکنی سے مجھے دیکھنے کے لیے جھانکا تو کرتی ہوگی؟“ وہ شرارت سے مسکرایا۔

گھر کر آج کی تازہ خبر سنا دی۔

شیخ معین الدین کی بینک میں بیٹھے حد درجہ باحیا مولوی صاحب ”محترمہ“ سے ضروری سوال کر رہے تھے۔ محترمہ بینک کے دروازے کی اوٹ میں چند اور خواتین کے ہمراہ تشریف فرما تھیں۔

”بی بی! یہ درست، مان لیا اکثر سوتیلی مائیں اسی روئے کے سبب بدنام ہو جاتی ہیں۔ لیکن تم نے بھی گھر چھوڑ کر سخت غیر عاقلانہ فیصلہ کیا ہے۔“ وہ بولے۔

”مولوی صاحب! گھر میں نے نہیں چھوڑا۔ مجھے زبردستی دھکے مار کر نکالا گیا ہے؟“ آواز پر سسکیاں غالب تھیں۔ ”میری سوتیلی ماں کا سلوک تو میرے والد کی زندگی ہی میں اچھا نہیں تھا۔ حالانکہ میں نے اپنی خدمت سے ان کا دل جیتنے کی بہت کوشش کی تھی۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد تو انھوں نے میرا جینا دوہر کر دیا اور آج صبح ہی سے وہ میرے پیچھے پڑی ہوئی تھیں۔ دوپہر کو انھوں نے مجھے مار کر اور یہ کہہ کر نکال دیا کہ آئندہ اپنی منوس صورت انھیں نہ دکھاؤں۔“ ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان بتایا گیا۔

”آہ۔ ہا۔“ کئی ٹھنڈی آہوں نے سچے کی کمی پوری کرنے کی کوشش کی۔

”لیکن بی بی! تمہیں انجان راستوں پر چلنے کے بجائے اپنے کسی رشتے دار کے ہاں چلے جانا چاہیے تھا۔“ وہ فطری سادگی و شائستگی سے گویا ہوئے۔

”میرا کوئی رشتے دار نہیں۔ پاکستان بننے کے بعد تمام خاندان میں سے صرف میرے والد نے پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ چار بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔ میرے والد بتایا کرتے تھے کہ ان کے تمام خوشحال رشتے داروں نے ”آزادی“ سے زیادہ اپنی جائیدادوں اور چلتے کاروبار کو اہم سمجھا تھا۔ میرا اس ملک میں کوئی رشتے دار نہیں۔“

یہ سن کر اکثر رقیق القلب خواتین کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

”بات یہ ہے بی بی کہ آج کا زمانہ بہت خطرناک ہے۔ لوگ کیا ہوتے ہیں مگر کیا بین کر ملتے ہیں۔ اب یہ بتاؤ ہم اہل محلہ تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟ اگر تم پسند کرو تو ہمیں سوتیلی ماں سے ملوؤ۔ ہم انھیں سمجھانے کی کوشش کریں گے۔“

”خدا کے لیے مجھے اس عذاب میں دوبارہ ڈالنے کا سوچے گا بھی نہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ میں سمندر میں کود کر جان دے دوں۔“ وہ خوفزدہ انداز میں بولی۔

کاسہ دل

جس طرح اندھوں میں کانا، راجایا سردار کی حیثیت رکھتا ہے، بالکل اسی طرح اس محلے میں مولوی صاحب کی حیثیت تھی۔

مٹھی بھر داڑھی، پنج وقتہ نمازی اور صحاح ستہ کے نام ازبر ہونے کی بنا پر انھیں ”مولوی صاحب“ کے ٹائٹل یا خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا۔ وہ امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اور انھیں محلے کے ”محکمہ قضاۃ“ میں چیف جسٹس کی معتبر نشست بھی حاصل تھی۔ یوں مولوی صاحب کی مصروفیات اس ملک کے کسی بھی بڑے آدمی سے کسی طور کم نہ تھیں۔

شیخ معین الدین کے مکان میں انسانوں کا ایک انبوہ موجود تھا اور شور میں کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی سوائے اس کے کہ مولوی صاحب کب آئیں گے؟ باہر کھڑے ہوئے متعدد افراد بات کی تک پہنچنے کے لیے از حد بے چین تھے اور یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ ”خصوصی عدالت“ کا وقت کیا ہے؟

”پتا نہیں مولوی صاحب کہاں رہ گئے۔ وہ عصر کے فرض پڑھا کر نکلے تھے پھر جانے کس طرف چلے گئے۔ اب تو مغرب کی نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے۔“ کسی نمازی نے مقدور بھر معلومات تشویش کے لفافے میں بند کر کے آگے بڑھائیں۔

”اے نبی! خدا کے لیے روؤ مت۔ مولوی صاحب آتے ہوں گے، وہی طے کریں گے کہ تمہارے لیے کیا کیا جائے؟ اے ہے، کیا اندھیر ہے، ظالم لوگ کنواری لڑکی کو دھکے دے کر یوں باہر نکال دیتے ہیں۔ ایمان تو دلوں سے اٹھ گیا ہے۔ خوف خدا بھی نہیں رہا۔“ کسی بوڑھی عورت نے حالاتِ حاضرہ کی تصویر کشی کرنا ضروری خیال کیا۔

اسی وقت اذانِ مغرب شروع ہوئی۔ نمازیوں نے مسجد کی سمت قدم بڑھا دیے۔ مسجد میں مولوی صاحب پہنچ چکے تھے۔ لوگوں نے انھیں دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ نماز ختم ہونے تک تو یہ واقعہ نمازیوں کے سینوں میں بند رہا لیکن نماز تمام ہونے پر لوگوں نے مولوی صاحب کو

”معاذ اللہ!“ مولوی صاحب کا معصوم دل کانپ کر رہ گیا۔ اس مبینہ ”اعلانِ خود کشی“ پر چند لمحے انھیں اپنا دل سنبھالنے میں لگ گئے۔

”تو پھر بتاؤ تم نے اس ”کچی بستی“ میں پناہ لینے کا ارادہ کیا سوچ کر کیا؟ ہم غریب لوگ ہیں یہاں کوٹھیاں ہمارے پاس نہیں کہ ہمیں گھریلو ملازمین کی ضرورت پیش آئے۔ جیسا کہ شیخ صاحب نے بتایا کہ تم گھریلو ملازمہ کے طور پر کام کرنے کی خواہش مند ہو۔ یہاں تو ان بے چاروں کو اپنے پیٹ کی فکر سے ہی فراغت نہیں۔ تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟“

”مولانا صاحب!“ لڑکی کی ٹھہری ہوئی آواز آئی۔ ”اگر اس محلے میں کوئی گھریلا ہے جس میں بوڑھے میاں بیوی رہتے ہوں تو میں ان کی خدمت کر کے خوشی محسوس کروں گی۔“ دو بہوؤں کی ساس کو یک دم اپنا بڑھاپا اور اولاد کی بے توجہی یاد آگئی جو اسے چھوڑ کر جا چکی تھیں، اس نے جھٹ خود کو پیش کر دیا۔

کچی آبادی کے ان سیدھے سادے لوگوں کو مزدوریوں اور بیماریوں سے لمحے بھر کی فراغت نہیں تھی۔ انھوں نے جیسے جہالت کے اندھیروں سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ ان کے بچے البتہ پڑھ رہے تھے مگر وہ بھی جبراً۔ نہ انھیں تحقیق کے انداز آتے تھے۔ نہ انسانوں کی سمجھ بوجھ تھی۔ ان ہم درد، غمگسار اور محنت کش لوگوں میں صرف ایک مولوی صاحب ہی تھے جو پرائمری اسکول میں سینئر استاد ہونے کے ساتھ ساتھ بستی کی ہمہ صفت اور قابل احترام شخصیت تھے، انھوں نے فیصلہ سنا دیا:

”بی بی تم اس بوڑھی خاتون کے پاس رہ سکتی ہو۔ لیکن سراسر اپنی ذمہ داری پر۔ اس شہر میں بے سہارا عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے کئی مراکز بھی ہیں۔ اگر تمہارا ارادہ ہو تو ظاہر کر دینا، میں تمہاری مدد کر کے انسانیت کے ناتے، بہت خوشی محسوس کروں گا۔“

عدالت، درخواست ہو گئی، اہل محلہ کے لیے اس نو دار لڑکی کا وجود کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ وہ ہنرمند تھی، ان کے اچھے اچھے کپڑے سی دیا کرتی۔ انتہائی کم قیمت کپڑے استعمال کرنے والوں کے ملبوسات کی ایسی ڈیزائننگ کرتی کہ انھیں بھی اچھا لباس میسر آ جاتا۔ اسکول جانے والے بچے شام کو اس کے پاس پڑھنے چلے جاتے۔ بڑی بی کے اجازت گھر میں خوب رونق لگی رہتی۔ خوبصورتی و حسن تو بجائے خود روشنی ہوتا ہے۔ اس ضعیف کے گھر کے در و دیوار جگر جگر کرنے

لگے تھے اور بوڑھے ناتواں وجود کو آرام بھی میسر آ گیا تھا۔

وہ لڑکی اپنا تعارف پہلی ملاقات ہی میں کر چکی تھی۔ اب لوگوں کے پاس کھوجنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ جب کبھی کوئی خاتون بات کرنا چاہتی تو سوتیلی ماں کا حوالہ خوب تھا۔ عموماً محلے کی خواتین اس کی سوتیلی ماں کے ذکر سے گفتگو کا آغاز کرتیں یا پھر ہندوستان میں مقیم اس کے رشتے داروں کے جنھوں میں کیڑے ڈالتیں۔ جنھوں نے پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی۔

اس کے ہاتھ میں بلا کا ڈانٹ تھا۔ عام اور سادہ سا کھانا بھی بہت مزیدار محسوس ہوتا تھا۔ اب محلے کی بزرگ خواتین و حضرات کو ایک سوچ مستقل لگی تھی کہ اس بے سہارا لڑکی کا گھر آباد کروایا جائے۔ انھوں نے اس کے لیے بُرے ڈھونڈنا چاہا تو وہ اتنی مصفا اور پاکیزہ نظر آئی کہ اس کے سامنے محلے کا ہر شخص گندا اور جاہل نظر آنے لگا۔ محلے کی خواتین ایسی ٹھکڑ، سیانی کے ساتھ کوئی ظلم یا نا انصافی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے گئے۔ آخر کار نظر تھک کر مولوی صاحب پر آنٹھری، مضبوط کاشی کے سیاہ داڑھی والے، انکسار و حیا کے سبب گردن جھکا کر چلنے والے جب محلے کے سب سے معمر اور سب سے ناخواندہ شخص کے ذریعے ان تک یہ بات پہنچی تو وہ نہایت حلیم انداز میں گویا ہوئے۔

”میاں صاحب! ان کے لیے خدا کوئی اچھا بندوبست ضرور کرے گا انشاء اللہ۔ میں ان کے لائق نہیں ہوں۔ وہ بہت کم عمر ہیں۔“ چونتیس، اڑتیس سال کے مولوی صاحب نے واضح انکار کر دیا۔ حالانکہ انھیں باور کرایا گیا تھا کہ لڑکی کو چنداں اعتراض نہیں ہے مگر کسی کی ہمت نہیں تھی کہ وہ مولوی صاحب سے اصرار کر سکتا۔ ناچار لوگ چپ ہو گئے۔

ہر جمعرات کو لوگ کوئی میٹھی چیز پکوا کر مولوی صاحب کے حضور پیش کیا کرتے، یہ عمل مولوی صاحب کو پسند نہیں تھا۔ مگر انھیں ناچار سادگی کے مارے عقیدت مندوں کا دل رکھنا ہی پڑ جاتا۔ بڑی بی ہر جمعرات کو گوشت پکاتی تھیں اور مولوی صاحب کو کھانا ضرور بھجواتی تھیں جبکہ مولوی صاحب نے بارہا انھیں اس ”نیک عمل“ سے باز رکھنا چاہا۔ مولوی صاحب کے ذمے اس محلے کے ادھر بھی بہت سے کام تھے، کسی کے گھر ختم کا نیاز ہے تو مولوی صاحب کی ذمہ داری، کسی کے بچے کو نظر لگ جانے کا شبہ ہوا تو وہ دوڑا ہوا چلا آیا۔ دم کرانے، کسی کے چکر رکھنے کا نام نہیں لے رہے تو پانی پڑھ کر دینا مولوی صاحب کا کام۔

شاید کھانے پینے کی اشیاء انھیں بطور اعزاز پیش کی جاتی تھیں جو انھیں محبوب کرتی

تھیں۔ آسودہ نہیں مگر یہ ناخواندہ لوگ مقابل کی ”انا“ کا ادراک نہیں رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ سب مولوی صاحب کا ”حق“ تھا۔

آج جمعرات تھی۔ بڑی بی نے ”ہفت روزہ“ گوشت پکایا تھا۔ بلکہ کلثوم نے پکایا تھا۔ اس نووارد لڑکی نے اپنا نام اُم کلثوم بتایا تھا لیکن اہل محلہ اسے صرف کلثوم کہتے تھے۔ بڑی بی کو کل رات سے بخار تھا لہذا وہ بڑی بی کی اجازت سے مولوی صاحب کے ہاں خود کھانا لے کر آئی تھی۔ اس نے بوسیدہ چوہی دروازے پر پڑی زنجیر ہلائی تو لمحاتی توقف کے بعد مولوی صاحب آ موجود ہوئے مگر ملگجی چادر میں لپٹی کلثوم کو دیکھ کر تھوڑا سا گھبرائے اور دروازے کی اوٹ میں ہو گئے۔

”جی بی بی! فرمائیے۔“ بلا کا شائستہ لہجہ تھا۔

کلثوم تو آخر کار لڑکی تھی، مردانہ حجاب پر اُلٹی شرمندہ ہو گئی۔ ”کھانا لائی تھی مولوی صاحب!“

”آپ نے کیوں زحمت کی؟ امید ہے آئندہ آپ۔“ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر ٹرے تھامی اور دروازہ بند کر لیا۔ کلثوم اُلٹے پاؤں واپس ہو گئی۔

مولوی صاحب کے بچے کچھ اہل خانہ کسی دور افتادہ گاؤں میں بستے تھے۔ کبھی کبھار ان کے بڑے بھائی اور بھابی آ جایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب اپنی سرکاری ملازمت کے باعث اس شہر کی اس کم مایہ کچی بستی میں رہنے پر مجبور تھے۔ ان کا اسکول بھی یہاں سے نزدیک تھا۔ وہ اس بستی میں اپنی رہائش پر مطمئن تھے۔ آج کل پھر ان کے بھائی بطور مہمان ان کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ اس مرتبہ مولوی صاحب کی بھابی، مولوی صاحب کی شادی پر سخت مصر تھیں کہ وہ اب ان کا نکاح پڑھوا کر ہی جائیں گی۔ اہل محلہ ان کے اس ”مشن“ پر مسرور تھے اور اپنی نیک خواہشات کا اظہار کر رہے تھے۔

جب اہل محلہ نے بھواج کی توجہ کلثوم کی سمت مبذول کر کر یہ بتایا کہ وہ رشتہ اپنے طور پر مولوی صاحب کے سامنے پیش کر چکے ہیں لیکن اس مرتبہ انھوں نے نکاح سے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کی ہے کہ لڑکی بہت کم عمر ہے۔ مولوی صاحب کی بھواج اللہ کی ایسی شان دار نعمت سے منہ موڑنے پر اپنا سر پیٹ کر رہ گئیں اور نئے سرے سے ان کے پیچھے پڑ گئیں کہ لڑکی تو تمھارے ساتھ نکاح پر رضی ہے۔ اس پر کوئی زبردستی تو نہیں کر رہا ہے اور بالآخر انھوں نے اس

مرتبہ یہ مہم سر کر ہی لی۔

نکاح سادگی سے ہوا۔ چھوہارے اور شربت سے مہمانوں کی تواضع ہوئی اور مولوی صاحب کا مکان ”گھر“ بن گیا۔

اس دن کلثوم رورو کر تین مرتبہ بے ہوش ہوئی تھی۔ اس کا اس طرح بے حال ہونا سمجھ سے بالاتر تھا۔ روتے روتے اس نے کئی مرتبہ ہڈیاں بھی بکا تھا۔ عورتیں آخر کار یہی سمجھیں کہ اس اہم موقع پر اسے اپنے یاد آ رہے ہیں۔

اس کے حافظے میں گزرے وقت کا لمحہ لمحہ روشن تھا۔ اسے یاد تھا کہ بچپن سے لے کر آج تک کبھی ایسی خوش بخت گھڑی نہیں آئی تھی، جس میں انھوں نے یعنی کلثوم کے بھائیوں نے اور استانی جی کے اکلوتے لیکن لے پالک بچے نے ایک دوسرے کو دوستانہ نظر سے دیکھا ہو۔ اسے یاد تھا کہ جب اس کے بھائی ”زمانہ طفلی“ میں تھے، اس ”لے پالک“ کے ساتھ یادگار لڑائیاں لڑی گئی تھیں۔ یادگار اس لیے کہ ہر لڑائی کے بعد کسی نہ کسی کے وجود یا چہرے پر زخم کا نشان ضرور لگا تھا۔ جس نے اس لڑائی کو یادگار بنا دیا تھا۔

اس زمانے میں وہ بہت ہی مصحوم تھی، منصفانہ جس سے یکسر بے بہرہ لیکن جب ہوش کی دنیا اس پر روشن ہونا شروع ہوئی تو اسے یہ اندازہ لگانے میں قطعی دشواری پیش نہ آئی کہ دراصل اس کے بھائیوں کے وجود میں خون کی جگہ شرارت دوڑتی ہے اس لیے کہ وہ خود بھی بارہا ان کی شرارتوں کی زد میں آئی اور بڑی طرح آئی۔ اس کے بھائیوں کو خواخواہ اس کی اکلوتی گڑیا سے بہت زیادہ چڑھتی۔ بے چاری کی ناگ توڑ کر جب تک اسے اپنا ج نہ بنا دیتے، انھیں چین ہی نہ آتا۔ کبھی وہ اس کے پسندیدہ کپڑے چھپا دیتے اور کبھی آتے جاتے اس کے چنگلی لینا بہت ضروری سمجھتے، اپنے بھائیوں کی ان حرکتوں سے وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ محلے بھر سے لڑائی مار کٹائی کی جو خبریں آتی ہیں، ان کا نقطہ آغاز اس کے دونوں بھائیوں کی ذات ہوتی ہے۔

اس نے بلا کی غیر جانبدار طبیعت پائی تھی، اسے بھائیوں کی شرانگیزیوں اور سونے پر سہاگا، ماں کی حمایت ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں، مگر تب وہ بہت چھوٹی تھی کون اس کی سننا؟ پہلی بار اس نے تب احتجاج کیا تھا جب اس کے بھائیوں نے اسے استانی جی کے ہاں ”سیپارہ“ پڑھنے سے روکا اور ماں سے کہا کہ وہ اس کے لیے گھر پر ہی کسی قاریہ، قاری یا حافظ کا انتظام کر دیں گے۔ تب اسے بڑی طرح غصہ آ گیا تھا۔ استانی جی کا گھر کون سادہ ہے؟ دیوار سے دیوار ملی

ہے اس کی ساری سہیلیاں وہیں قرآن مجید پڑھتی ہیں۔ گاہے گاہے اُنھ کراستانی جی کے کام کرتی ہیں اور جان بوجھ کر کام دیر سے کرتی ہیں۔ ٹھنڈے لگاتی ہیں۔ گرمیوں میں استانی جی چھت پر کچے آم، ہلدی نمک لگا کر سکھانے کو ڈالتی ہیں تو وہ کپڑے اتارنے کے بہانے اوپر جاتی اور دو چار ہلدی نمک لگی کچی چٹائیں ہضم کرتی ہیں۔ بعد کو استانی جی سوچتی رہ جاتی ہیں کہ اس مرتبہ دس سیر آم بہت ہی سوکھ گئے۔ پار سال بھی اتنے ہی آموں کا اچار ڈالا تھا مگر وہ تو اتنے نہیں سوکھے تھے۔

اب اس کے بھائی اس سے زندگی کی یہ خوبصورت رونق چھین لینا چاہتے ہیں۔ ابھی وہ بہت چھوٹی تھی۔ بہت سی ”بے جا“ ضدیں بھی اسے جائز ہو جاتی تھیں۔ لہذا اس نے اعلان کر دیا کہ وہ قرآن پڑھے گی تو صرف استانی جی سے ورنہ کسی سے نہیں پڑھے گی۔

ماں کے سمجھانے پر بھائی رضامند تو ہو گئے، مگر اسے گھورا بہت تھا۔ تب اس نے ماں کے گلے میں بانٹیں ڈال کے منہ بسور کر کہا تھا۔

”امی! آصف بھائی اور چھوٹے بھائی، انعام بھائی سے لڑتے ہیں، میں تو نہیں لڑتی، پھر میں کیوں استانی جی کے ہاں نہ جاؤں؟“

”نہیں نہیں بیٹی! تمہیں کیوں منع کریں گے استانی جی کے ہاں جانے سے، وہ تو بہت اچھی اور مہربان عورت ہیں۔ پھر میری بیٹی سے پیار بھی کرتی ہیں۔ آصف، ماجد تو پاگل ہیں، زمانے بھر کے شرارتی۔“ ماں کے خیالات سے اسے یک گونہ اطمینان حاصل ہوا۔ اس کا استانی کے ہاں بے خوف و خطر جانا آنا بدستور رہا۔ یہاں تک کہ تیسوں پارے عمر کی گیارہ منزلوں تک آتے آتے اس نے پڑھ ڈالے۔

”انعام اللہ“ یہ نام استانی نے اپنے اس لے پالک بیٹے کا چاہتوں کے ساتھ رکھا تھا۔ بیوگی کی تازہ فصل پر عمر کی درانتی چلا رہی تھیں کہ کسی دور پار کے عزیز نے انھیں اللہ کا یہ ”انعام“ پہنچایا تھا۔ انعام اللہ دو ماہ کا تھا۔ جب استانی جی کے بازوؤں میں آیا تھا اور انھوں نے اپنی پسند سے یہ نام رکھا تھا۔ سنا تھا کہ بچے کی ماں زچگی کے چند گھنٹے بعد ہی اسے تنہا چھوڑ گئی تھی مگر استانی جی نے اسے بہت پیار سے پالا تھا۔ بچپن کے برعکس جب وہ آصف اور ماجد کے ساتھ برسرِ پیکار رہتا تھا۔ بڑا ہو کر وہ بہت سلجھا ہوا نکلا تھا۔ بہت کم لوگ یہ بات جانتے تھے کہ وہ ”جارج“ نہیں تھا۔ اس کی جنگ ہمیشہ دفاعی ہوتی تھی۔ بے غیرتی و بے جہتتی اس کی مٹی

میں نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے ظلم سہنے والوں میں سے بھی نہیں تھا۔ اس کا ذیل ڈول آصف و ماجد دونوں سے مضبوط اور نکلتا ہوا تھا۔

متوسط طبقے کی اس کالونی میں جہاں بھانت بھانت کے لوگ بستے تھے۔ سب ایک دوسرے کے دوست تھے۔ علاوہ ان تینوں کے، یہ آج بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ ان کے سینوں میں انتقام کے الاؤ دہکتے رہتے تھے۔

اسکول ایک رہا جہاں سے کئی بار ”معرکہ رپورٹ“ گھر آئی، پھر ان کا کالج ایک رہا۔ یہ اتفاق تھا کہ وہاں قائم ”پارٹی بازی“ سے ان کے چوبارہ الگ ہو گئے۔ تینوں نے ایک دوسرے کی حریف مخالف پارٹی سے تعلق قائم کیا۔

ان کی دشمنی دیکھ کر اس کے اعصاب شل ہو جاتے اور دل وحشت زدہ، پھر کالج میں پکڑے جانے والے لڑکوں میں آصف کا نام بھی دیکھا گیا تو گھر والوں کو سانپ سونگھ گیا۔ باپ بے چارہ کہاں کہاں خوار نہ ہوا۔ آصف دو دن سرکاری مہمان کیا بنا کہ اس کے تو اطوار ہی بدل گئے۔ اب تو اسے یہ ناز بھی تھا کہ وہ حوالات کی ہوا کھا کر آچکا ہے۔ آخر پٹھان خون ہے کسی بزدل کا نہیں۔

وہ استانی جی کے ہاں کم جاتی تھی اور انعام سے سامنا بھی کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ مگر وہ اس پر کبھی اچنتی نظر بھی نہیں ڈالتا تھا اس لیے نہیں کہ وہ کم روحی بلکہ اس لیے کہ قرآن پڑھنے کے لیے آنے والے بچوں کے شور سے وہ بہت گھبراتا تھا اور زیادہ تر گھر سے باہر ہی وقت گزارتا تھا۔ ایک روز جب وہ کالج سے تھکا ہارا گھر آیا تو ”قاری بچوں“ کے بے ترتیب جوتوں، چپلوں سے الجھ کر گرتے گرتے بچا اور بھنا کر رہ گیا۔

”اماں جان! تم از کم ان بچوں کو جوتے اتارنے اور رکھنے کی تمیز تو سکھا دیں۔“

”جوتے ہمیشہ اسی جگہ پائے جاتے ہیں اور اسی انداز میں۔ یہ خیال آپ کو پہلے کیوں نہیں آیا کہ بچوں کو ”تمیز“ سکھانا چاہیے؟“ وہ اسے گرتے گرتے سنبھلتا دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھی تھی۔

انعام نے چونک کر اس ”شرانگیز“ آواز کی سمت دیکھا۔

”تسلیم!“ وہ بولی۔

اس نے غور سے دیکھا جو واقعتاً سر تا پا تسلیم و نیاز نظر آ رہی تھی۔

نے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا اور مسکرا دیا۔
”کہاں تھیں؟“

ساری اولوالعزمی یہاں وہاں کہیں بہہ گئی اور اس نے سوچا۔ ”وہاں جہاں تم آج تک نہیں پہنچے۔“

گویا وہ اس کی آمد کو محسوس کرتا رہا ہے، وہ تو سمجھ رہی تھی کہ وہ اس پر ایک اچنتی نظر بھی نہیں ڈالتا۔ وہ جواب دیے بغیر آگے بڑھ گئی۔ مگر اس کے چہرے پر بڑا حوصلہ افزا تاثر تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک بار اس نے اتفاق سے ماں کی وہ ایک بات سن لی تھی۔ وہ اس کے بھائیوں سے کہہ رہی تھی۔ ”استانی جی تسلیم کو بہت زیادہ پسند کرتی ہیں۔ کئی بار اشارنا کہہ چکی ہیں کہ وہ اسے اپنی بیٹی بنانا چاہیں گی۔“

”اوقات دیکھی ہے بڑھیا نے؟ اور کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں اس کے اس زبردستی کے بیٹے میں؟“ آصف کا طرزِ مخاطب اس گھر کے ذکر پر پستیوں کی انتہا کو جانپنا تھا۔
”اور اگر اس طرّم خان نے ایسا سوچا ہوگا تو جان سے مار کر چوک پر لٹکا دوں گا۔“
ماجد بولا۔

”اس قدر آپ سے نکلنے کی کون سی بات ہے؟“ ماں نے جھڑک دیا۔ ”ایک بات ہو رہی تھی۔ آج بھی کل کے ننھے بچے بنے ہوئے ہیں۔ توبہ ہے۔“ ماں نے مزید لعل طعن جاری رکھی اور وہ ایک نئے کرب سے آشنا ہو گئی۔ ناممکن کو ممکن بنانے کی صلاحیت نہ ہو اور احساس بے بسی کی انتہا ہو تو خواہش جنون بھی بن جاتی ہے۔ پابندی ازل سے حوا اور آدم کے تجسس اور شوق کو بھڑکاتی آئی ہے۔ اسے خونی رشتے سانپ بن کر ڈسنے لگے تھے۔

تسلیم اب بھی آنکھ پچا کر وہاں ہو آتی تھی مگر وہ ہمیشہ کی طرح اسے انجان بن کر رہی ملا۔ جوت جلی اور بجھ بھی گئی۔ تھوڑی سی توجہ کے بعد شدید بے توجہی سے قرار ہی لٹ گیا۔

ایک روز جب استانی جی بخار میں پھنک رہی تھیں اور تسلیم برف کی پٹیاں ان کی پیشانی پر رکھ کر ان کے وجود کی آنچ گم ہو رہی تھی کہ وہ بہت پریشان و بے قرار نظر آیا اور اسے اشارے سے باہر بلا دیا۔ تسلیم ہکتے دل کو سنبھالتی جب اس کی بات سننے باہر آئی تو وہ بے دھڑک بولا۔

”تسلیم! میرا انجان بننا بھی کسی کام نہیں آیا۔ تم بالکل نہیں بدلیں۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ یہ سب ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن، براہِ مہربانی تم میرے گھر نہ آیا کرو۔ میں امتحان میں پڑ

”اے ہاں یہ تسلیم ہی تو ہے، بڑی سمندر پار سے آئی ہے جو پہچانی نہیں جا رہی۔ ارے یہ تو بہت چھوٹی سی تھی جب سے آ رہی ہے؟“

ماں کے ان جملوں پر اس نے بہ غور اس کے ”نیاز“ حاصل کیے۔ دراصل جب سے اس نے قرآن مجید ختم کیا تھا، اس کا استانی جی کے ہاں کم ہی آنا ہوتا تھا۔ وہ بھی بہ مشکل کسی بہانے سے جیسے کہ آج آگئی تھی۔ ”کوفتوں“ کا ہدیہ لے کر، اور جب وہ آتی تھی تو انعام اسکول، کالج یا میچ وغیرہ کھیلنے گھر سے باہر ہوتا تھا۔

یہ عجیب لیکن اچھی بات تھی کہ بچوں کی اکثر اوقات کی چشمک کے باوجود دونوں گھروں کے بڑوں کا رویہ ایک دوسرے کے ساتھ نارمل تھا۔ جس پر دونوں طرف کے بچے اپنے بڑوں سے نالاں تھے اور چاہتے تھے کہ دونوں گھرانے آپس میں عام سی صاحبِ سلامت بھی نہ رہیں۔

انعام، اسے واقعی اللہ کا انعام لگا تھا۔ وہ جو مبینہ بھرتک استانی جی کے دروازے کو دور سے ٹکا کرتی تھی، اکثر استانی جی کے کام کرتی نظر آنے لگی۔ میٹرک کے امتحانات کے بعد فراغت تھی۔ عموماً اپنی سلائی کڑھائی کا سامان لے کر ان کے ہاں آ جاتی۔ اسے خود یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ کیا اسے ”کچھ“ اچھا لگا ہے؟ اور بات یہ ہے کہ جو شے اچھی لگتی ہے، بغیر دلیل کے بھی اچھی لگتی ہے۔ اچھے لگنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ پہلے چیز بے ساختہ اچھی لگتی ہے پھر انسان اپنے دل سے دلیل طلب کرتا ہے کہ ”یہ“ اسے کیوں پسند آئی؟ اور دل، دلیل کا گھر نہیں ہے۔ دلیل کا ٹھکانہ عقل ہے جو کب کی منہ بسور کر، کواڑ پھیر کر بیٹھ چکی ہوتی ہے لہذا وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ ادھر وہ بھی انجان نہیں تھا۔ محتاط تھا۔ پارسا تھا اپنے وقار کے لیے بے پناہ حساس تھا۔ اس لیے خاموش تھا۔

نئے سال کے چند ماہ گزرے تھے کہ قدرت نے تسلیم کو یتیمی کے امتحان اور بھائیوں کی حاکمیت کے عذاب میں ڈال دیا تھا۔ اس کے سر سے مضبوط سائبان مٹ گیا تھا۔ جب ماں ہی ٹوٹی ہوئی نظر آئی تو اس کا کیا سوال۔ وہ تو محض اپنے وجود ہی میں قید ہو کر رہ گئی۔ دل کے چور نے علیحدہ اس کی ”مشکلیں“ کس دی تھیں۔ اسے بھائیوں کی خونخوار اور سخت نظریں اپنا آپ پڑھتی محسوس ہوتیں۔

اور جب وہ ایک عرصے بعد مرحوم کی عزت کا ادراک کر کے استانی جی کے گھر آئی تو وہ اسے سامنے ہی مل گیا۔ بیٹھا جوتوں کے تسمے کس رہا تھا۔ صحن میں بچوں کا مخصوص شور تھا۔ اس

جاتا ہوں۔“

تسلیم نے کانپتا دل سنبھالا، اس کی سمت دیکھا اور سوچا۔ ”غافل! تجھے اتنی دیر میں سوچھی۔“ پھر وہ بولنے کی کوشش کرتی رہی مگر آنسوؤں کا سلسلہ نہ تھا اور لفظ اس کے ہونٹوں پر نہ اتر سکے۔ بالآخر وہ بولا۔

”آخر ہم کربھی کیا سکتے ہیں؟ یا تو یہ کہ ہم کورٹ میرج کر لیں اور بعد میں اعلان کر دیں پھر کیا کر سکیں گے تمہارے بھائی؟ مگر مجھے لگتا ہے پھر بھی تم ہارو گی، اس لیے کہ وہ جلد ہی تمہیں بیوہ کر دیں گے۔“ اسے بھی اس کے بھائیوں ہی سے خطرہ تھا۔

”کورٹ میرج۔“ ”میرج۔“ سے لجانے والی کورٹ میرج کی بات سن کر چکر اسی گئی۔ ”نہیں۔“ اتنا کہہ کر وہ واپس استانی جی کے کمرے میں آگئی تو ان کے سر ہانے کھڑی ہو گئی۔ منزل کس قدر قریب تھی اور کس قدر دور بھی۔ پھر وہ بڑی طرح الجھ کر گھر آگئی تھی۔

انعام اللہ کو گریجویشن کے بعد محکمہ جنگلات میں سروے آفیسر کی جاب مل گئی تھی۔ اب اسے کسی دوسرے شہر جانا تھا۔ استانی جی اس کے بنائیں رہ سکتی تھیں۔ ناچار وہ بھی اس کے ہمراہ جا رہی تھیں۔ محلے کی تین نسلوں نے جدائی کے لمحوں کے کرب سمیٹے تسلیم سکتے کے عالم میں خالی الذہن رہ گئی۔ کس قدر بے درد تھا وہ گئی تو اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

ماہی بے آب کی طرح تڑپ کر اس نے وداع کے لمحوں کا سامنا کیا اور چلا گیا۔ وہ محض سوچتی رہ گئی کہ اب وہ کیسے رہے گی؟ کیوں کر جیے گی؟ اسے اپنے بھائیوں کی صورت سے وحشت ہونے لگی۔ عورتیں اکثر اس کی ماں کے پاس بیٹھ کر استانی جی کو یاد کیا کرتیں مگر تسلیم صرف اسے، اگر وہ مہندی رنگے بالوں والی خوبصورت بوڑھی عورت کبھی یاد بھی آئی تو اس کے حوالے سے، سرکتے دنوں نے اچانک اسے تحفے کی صورت اس کی آمد کی اطلاع دے کر کروٹ بدلی۔ پتا چلا، کچھ ضروری سامان لینے آیا ہے جو گھر میں رہ گیا تھا۔ وہ دو دن کے لیے آیا تھا۔ پورا محلہ اسے گھیرے بیٹھا تھا۔ سب اس سے اپنی استانی جی کی بابت پوچھ رہے تھے۔ مگر اس کے بھائی حسب سابق جل بھن کر خاک ہو رہے تھے۔ آخر رات کو اس نے انعام اللہ کا دروازہ بجا دیا۔ وہ اسے دیکھ کر پہلے تو حیران ہوا پھر مسکرا دیا۔

”کسی نے دیکھا تو نہیں؟“

”نہیں۔“ وہ تیزی سے اندر آگئی۔

”مجھے اپنی فکر نہیں ہے، صرف تمہاری ہے۔ تمہارے بھائی۔“

”مت کرو ان کا ذکر جنھوں نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے محروم کیا ہے۔“

”ان کی کیا مجال؟ اگر انسان خود ہی نہ چاہے تو! وہ نہ جانے کیا کیا کہہ گیا۔“

وہ اس کے بہت قریب کھڑا تھا۔ کیا پھر دور ہونے کے لیے؟

”استانی جی کیا کہیں گی؟“ آخر کار اس نے کہا۔

”انھیں تمام صورت حال کا علم ہے۔“

اگلے روز بلکہ اگلی شب وہ ٹرین کے سلپر میں بیٹھے۔ آئندہ پیش آنے والے مراحل کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ حیدر آباد اسٹیشن پر وہ تسلیم کو چائے دے کر جو اس نے چھوٹے سے قمراس میں بھری تھی۔ کچھ چیزیں لینے کے لیے نیچے اتر گیا تھا۔ چائے کے آخری گھونٹ نے تسلیم پر غنودگی طاری کر دی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ تیز چمکتی دھوپ کھڑکی کے راستے اندر آ رہی تھی۔ گاڑی جانے کن بیابانوں کا سینہ چیرتی گزر رہی تھی۔ دور دور تک ویرانی پھیلی ہوئی تھی اور اس کا دل گویا پسلیاں توڑ کر باہر آیا چاہتا تھا۔ اس کے حواس کام کرنا بھول گئے۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ بالکل تنہا ہے۔

ٹرین کی رفتار کا شور اس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی ضربیں بن کر لگ رہا تھا اور ہر ضرب کے ساتھ ایک نیا سوال گونجنے لگتا تھا۔

”وہ کہاں ہے؟“

”وہ کہاں گیا؟“

”کیا میں اتنی دیر سوتی رہی؟“

وہ بہ مشکل اٹھ کر ہاتھ روم تک گئی۔ وہ خالی تھا۔ اسے چکر آ گیا۔ ”انعام اللہ!“ اس نے یوں آہستگی سے پکارا، گویا وہ اس کے دل میں ہو، اور جیسے پکار کا جواب دے گا۔

”یہ کیا ہے انعام اللہ!“

معاذے اپنا پنڈ بیک یاد آیا جس میں خاصی رقم اور سونے کے دو تین زیور تھے۔ اس نے تیزی سے چادر سیٹ سے کھینچ کر ایک طرف کی، پنڈ بیک موجود تھا۔ اس نے جلدی سے کھول کر اپنی چیزیں دیکھیں۔ رقم بھی موجود تھی اور زیور بھی۔ ان کے علاوہ خاکی کاغذ کا لفافہ بھی تھا۔ اس نے فوراً کھول کر دیکھا۔ ایک سفید تہہ شدہ خط میں سوسو کے چار نوٹ رکھے تھے۔ وہ جو اس

تمام صورت حال سے انتہائی دل برداشت نظر آ رہی تھی، ایک دم مستعدی ہو گئی اور خط پڑھنے لگی۔
”تسلیم صاحبہ!“

گاڑی حیدر آباد کے اسٹیشن پر کافی دیر رکتی ہے۔ میں یہاں تمہارے سامنے اتروں گا اور دوسری گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔ تم نے چائے پی؟ ذائقہ کیسا لگا؟ یقیناً تمہیں آٹھ گھنٹے کے اندر ہوش آ گیا ہوگا۔ تم دوسری گاڑی سے گھر واپس چلی جانا میں بس اتنا چاہتا تھا کہ تمہارے بھائی کی گالی کا جواب، تمہارے ذریعے دوں۔ تین سال قبل تمہارے بھائی نے کالج میں میسوں لڑکوں کی موجودگی میں مجھ سے کہا تھا۔

”نہ جانے کس گندی عورت کا انعام ہے جسے استانی جی نے ترس کھا کر پالا ہے۔ اسے تو اپنے باپ کا نام بھی نہیں معلوم۔“ ”میری حقیقت کیا ہے، مجھے معلوم ہے لیکن تمہارے بھائی نے مجھے سراٹھا کر چلنے سے روکا تھا۔ بات ہے غیرت کی۔ اگر مجھے گالی سننا آتا ہے تو اسے لوٹانا بھی آتا ہے۔“

”تم اذیت ضرور اٹھاؤ گی مگر تمہاری ماں زندہ ہے وہ تمہیں مرنے نہیں دے گی کہ تم اس کی اکلوتی بیٹی ہو۔ میں نے تمہارے بھائیوں سے انتقام نہیں لیا۔ بلکہ ان کو اپنے برابر کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاید یہ سب نہ ہو پاتا اگر تمہاری نظر مہربان نہ ہوتی۔ بہت شکریہ تمہارا اور میرا ایک گلی سے ایک رات اکٹھے غائب رہنا یہی میرا تمہارے بھائیوں کو جواب ہے، ہو سکے تو یہ خط بھی اپنے بھائیوں کو دکھا دینا۔ واپسی کے اخراجات کے لیے کچھ تم رکھ دی ہے۔“

انعام اللہ

محبت کی یہ صورت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اسے اپنی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی۔ ماں زندہ ہے مگر ”معزول ملکہ“ ہے۔ ”یہ تم نے کیا کیا انعام اللہ؟“ اس نے سوچا۔ اتنی بھکڑ رچی ہوگی۔ ایک زمانہ اسے ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوگا۔ اس کے بھائی، اس کا قیہ کرنے کو بے تاب کھڑے ہوں گے۔ صرف اس کا ہی نہیں بلکہ انعام کا بھی۔ یہ سب کیا ہو گیا، یہ تم نے کیا کر ڈالا انعام؟ کیسے مرد ہو تم انتہائی پارسا کہ مجھے کبھی چھو ای نہیں اور انتہائی..... رذیل بھی کہ مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔“

اس کی ماں نے اسے بچپن میں ایک کہانی سنائی تھی، جس میں ایک خوفناک اژدھ کا ذکر تھا۔ اس اژدھ کی پھنکاریں اتنی طاقت ور تھیں کہ ہزاروں گز کے فاصلے پر کھڑے شخص

کو اپنی جانب کھینچ لیتی تھیں۔ وہ پھنکاریں شاید کسی کینہ پرور کے انتقام کا بھیس ہوں گی جھلسا کر راکھ کر دینے والے منتقم کا بھیس جو اژدھے کے وجود کو کین گاہ بنائے ہوئے تھا۔

”میری خطا کیا تھی انعام؟ محض آصف کی بہن ہونا میرا سب سے بڑا جرم ٹھہرا۔“ اس نے خود کلامی کی پھر اس کی تمام حسیں جاگ اٹھیں۔ اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اتنی شدت سے کہ اس پر ناتوانی طاری ہو گئی تھی۔

جہاں گاڑی خالی ہو گئی۔ وہ بھی اتر گئی۔ اس کا سب کچھ سلامت تھا پھر بھی وہ سر تاپا لٹ چکی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ کراچی جانے والی ایک ٹرین میں بیٹھ گئی۔ اس کی قوت فیصلہ اب بھی مفلوج تھی۔ اس کے ذہن پر بس ایک خیال دستک دیے جا رہا تھا کہ کسی اور کا ذہن کسی نقطے پر ٹھہرا ہو یا پھر ٹھہرا ہو مگر اس کے گھر والے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں معاملے کی تہ تک پہنچ گئے ہوں گے کہ وہ انعام کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ وہ کیوں کر یقین دلا پائے گی کہ اس کا کچھ۔

جب وہ کراچی کینٹ پر ہینڈ بیگ سنبھال کر اتری تو سہ پہر ہو چکی تھی۔ خیالات کی یلغار اب اس کے ذہن پر حملہ آور تھی۔ وہ کیوں کر اور کس منہ سے اس گھر میں جائے جس کا ایک ایک چراغ چمکا چور کرنے کے بعد وہ تاریکی اوڑھ لپیٹ کر باہر نکلی تھی۔ اس نے چشم تصور سے اپنے گھر کی دہلیز پر اپنے وجود کے ٹکڑے خون میں لت پت بکھرے دیکھے کہ اس کے ذہن کو اپنے غیرت مند بھائیوں کے مزاج کا ادراک تھا۔ پھر اس نے اپنے بھائیوں کے خون آلود ہاتھ جھکڑیوں سے بو جھل دیکھے، انھیں قید بامشقت کاٹنے ان کی سفید داڑھیوں کو آنسوؤں سے تر دیکھا۔ اور اسی لمحے اس نے خود اپنی زندگی پر فاتحہ پڑھ لی، سوچ اور سفر دونوں کا رخ بدل دیا اور اس کچی بستی میں چلی آئی جو بہت ہی پس ماندہ، دور افتادہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے ہر جگہ ڈھونڈا جائے گا حتیٰ کہ بے سہارا عورتوں کے مراکز تک میں بھی۔ تسلیم کو اس نے کراچی کینٹ میں دفن کر دیا۔ اور آج وہ ام کلثوم بنی مولوی صاحب کی منکوحہ تھی۔

مولوی صاحب اس بے سہارا، خوبصورت، خوش اطوار بیوی کے بڑے قدر دان تھے، ہمہ وقت اسکی دلجوئی کرتے رہتے خاص طور پر انھیں اس کے ہاتھ کے کھانے بہت پسند تھے۔ وہ اسے بتاتے کہ وہ کہیں بھی کھانا نہیں کھاتے، خواہ کوئی کتنا ہی مجبور کرے کہ وہ اس کے ہاتھ کے پکے کھانے کو بہت بڑی نعمت سمجھتے ہیں۔

انہی دنوں بستی میں ایک سانحہ ہو گیا۔ بہن حلوائی کی بیٹی رشیدہ کرم دین رکشا ڈرائیور

اک حرفِ ملامت بھی نہیں

اس نے برقعہ اتارا۔

پینے سے بڑی طرح بھیگ رہی تھی۔ پسینہ بھی جب کی پائپ لائن کی طرح جانے کہاں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتا تھا؟ لٹیں پیشانی اور رخساروں پر بھیگ کر چمکی ہوئی تھیں۔ جبکہ بڑی پھوپھو کب کی چادر پھینک پھانک پٹکے کے نیچے تعظیم سے سر جھکا کر بیٹھ چکی تھیں، مطلب یہ کہ کمر پر ہوا لے رہی تھیں۔

”اس قدر ہلا کی گرمی تو بہ۔ کوئی مجھے لاکھوں دیتا تو نہ میں گھر سے نکلتی۔“ ہوا سے ٹھنڈک کا احساس ہوا تو پھر نئے سرے سے بڑی پھوپھو کو راستے کی گرمی یاد آ گئی۔

جبکہ اس گھر میں مقیم تینوں چاروں کنہیوں کے بچے (عمادۃ) چند ایک نکال کر سب موجود تھے۔ بہت تعجب سے اس پسینے سے ترتر لڑکی کو بغور دیکھ رہے تھے۔

آخر چرا آپی نے اس کی جھک کو محسوس کر کے اس سے بات کرنے میں پہل کی۔

”ادھر پٹکے کے نیچے آ جاؤ پتا۔“

پتا نے نظر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا، پھر چرا کا کہا مان لیا اور مزید آگے بڑھ آئی۔ عجیب بے ترتیب منظر تھا، فولڈنگ چیئرز ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں، جن پر گھر بھر کی لڑکیاں اور خواتین براجمان تھیں۔ جن کو جبکہ نہیں ملی وہ قالین پر پسر گئی تھیں۔

اس گھر میں اس قسم کے اجتماعات عام سی بات تھے، بالکل کھانے پینے اور چھینکنے کی طرح کے عام معمولات۔

اس لیے جب میں اندر داخل ہوا تو معمول کے انداز میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ مگر جاتے جاتے شرارت سے رُکا، کوئی جملہ چھپکے بغیر تو بقول امی میرے حلق سے نوالہ نہیں اترتا۔

”کیا آج پھر ”غیبت اشال“ لگا ہوا ہے؟ اور ہاں یہ بتائیے آج سب سے زیادہ کون ”بھرا“ ہوا ہے؟ اب میں فارغ ہوں، وہ چاہے تو میرے سامنے جی ہلکا کر سکتا ہے۔“

کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس کی ماں مولوی صاحب کے پاس اس کی واپسی کے لیے دعا کرانے آئی۔ ام کلثوم نے اس میں اپنی ماں کی تصویر دیکھی تو دل کانپ کر رہ گیا۔

آخر کار بستی والوں کی بھاگ دوڑ کام آئی، رشیدہ اور کرم دین بازیاب ہو گئے۔ باہمی مشورے سے دونوں کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ اور ساتھ ہی رشیدہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ آج سے اس کا کوئی میکا نہیں۔

یہ سب باتیں کلثوم کے زخموں پر نمک پاشی کا کام کر گئیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رشیدہ سے ہمدردی کر بیٹھی۔ اپنائیت کے احساس سے اس ”راندہ درگاہ“ کا دل بڑھاتی۔ اس کے کام آتی جس پر بستی والوں کو بھی اعتراض تھا۔ مگر مولوی صاحب کے احترام کی وجہ سے وہ منہ سے کچھ نہ کہتے۔

آج جمعرات تھی۔ رشیدہ منت کی کھیر اس غمگسار کے ہاں لائی تھی جو اس نے مولوی صاحب کو کھانے کے ہمراہ پیش کر دی کیونکہ وہ بیٹھے کے بہت شوقین تھے، کھانے کے بعد جب وہ کھیر کھانے لگے تو ایک لمحے کے لیے رُک گئے۔

”یہ کھیر کس کے گھر سے آئی ہے کلثوم؟“

”رشیدہ لے کر آئی تھی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”لا حول ولا قوۃ۔“ انھوں نے پیالہ رکھ دیا۔ ”میں کسی بھگوزی کے ہاتھ کا پکا کھانا

کھانا کبھی سمجھتا ہوں۔“

نہ جانے کلثوم کا کلیجہ کیوں کانپا تھا بھائی عقب سے نشانہ باندھے ہوئے تھے، کوئی بات نہیں لیکن مولوی صاحب کے تیر کا رخ اس کے دل کی سمت تھا۔ کھیر کا پیالا اٹھا کر کمرے میں چلی آئی تاکہ مولوی صاحب اس کی پکوں پر لرزے والے آنسو نہ دیکھ سکیں۔



”یہ بڑے جنتی بہشتی ہیں۔“ جڑا سے چھوٹی ندا بھڑک کر مڑی کیونکہ سب سے زیادہ ادھر کی ادھر کرنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی اور مجھے اسی کو چھیڑنے میں بہت مڑا آتا تھا۔ میں کمرے میں جانے کا ارادہ ملتوی کر کے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”ایک دفعہ کی بات ہے، چوریاں بہت ہو رہی تھیں، چور پکڑا نہیں جا رہا تھا۔ مالک نے اپنے تمام نوکروں کو بلایا اور تفتیش شروع کی، بڑا ہوشیار آدمی تھا کہنے لگا کہ میں ایک نشانی چور کی پہچانتا ہوں، بلکہ پہچان رہا ہوں، وہ یہ کہ اس کی داڑھی میں تنکا لٹک رہا ہے۔ سب اسی طرح کھڑے رہے، جو چور تھا، اس نے گھبرا کر اپنی داڑھی پہ ہاتھ پھیرا اور یوں چور پکڑا گیا۔ وہی حرکت تم نے اس وقت.....“

میں انک گیا۔ جانتا تو تھا میں، اس بے وقوف لڑکی کو..... آتی رہتی تھی وہ یہاں..... مگر اس وقت اس کی موجودگی اور میری شوخی کے باوجود، حاضرین اس طرح گم سم حالت میں تھے، گویا مراقبہ میں بیٹھے ہوں۔

”اور بھابی جان! دوسری بات یہ کہ بچی اللہ نہ کرے یتیم لیسر نہیں ہے۔ میں نے دیور کے ساتھ ہمدردی کی تھی۔ بیٹی اس کی جھولی میں ڈالی تھی۔ میرے منہ میں خاک، فاتحہ نہیں پڑھ لی تھی اس پر۔ اس نے تو مجھے کچھ بتایا نہیں کبھی۔ وہ تو ایک دو باتوں سے میں نے خود ہی اندازہ لگا لیا کہ کس طرح کاٹے ہوں گے میری بچی نے دن۔ جب تک گود خالی رہی، کیا کیا ناز اٹھائے۔ پاسے کے سونے کی پازیب تک پہنائی۔ جب گود میں اپنی بیٹی آگئی تو یہی آنکھوں کی ٹھنڈک آنکھوں کی جلن بن گئی۔ ہونہہ.....“

”جلن بن گئی تھی تو کہہ دیتے اپنی بچی لے آتے ہمیں بھاری ہے؟ ماشاء اللہ کنبہ بھرا پڑا ہے، چو لہے ٹھنڈے نہیں ہوتے اس گھر میں۔“ چھوٹی بچی نے بھی اضافہ کرنا ضروری خیال کیا۔

”اے ہاں۔ اور کیا کس چیز کی کمی ہے اس گھر میں؟“

”بات یہ ہے زرینہ بیٹی کی اٹھان دیکھ کر ہول رہی ہوں گی کہ اب شادی کے اخراجات بھی اٹھانے پڑ جائیں گے۔ یوں اور جان جلی رہتی ہوگی۔“ اب میری امی نے گرہ کھولی اور کہا۔

”یہ تو خیر میں بھی سمجھتی ہوں۔ ان کے باپ کو یقین نہیں آتا، دودھ کے دانت نہیں ٹوٹے ابھی ان کے بھائی بھادج کے، اتنا معصوم سمجھتے ہیں۔ چاہے ذکر کر کے دیکھ لیجیے گا۔ ہلدی

کی طرح پہلی ہو رہی ہے بچی۔ مگر مجال ہے جو وہ یہ مان لیں۔ بڑا غل چانے لگیں کہ ہماری بچی ہے بڑی عزیز ہے۔ ہونہہ..... وہ تو میں نے خود دیکھ لیا اسے کونے میں روتے ہوئے۔ میں نے کہا بس جی۔ کہیں اور زیادہ عزیز ہوگئی تو جان ہی نہ چلی جائے بچی کی۔“

بڑی پھوپھو اپنے دل کا غبار نکال رہی تھیں۔ سب ہمہ تنک وش تھے گویا آج کا سب سے ضروری کام یہی ہو۔

”میں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ..... فوراً کہا چلو، فوراً چادر اوڑھو.....“

”برقعہ“ بڑی پھوپھو..... مجھ سے چھوٹی تانیہ نے تسبیح کی۔

”اے ہاں وہی..... بڑے دیندار بنتے ہیں۔ چار سو بیس لوگ۔ روکتی رہ گئیں۔ میں نے بھی ایک نہیں سنی۔ کہہ دیا بل بنا کر بھیج دینا، جتنا خرچہ کیا ہے۔ یہ جو جوڑا پہن کر جا رہی ہے وہ بھی بھجوا دوں گی۔“

”اور برقعہ بھی.....“ تانیہ نے پھر ٹکڑا لگایا۔

بڑی پھوپھو نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ سہم کر (بناوٹ سے) امی سے لگ گئی۔ میں مسکراہٹ پر قابو نہ رکھ سکا۔

ایک نظر میں نے پتا پر ڈالی جو بے حد خاموشی سے اور بے تاثر انداز میں سر جھکائے اپنی ماں کے ”اقوال زریں“ سن رہی تھی۔ بیٹھی تو واقعی وہ اس انداز میں تھی۔

”تم کیوں برقعہ، برقعہ کرنے لگ جاتی ہو بیچ میں..... دیکھ نہیں رہیں بڑی پھوپھو کا کنکشن ٹوٹ جاتا ہے اور وہ بھول جاتی ہیں کہ کیا کہہ رہی تھیں۔“

میں نے تانیہ کو شرارت آمیز سرزنش کی۔

”میاں..... تم کیا بیچ رہے ہو یہاں؟ عورتیں اپنی باتیں کر رہی ہیں۔“ چھوٹی چچی تنک کر بولیں۔

”کاش ایسا ہوتا..... عورتیں اپنی باتیں کیا کرتیں۔ یہی تو بے چاری عورتوں کا مسئلہ ہے کہ دوسروں کی باتوں سے فرصت نہیں ملتی۔“

میں یہ کہہ کر جلدی سے کھسک گیا اور نہ شامت ہی آ جاتی۔

چار سو گز کے قطعہ اراضی پر بنایا ٹرپل اسٹوری یعنی سہ منزلہ گھر اپنے اندر رنگا رنگ انسان بسائے محو حیرت کھڑا تھا کہ ہر دیوار کی طرح اس گھر کی دیواروں کے کان بھی تھے اور آنکھیں بھی۔

اس گھر میں چار خاندان آباد تھے، تین بھائی اور ایک بہن۔

سب سے بڑے میرے والد محترم، سلیم احمد۔

پھر بڑی پھوپھو، ان کی دو بیٹیاں بشمول پتا اور ایک بیٹا تھا۔

ان سے چھوٹے چچا کے چار بیٹے تھے، ان چچا کا نام نسیم احمد تھا اور اسی قافیہ پر ان

کے چاروں بیٹوں کے نام تھے۔ سب سے بڑا سلیم تو میرا ہی ہم عمر تھا تقریباً۔

ان کے بعد ایک اور چچا تھے عظیم احمد، تین بیٹے اور دو بیٹیاں ان کی اولاد تھیں۔

پھر ان سے چھوٹے چچا سلیم احمد، ان کی دو بیٹیاں تھیں، بیٹا کوئی نہیں تھا۔

چھوٹی پھوپھو مستقل ریاست عمان میں مقیم تھیں۔ سالوں بعد ہی آیا کرتی تھیں۔

کیونکہ اس گھر کے مردکانوں کے کچے نہیں تھے، بردبار، حلیم اور تعلیم یافتہ تھے، اس

لیے گھر کا ماحول کبھی قابو سے باہر نہیں ہوسکا۔ پہلے میرے دادا جان سب کو سیٹھے بیٹھے تھے۔ ان

کے بعد میرے ابا جان یہ فریضہ انجام دے رہے تھے۔

ہاں تو میں دراصل آپ سے پتا کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

یہ تو آپ جان ہی چکے ہیں کہ موصوفہ میری فرسٹ کزن یعنی زرینہ پھوپھو کی بڑی

صاحبزادی ہوتی ہیں۔

اس گھر کا ہر بچہ میرے عتاب و شفقت اور شرارت سے نمٹے بغیر بڑا نہیں ہوا، لیکن یہ

وہ واحد لڑکی ہے جس سے میرا شرارت کا رشتہ رہا نہ سنجیدگی کا۔

اور رہتا بھی کیونکہ اس کے دیندار چچا نے غالباً محرم و نامحرم کی تلقین اسے گھول کر

پلائی تھی۔ صرف مجھ سے ہی نہیں، وہ ہر ایک مذکر سے پرہیز کرتی تھی۔ از خود بات کرنا تو دور کی

بات، انتہائی ضروری بات کا جواب بھی وہ ہاں اور نہ میں دینا بہت خیال کرتی تھی۔ کبھی کبھار

رہنے آتی تھی تو اندازہ ہو گیا تھا اس کی طبیعت کا۔

اب یہ جان کر کہ موصوفہ مستقل آ گئی ہیں۔ مجھے اس خبر سے نہ خوشی ہوئی نہ غم ظاہر

ہے، وہ اپنے والدین کے پاس آئی تھی کہیں اور تو نہیں۔ میرے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔

ان کے چچا کے ہاں گیارہ سال تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ سونے آگن میں رونق

کی غرض سے انھیں اپنایا گیا تھا۔ مجھے خاص یاد نہیں، سنا ہے بڑے تازوں سے پالا جا رہا تھا کہ

خدا نے چچا موصوفہ کو اپنی ”ذاتی“ اولاد سے نوازا دیا۔

بڑی پھوپھو کئی برس تک یہی کہتی رہیں کہ ان کی دیورانی دونوں بچیوں میں کوئی فرق

نہیں کرتیں۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ خبریں آنے لگیں کہ چچی ہی نہیں چچا بھی بدلے بدلے نظر

آتے ہیں۔

ماں ہونے کے ناتے بڑی پھوپھو کے یقیناً کان کھڑے ہوئے اور انھوں نے اپنے

نمایاں اوصاف میں وصف سراغ رسائی کا بھی اضافہ کیا اور اپنی انٹیلی جنس سروس کی داغ بیل

ڈالی۔ انٹیلی جنس کی سرکردہ رہنمائی بڑی پھوپھو کے علاوہ اس تنظیم کے کارکنان اور کون کون

تھے اس سے میں لاعلم ہی رہا کیونکہ مصروف انسان ہوں، دوئم پتا سے مجھے کوئی قلبی تعلق اور

وابستگی بھی محسوس نہیں ہوتی تھی، کیونکہ وہ منظر سے غائب ہی رہی تھی۔ مگر میری مصروفیات میں

اس گھر کا کچھ حصہ تھا ہی اس لیے اڑتے پڑتے کوئی نہ کوئی بات کان سن ہی لیتے تھے۔ اس لیے

پتا کے چچا چچی کے بدلتے موسم جیسے رویے کی بھنک مجھے بھی مل گئی تھی، اس سے قبل کہ میں اس

موضوع پر اظہار خیال کر کے خاندان سے ہم آہنگ ہونے کا ثبوت دیتا۔ پتا گھر میں نظر آ گئی۔

میں خاصاً ”تہلکہ خیز“ قسم کا انسان واقع ہوا ہوں (ویسے یہ گھر والوں کی رائے

ہے) سب کا خیال ہے کہ میری ”بڈی“ کو چین نہیں۔ ویسے پتا نہیں میں اس قدر مصروف کیوں

رہتا ہوں۔ کسی نہ کسی کام کی دھن مجھ پر ہر دم سوار رہتی ہے۔ جب کوئی کام نہیں ہوتا تو اپنے

کزنز، بشمول مونٹ، مذکر کی، چھیڑ چھاڑ میں مصروف ہو جاتا ہوں، حتیٰ کہ بروقت اگر کزنز

دستیاب نہ ہوں یا بہن بھائی مجھ سے بھی زیادہ مصروف ہوں تو میں اس سہ بالا عمارت کے

بزرگوں کو اپنا نارگٹ بنالیتا ہوں، یہ ان کی شفقت ہے کہ وہ مجھے برداشت کرتے ہیں۔

ایک اور خوبی ہے مجھ میں، جو ننانوے فیصد متعلقین نہیں جانتے وہ ہے، میری

رومانوی طبیعت۔ میرا اپنا ذاتی خیال ہے کیونکہ میں خاصا خوش شکل واقع ہوا ہوں، اور اس

رعایت کا فائدہ بھی اٹھالیتا ہوں کہ مجھے ہر موڑ پر نسوانی توجہ ضرور ملتی ہے۔

”تو پھر کیا مضائقہ ہے؟“

خاندان میں تو خیر کوئی بھی مجھے اس انداز میں نہ مل سکا، کہ اس پر میری یہ اضافی

خصوصیت آشکارا ہوتی، ایک مرتبہ اپنی خالہ زاد کو دیکھ کر میرا دل بے اختیار ہو چلا تھا۔ وہ بھی بھی

بڑی دلکش و طرح دار، یقیناً کریں، میں اس کے لیے از حد سنجیدہ ہو گیا تھا۔

لیکن یہ سوچ کر جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ ٹھکرا نہ دے، اور میں جو سب کا مذاق بنایا

کرتا ہوں، ہمیشہ کے لیے مذاق کا نشانہ بن جاؤں اور میرے ہاتھوں کے ستائے ہوئے لوگ

”رومان“ چھینکتا ہوا رومان ہی کھانتا ہو۔

مگر ہوا یوں کہ وہ بھی شوہروں کو پیاری ہو گئیں۔ کوئی عشق تو تھا نہیں کہ جان کا روگ

بن جاتا۔

اب سچ کہوں گا تو آپ میں سے بہت سی خواتین برا مان جائیں گی۔ مگر یہ حقیقت ہے۔ میرا ہر رومانس جوابی تھا، میں تو ”ان“ سے دوستانہ اسٹائل میں ملتا تھا۔ وہ ہی جب نظر التفات سے مجھے شکار کرنے کے درپے ہوتیں تو میں کیسے نظر بچا سکتا تھا؟

لیکن یہ حقیقت تھی اس دن کے بعد میں نے کسی کزن کو لفٹ نہیں کرائی۔ جب ایک فرم میں ایک اعلیٰ عہدے دار کی حیثیت سے میرا تقرر ہوا تو خاندان میں میری حیثیت ہزار گنا نمایاں ہو گئی اور میں بدلتے انداز پہچاننے لگا۔ مگر میں نے فوراً ہی اعلان کر دیا تھا کہ میں ہرگز ہرگز خاندان میں شادی نہیں کروں گا۔ اگر مجھ پر زور ڈالا گیا یا زبردستی کی گئی تو میں کسی غریب اور ایک درجن بچوں کی حامل ”بیوہ“ سے نکاح پڑھوا کر ثواب دارین حاصل کروں گا۔

امی تو اس دھمکی سے ایسی خوفزدہ ہوئیں کہ سال بھر تک کسی بیوہ کا با آواز بلند تذکرہ کیا نہ کسی کے بیوہ ہونے کی خبر مجھ تک پہنچنے دی۔ انھیں یہ یاد نہیں رہا کہ ”بیوہ“ سے نکاح کرنے کی دھمکی میں نے کس وجہ سے دی تھی، انھیں وجہ یاد نہیں تھی۔ بس ”بیوہ“ یاد تھی۔

اس سہ بالا منزل کے اکثر بچے بڑے ہو چکے تھے، آئے دن ان کی شادی بیاہ کے ہنگامے پارہتے تھے۔

آج کل مجھ سے چھوٹی تانیہ کی شادی کا غلغلہ شروع ہو چکا تھا۔ بڑے بھائی کی حیثیت سے مجھ پر ذمہ داریاں آ پڑی تھیں۔ آفس سے واپسی پر میری مصروفیت کے نئے انداز شروع ہو جاتے۔

ہمارے ہاں یہ خصوصیت بھی ہے کہ ہر قسم کا فنکشن اللہ تعالیٰ کے ذکر سے شروع ہوتا ہے، یعنی قرآن خوانی اور میلاد کا سلسلہ لازمی ہوتا ہے۔ تانیہ کی رسم مایوں سے پہلے قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ گھر میں کچا کچھ مہمان بھرے ہوئے تھے۔ ایک ہاؤسکار میج رہی تھی۔ دور دراز سے آنے والے مہمانوں کے سامان سے شریک محفل ٹھوکریں کھاتے پھر رہے تھے۔

قرآن خوانی کے سلسلہ میں تیار مٹھائی مین گیٹ تک پہنچ چکی تھی، اب وہاں سے ڈھویا ڈھوئی کا سلسلہ تھا۔ میں بالوشاہی کے تین بڑے بڑے ”پیک“ اوپر تلے رکھ کر اندر چلا، مگر راہداری میں اوٹی کی آواز کے ساتھ میں گرتے گرتے بچا۔ بمشکل ایک ”پیک“ سنبھال پایا، دو

رگن رگن کر بدلے لیتا شروع کر دیں۔ آخر غیرت مند مرد ہوں، اس سے بڑا تازیانہ میرے لیے کیا ہو سکتا تھا؟

بہر کیف میرے ذہن میں تجویز آئی کہ کیوں نہ تنہائی میں ”خالہ زاد“ کے خیالات معلوم کر لیے جائیں۔

ایک مرتبہ گھر میں چھوٹے پیمانے پر کوئی گھریلو تقریب تھی، میں نے اپنی خالہ زاد کو بڑے سرسری سے انداز میں کہا کہ میں اسے ایک بات بتانا چاہتا ہوں، دوران تقریب وہ دادا جان کے کمرے میں دو منٹ کو میری بات سن لے۔ اس نے مسکرا کر بات سننے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

میں بڑے اہتمام و تیاری کے ساتھ خود پر قابو پاتا ہوا مقررہ وقت پر دادا جان کے کمرے میں داخل ہوا۔ جیسے ہی میں نے اندر قدم رکھا، دروازے کے پیچھے سے کئی ”ہاؤ“ ابھرے، ایسی طبیعت مکدر ہوئی اس ”تحریک نسواں“ کے بعد کہ خدا جانتا ہے۔ خاندان کی ایک ایک لڑکی کا نام لے کر لعنت بھیجی۔

وہ سب مجھے گھرے میں لے کر گانے لگی تھیں۔

لال میری پت رکھو بھلا جھولے لال

سب سے آگے میری اسی خالہ زاد نے ”دھال“ ڈالی تھی۔

اس دن کے بعد مجھے محسوس ہوا گویا میری رومانی جس کا لاشہ دلہیز پر پڑا ہو، اور وہ

سب اس پر دھال ڈال رہی ہوں۔

اور میں زاہد خشک ہو چلا ہوں، اس دن کے بعد میں نے کانوں کو ہاتھ لگا لیا، اگر مجھے کروڑوں کی پیشکش کے ساتھ بھی کسی کزن کا رشتہ دیا گیا تو میں قسم کھا کر بہن بنالوں گا۔

میری مردانہ غیرت پر یہ ضرب کاری تھی۔

اب وہ خالہ زاد شادی شدہ ہے باقاعدہ، گود میں معصوم بچہ بھی ہے۔ جب بھی وہ گھر آتی ہے، میں اس کے سامنے اس کے بچے سے کم از کم تین بار ”ماموں“ ضرور کہلاتا ہوں۔

شاید اس دن کی خفت میرے لیے ہمیشہ کا عذاب بن گئی ہے۔

یونیورسٹی کے عہد میں تو ایک دو قابل ذکر رومان مجھ سے سرزد ہوئے۔ یہ میری طرف سے شروع نہیں ہوئے بلکہ بطور ”جوابی حملے“ کے سرزد ہوئے۔ اب آپ جانیں مکمل انسانیت اور حسن بے پناہ سامنے ہو تو کوئی کافر دامن بچا سکتا ہے اور پھر اس کے لیے تو اور بھی مشکل جو

رشتوں کے ریشم

بعض انسانی کمزوریاں ایسی برہنہ حقیقتیں ہوتی ہیں کہ انسان ان سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ جیسی میری اپنی طبیعت کی کمزوری..... رومان پسندی، ظاہر ہے انسان اپنی توہین آپ کرنے کی ہمت و جرأت نہیں رکھتا۔ میں اسے رومان پسندی کہہ رہا ہوں۔ آپ مجھے دل پھینک کہہ سکتے ہیں۔ اتنی تو رعایت انسان اپنے ساتھ کرتا ہی ہے کہ زہریلی حقیقت سے نظر بچا سکتا ہے۔ الفاظ بدل کر خود کو فریب دے سکتا ہے۔

بعض اوقات ڈھونڈنے سے من چاہا وقت میسر نہیں آتا اور بعض اوقات سان و گمان سے بھی پرے سے خوش کن لمحے نگارش زندگی بن جاتے ہیں۔

اب یہی دیکھ لیں کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ بودی اور بوگی سی لڑکی بھی مجھے متوجہ کرے گی، ویسے بھی آج کل میں ”خزاں“ کے دور سے گزر رہا تھا۔ زندگی میں کوئی پلچل ہی نہیں تھی۔ میں رومان پسندی مگر ”بازوق رومان پسند“ ہوں۔

خدا معلوم، وہ کیسے میرے ذوق پر پوری اتر گئی تھی؟

اپنے اور عظیم کے مشترکہ دوستوں کی تواضع و مدارت کے لیے کہنے، میں مہندی والی رات کچن میں آیا۔ ذہن میں یہی تھا کہ بے چاری ملازمہ برتنوں کے ڈھیر کے سامنے کھڑی ہر پیالے، ہر پلیٹ میں اپنی تقدیر کا زانچہ استخراج کر رہی ہوگی، یعنی خوشیوں کے جہوم میں گھرے اس گھر کی تھکی ماندی ملازمہ یقیناً اپنی خوشیوں سے محروم اور چاکری سے پر زندگی کے بارے میں سوچ رہی ہوگی۔

عموماً خوشیوں کے یہ لمحے گھریلو ملازمین کے لیے کسی امتحان سے کم نہیں ہوتے، ویسے میں اس سلسلے میں خاصا حساس واقع ہوا ہوں۔

تمام لوگ مہندی لے کر گئے ہوئے تھے، گھر میں تانیہ، امی اور بڑی پھوپھو موجود تھیں۔ یا پھر لڑکوں میں، میں اور عظیم۔ اس قدر کے آدم زادے گھر سے باہر تھے لامحالہ غیر معمولی خاموشی صاف محسوس ہونا تھی۔

سوچا تو یہی تھا، اگر ملازمہ کام کر رہی ہوگی تو چائے کے لیے امی یا پھوپھو کو کہوں گا کچن میں دروازہ اندر داخل ہوا تھا۔

وہ بڑے سے پتلے میں موجود دودھ جو ریشم کے ایک کونے میں دھرا تھا۔ بغور دیکھ رہی تھی۔ کپڑا ہاتھ میں تھا۔ گویا دودھ کو جوش دیا جا رہا تھا۔

”بھلا، اس قدر غور سے دودھ کو دیکھنا اور اتنا الرٹ ہو کر خود کو ٹینشن میں رکھنا، کہاں

لڑھک گئے۔ بھٹا کر ٹکرانے والے کی سمت نظری، وہ پتا تھی۔ باہر بکرا ذبح ہوا تھا وہ تھال میں غالباً اس کا گوشت اٹھائے جا رہی تھی، یوں سمجھیے وہ شمال کی سمت جا رہی تھی اور میں مغرب کی سمت۔

اب دیکھنے والا سین تھا، گوشت کی بوٹیوں نے اس کا چہرہ اور کپڑے خون آلود کر دیے تھے، وہ زمین پر گری ہوئی تھی، پھر اس پر بالوشاہی کے دو ڈبے لٹے ہوئے تھے، وہ کیونکہ بندھے ہوئے تھے، اس لیے کھل کر نکھرنے سے مٹھائی بچ گئی تھی۔

وہ عجیب خفت آمیز تاثرات کے ساتھ خود کو سنبھال رہی تھی، ایک جہوم بیکراں ہم دونوں کو گھیر چکا تھا۔

پتا کی حالت غیر تھی۔

”گھبراؤ نہیں پتا۔ فیضان بھائی تمہارا صدقہ اتار رہے ہیں۔“ یہ میری ”وہی“ خالہ زاد تھی۔ ایک مشترکہ فرمائشی تہقہہ پڑا۔

میں نے ڈبے سمیٹتے ہوئے پتا کو غیر ارادی طور پر دیکھا تھا۔ اس کی شکل تازہ تازہ خون کی وجہ سے عجیب مضحکہ خیز نظر آنے لگی تھی، کھڑے ہوئے لوگ ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے۔

”تیری پیاری پیاری صورت کو کسی کی نظر نہ لگے۔“ ندا کی شوخ آواز آئی۔

”چشم بدوز“ باقی لڑکیوں نے کورس میں کہا۔

پتا مارے شرمندگی کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

میں نے اپنی نرم دلی کے ہاتھوں یہ بے ساختہ حرکت کی کہ اس کے شانے پر بے اختیار ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔

”اتنی زور سے کرنٹ مارتے ہیں، آپ فیضان بھائی!“ حرا نے شوخی سے تعجب کیا۔

”ہم ابھی آپ کو جنرل پر رکھ دیتے ہیں۔ صبح سے لائٹ گئی ہوئی ہے۔“ ایک اور

کزن بولی۔

میں خاموشی سے بوٹیاں چن کر تھال میں ڈالنے لگا تھا۔ میں کبھی بکھار ہی اپنی کزنز کے پھندوں میں پھنستا تھا مگر جب بھی پھنستا تھا، بڑا پھنستا تھا۔

پھر دو چار کزنز ندا، حرا سمیت گوشت کی بوٹیاں سینے میں میرے ساتھ شامل ہو گئی تھیں۔ اور پتا کونہا دھو کر صاف ستھرا ہونے کی تلقین کے ساتھ منظر سے ہٹا دیا گیا تھا۔

.....

کی عقلندی ہے؟ جوش آنے لگے تو برز کو بند کر دینا بھی۔“

وہ واقعی بہت انہماک کے عالم میں دودھ میں ڈوبی ہوئی تھی، میری آواز پر بڑی طرح چونکی، پھر خفیف سی ہو کر رہ گئی۔ اور برز کی نو بڑھاتے ہوئے بولی۔

”تازہ دودھ کو کئی جوش دینا ہوتے ہیں، ورنہ عجیب سی بو آتی رہتی ہے، اب کیا بار بار چولہا جلاتی رہوں۔“

”یہ کون سا دودھ ہے جو رات دس بجے تک تازہ ہے؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”آیا تو شام کو تھا۔ فرج میں رکھا تھا کیونکہ کوئی بڑا برتن ”فارغ“ نہیں تھا۔“

وہ مجھے بہت تفصیل اور تخیل سے جواب دے رہی تھی۔ بڑے سادہ انداز میں۔ اب کیونکہ وہ مستقل آگئی تھی، اس لیے شاید اس نے میری گھریلو پوزیشن محسوس کر کے کترانے اور کتنی کاٹ کر نہ گزرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یا پھر وہاں کی تربیت وہیں چھوڑ آئی تھی میں نے بغور اس کی سمت دیکھا۔

وہ زرد اور سرخ پھولوں والے کرتے سرخ شلوار دوپٹے میں بڑے گھریلو اور سادہ قسم کے تاثرات چہرے پر سجائے ہنوز مصروف تھی۔ مگر اب شاید وہ پریشان سی ہو گئی تھی، میری موجودگی سے۔ اور پھر اب تو میں اسے دیکھ بھی رہا تھا۔

وہ بہت دلکش لڑکی تھی، اس کے میک اپ سے عاری چہرے میں اس بلا کی جاذبیت تھی کہ مجھے سخت حیرانی ہوئی کہ مجھے آج تک اس کی دلکشی کا احساس کیوں نہ ہو سکا۔ اس کے چہرے کی جلد میں عجیب نمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ تمام داغ دھبوں، لکیروں سے پاک اُجلا اُجلا چہرہ اور خوبصورت گھنیری پلکیں۔

دلکشی تو صحیح معنوں میں یہ ہے۔ سادہ سی زلفیں اور دھلا ہوا چہرہ اور کشش کا یہ عالم..... ہر لحظے ہر لمحے میں موجود اور غائے سرخی سے پاک دلکشی۔ میں سچ سچ متاثر اور اپنی اب تک کی بے خبری پر متاسف تھا۔

وگر نہ اب تک میں نے جن لڑکیوں کو دیکھا تھا وہ تو گھر میں بھی ایسی ہوتی تھیں۔ گویا کہیں پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہوں۔

اس دن صحیح معنوں میں مجھے دلکشی کا ادراک ہوا۔

وہ میری نظروں سے اس قدر ڈسٹرب ہو گئی تھی کہ کام سے بے خبر ہو گئی تھی۔ نتیجتاً دودھ اُبل کر تمام اطراف اُٹا اُٹا کر بہنے لگا۔ برز دودھ گرنے سے خود بخود بند ہو گیا۔ اس نے

بے ساختہ دودھ کا برتن اٹھانا چاہا تو پکتا ہوا دودھ اس کے ہاتھوں پر آگرا۔ احساسِ ندامت تھا، میری موجودگی کی گھبراہٹ یا ہاتھ جلنے کی تکلیف اس کی کنوڑی کی آنکھیں بھر آئیں۔

میں نے بے ساختہ اس کے ہاتھ تھام لیے تھے، جب وہ تکلیف سے بلبلاتا کر پیچھے ہٹی تھی اور اس کے ہاتھ سے کپڑا لے کر آہٹگی سے اس کے ہاتھ صاف کیے۔

پھر اپنے کمرے سے برنال نکال کر اس کے پاس واپس کچن میں پہنچا تو وہ غائب تھی۔ وہاں سے پلٹا۔ اس کے کمرے میں چلا آیا نہ جانے کیال رہی تھی اپنے ہاتھوں پر، آہستہ آہستہ موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے سلسلہ وار بہہ رہے تھے۔

میری حیرانی سوا ہو گئی۔ یقیناً جلنے کی تکلیف خاصی ہوتی ہے۔ لیکن اتنی بڑی اور سمجھ دار نظر آنے والی لڑکی کا قاعدہ روئے۔ یعنی رتی برابر قوتِ برداشت نہیں اس لڑکی میں۔ گویا بہت ہی ناچختہ ذہن کی مالک ہے۔

”کیا بہت تکلیف ہو رہی ہے؟“ میں دروازے میں جے رہنے کا ارادہ ترک کر کے اندر چلا آیا۔ وہ چونک پڑی اور جی بھر کے شرمندہ نظر آئی۔

”اور یہ تم نے کیا لگا لیا ہے؟ برنال لگاتیں تو تھوڑی دیر میں جلن ختم ہو جاتی۔“ نہ جانے کیا لال پیلا سا مرہم لگا بیٹھی تھی۔

آپ یقین کریں، میں نے کسی غلط جذبے کے تحت نہیں بلکہ صرف اور صرف اس کی تکلیف کا اندازہ کرنے کے لیے اس کے ہاتھ تھام کر دیکھنا شروع کیے تھے۔

اس کے دل کی دھڑکنوں کی بے ترتیبی، میں اس کے لرزے ہاتھوں سے محسوس کر سکتا تھا۔

میرے ہاتھوں کی گرفت اتنی مضبوط اور قطعی تھی کہ وہ مجھے نہایت درجے کی بے بس حالت میں نظر آئی۔

”اوہ!“ اب میں اس کی غیر حالت کو سمجھا، اتنی پردے دار لڑکی میرے سامنے بغیر دوپٹے کے تھی.....

مجھے اپنے طور پر سخت کوفت و ندامت کا احساس ہوا، اور نہ جانے کیا عجیب سا محسوس ہوا بس پھر میں ٹیوب وہیں رکھ کے واپس آنے لگا۔

یقین کریں پھر وہ گاؤ دی اور سادہ سی لڑکی مجھے نہیں بھولی۔ تقریب کے ہنگامے اپنی جگہ اور میری طبیعت کی سرشاری اپنی جگہ۔

بس اس پر ایک سرسری سی نگاہ ڈال کر مطمئن اور سرشار ہو جاتا تھا۔
بے باک، نڈر، شوخ، برجستہ گولڑکیوں کے بیچ وہ نظریں چراتی ہوئی، شیشائی، گھبرائی
سی، بہت منفرد محسوس ہو رہی تھی۔

میری نظریں اس خاموش پیام پہنچا چکی تھیں، میں اپنی بے ساختہ حرکتوں سے اس
پر اپنے دل کی کیفیت عیاں کر چکا تھا۔ اس لیے اس کی زیادہ سے زیادہ کوشش ہوتی تھی وہ
میرے سامنے نہ آئے۔

تانیہ کے ویسے والے دن تمام افراد ہی تقریباً گاڑیوں میں لد چکے تھے۔ وہ کیونکہ
ایک ذمہ دار قسم کی لڑکی تھی، اس لیے گھر کے حفاظتی اقدامات اور نوکروں کو ہدایت دینے کے لیے
میری امی سے بھی زیادہ مصروف تھی۔

میں نے اس دن پرانی فلموں کے ہیرو والا ایک کام یہ کیا کہ لان سے سرخ گلاب کی
ایک ادھ کھلی کلی توڑی اور اس کے پاس آ گیا۔ وہ نوکر سے بات کرنے میں مگن تھی۔

”یار! میرے کمرے سے میرا سگریٹ لائٹر تولے کر آؤ۔“ میں نے اسے مالا۔ نوکر
کے باہر نکلتے ہی وہ بھی تیزی سے باہر جانے لگی۔

”بات سنو پتا.....!“ وہ رک گئی میری آواز پر، مگر ہلچلی نہیں۔

میں نے اس کے بالوں میں کلی اٹکا دی۔ میرے خیال میں اس کی خاموشی اور
کترانے کی ادا میں تمام جنوں کا حاصل بھی اور جواب بھی تھا۔

میری اس حرکت سے اس کی حالت غیر ہو گئی۔ مجھے ترس سا آ گیا۔
”جو دوسروں کی زندگی سے سکون چھین لیں، وہ دوست نہیں، دشمن ہوتے ہیں۔ میں

تم پر قطعی رحم نہیں کر سکتا۔“

باہر تمام گاڑیاں بھر چکی ہیں مگر میں نے اپنی گاڑی کی اگلی سیٹ تمہارے لیے خالی
رکھی ہے۔ تانیہ کی سرال بہت دور ہے، میں یہ طویل راستہ تمہاری موجودگی میں..... خوشگوار

انداز میں کاٹنا چاہتا ہوں۔ سمجھیں۔“

”نہیں.....“ وہ جیسے بے ہوش ہونے کے قریب ہو گئی۔

”کیا نہیں.....؟“ میں اس کے قریب آ گیا۔ ”بھئی یہ تو سراسر چور کی داڑھی میں
تیکنے والی بات ہوگی۔ برائی کیا ہے؟ بھئی ہمارے گھرانے میں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ تم

میری فرسٹ کزن ہو، میری ساتھ اسی گھر میں رہتی ہو.....“

”مگر آپ سے ڈر لگتا ہے۔“

”کیوں.....؟“ میں بے ساختہ مسکرا دیا۔

”کیا معلوم.....“ وہ کہہ نہ سکی، یکدم چپ ہو گئی۔

”کیا معلوم آج اعلان کردوں کہ میں بھی مجنوں کے شاگردوں میں شامل ہو چکا
ہوں۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے میں استاد مجنوں کو بھی کر اس کر جاؤں گا..... اگر تمہاری یہی
ادائیں رہیں۔“

وہ تقریباً بھاگ کھڑی ہوئی۔

کئی قہقہے میرے اندر گھٹ کر رہ گئے۔ ملازم آتا دکھائی دیا تھا، اس کے ہاتھ میں کوئی
سگریٹ لائٹر نہیں تھا۔ اور وہ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ تو میری جیب میں تھا۔

تانیہ کی شادی کے ایک ہفتے بعد ہی مجھے چھ ماہ کے لیے جاپان جانا پڑا، ایک کورس
کے سلسلے میں۔ بس میرا جاپان آنا ہی غضب ہو گیا۔ جیسے گھر والوں پر میری شادی کا بھوت سوار
ہو گیا۔

کبھی تانیہ تصویر بھجوا کر رائے پوچھ رہی ہے، اور کبھی امی۔

میں نے کیونکہ فی الحال شادی وادی کے بارے میں کوئی پلان نہیں بنایا تھا، اس لیے
میں نے اس سلسلے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔

مگر ایک دن میں چونک پڑا۔ تانیہ نے اپنے شوہر کی ایک قریبی کزن کی تصویر بھجوا کر
اور خط میں قصیدے کا رنگ بھر کر مجھے چونکایا۔ دراصل وہ تعلیم کے لحاظ سے بڑی غیر معمولی قسم کی
شے تھی۔ والدین مالٹا کے جزیرے میں جانے کیا مہم سر کر رہے تھے، لڑکی اپنے بڑے اور شادی
شدہ بھائی کے پاس مقیم تھی۔

اس کی تصویر پر ایک نظر ڈال کر میں مبہوت ہو کر رہ گیا..... اتنی دلکش اور حسین جیسے
تصویر..... اور کتنی خوش کن بات کہ یہ غیر معمولی سی چیز مجھے وابستگی کا اعزاز دے سکتی ہے۔ تانیہ
نے یہی کہا تھا۔ اگر میں ہامی بھریوں، تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، واقعی انسان اگر عمدہ اور بھرپور انداز
میں زندگی گزارے تو زندگی کا مزہ ہے۔ جب اس سے وابستہ ہر شے دلکش اور عظیم الشان ہو۔

اس تصویر کے پیچھے مجھے پتا انتہائی پسماندہ اور صبر آزما چیز نظر آئی۔ میں اس ماحول
کے اثر سے آزاد ہو چکا تھا۔

تانیہ کو رضامندی کا خط بھجوا دیا..... اس وقت تو مجھ پر نئی دھن سوار ہو چکی تھی۔ چھ ماہ۔

کے بجائے مجھے جاپان میں تقریباً دس ماہ لگ گئے۔

واپس پاکستان پہنچا تو سب شدت سے میرے منتظر تھے۔ میرے پہنچنے کی دیر تھی، میری شادی کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا۔

ایک ماہ کے اندر اندر شمع میری ہو گئی۔ اپنے تمام تر اُجالوں سمیت۔ وہ واقعی ایک نشہ، ایک راز، ایک ”وقت“ تھی۔ وقت محیط ہوتا ہے اور میں اس محیط میں بند ہو چکا تھا۔

مجھے مہینوں خیال نہ آیا کہ پتا کے بارے میں سوچ سکوں۔
شمع کی ہنسی، شمع کی مسکراہٹ، میرے ذہن کو منجمد کر رکھتی تھی۔
جیسے وہ تو یہی عمل کی حامل ہو اور میں اس کا معمول۔ دراصل اس کی شائستگی نے اس کی تمکنت تک کو حسن دے دیا تھا، میرا اس قدر خیال رکھتی اتنا مجھے چاہتی۔
کہ میں اپنے زمان اور مکان۔

اپنے وقت۔

اپنے پہرے کے ہمراہ کسی اور دنیا کی حدود میں داخل ہو گیا۔ جہاں میں تھا اور شمع تھی۔
پھر ایسا ہوا کہ میں اتنا بے حس ہو گیا کہ دروازہ اس کے سامنے ہوتا اور نظر انداز کر دیتا۔
میں نے کبھی اس کا چہرہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔
نہ اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا، اول تو میرا اس سے سامنا ہی نہیں ہوتا تھا۔ اگر
ہوتا بھی تو یوں کہ شمع کو اپنی خدمت گزار، قسم کی سسرالی، بہت بھائی تھی اکثر وہ اسی سے مخاطب
ہوتی تھی۔

”پتا ڈیر، ذرا میرا بلاؤز استری کرو۔“

”پتا جی، میرے بالوں میں رول لگا دو پلیز۔“

ایسے میں جب وہ ہمارے بیڈ روم میں داخل ہوتی تو میں بڑی تندہی سے مطالعے
میں مگن ہو جاتا۔ اور مطالعے کا مرکز چہرے کے بالکل سامنے کر لیتا۔ شمع اس سے اپنا کام بھی
کراتی جاتی، اور خود ہی باتیں بھی کرتی جاتی۔
کسی پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہوتی تو وہ اس سے مدد لیتی، پھر پور پور سے ج
کر، تیار ہو کر وہ پتا کے مقابل کھڑی ہو کر پوچھتی:

”ٹھیک ہے؟ کیسی لگ رہی ہوں.....؟“ شمع تفاخر سے پوچھتی۔

مجھے نہیں معلوم۔ اس وقت پتا کے چہرے کے تاثرات کیا ہوتے تھے؟ کیونکہ میں

اپنے اندر اتنی اخلاقی جرأت نہیں پاتا تھا کہ ”چہرے“ پر نمک چھڑکنے کا مظہر دیکھوں۔
آدمی مطمئن اور شکم سیر رہتا ہو تو بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی روح میں بھی
جھانکے۔ اور احتساب کے عمل سے گزرے۔

لیکن جب وہ کسی اندوہناک واقعے سے یوں گزرتا ہے جیسے کانچ پر چل رہا ہو تو وہ
اپنے کانچے وجود کو سنبھال کر اپنے خمیر کی سمت متوجہ ہوتا ہے۔ اور خمیر ہی انسان کا اصل ہے۔
مجھے قدرت نے اس طرح احتساب کے عمل سے گزارا۔ جب شمع خفی نورالعین کو
میرے بازوؤں میں دے کر مجھے تنہا کر گئی تو میری حالت پاگلوں سے بدتر ہو گئی۔

ایسا پتھر ہوا کہ آنکھوں کے سوتے گویا خشک ہو گئے۔

اس بچی کو کیا ملا؟ او اکیلی لیسیری۔ مامتا سے محرومی۔

اور مجھے، محض سراب سی خوشی..... خواب جیسا سکھ۔

آہستہ آہستہ اس گھر کی تقریباً سب ہی لڑکیاں رخصت ہو چکی تھیں۔ میری ”کزن
مارکہ“ قسم کی بھابیوں کی خاصی بھیڑ ہو چلی تھی۔

امی معصوم یعنی کو سنبھال رہی تھیں۔ بڑی پھوپھو الگ میری دلجوئی میں مصروف
نظر آتیں۔

اور ”وہ“ جب میری ماں کو نڈھال دیکھتی تو بڑے پیار سے یعنی کو لے کر اپنے کمرے
میں چلی جاتی۔

حرا ابھی باقی تھی، وہ پڑھ رہی تھی اس نے فی الحال شادی سے انکار کر دیا تھا اور ایک
دو کزنز بہت معصوم بچیاں تھیں۔ پورے گھر میں صرف پتا ہی مصروف عمل نظر آتی تھی۔ یہاں
سے وہاں۔

اب جب میں تھکا ہارا ستم ہائے روزگار سے نمٹ کر گھر پہنچتا تو کوئی مسکراہٹ میرے
دل میں خوشی کے دیے اُجالنے..... موجود نہ ہوتی۔ ایک عجیب سی بیگانگی زندگی میں در آتی تھی، اور
وہ جو اس کہانی کا اہم اور سب سے مظلوم کردار ہے وہ تو گویا میرے سائے سے بھی پناہ مانگتی تھی۔
اول تو مجھے نظری نہیں آتی تھی۔ دوئم میں خود اس کا سامنا کرتے ہوئے کتراتا تھا۔
مجھ میں ہمت کہاں تھی کہ اس کے لبو رنگ دکھوں کا سامنا کرتا جو میری جانب سے
اسے ملے تھے۔

میرے ہر جانی پن کے گھاؤ،

بے وفائی کے ناسور۔

جنہیں وہ کسی بخشش کی طرح سنبھالے ہوئے تھی۔

شمع کو جدا ہوئے گیارہواں مہینہ چل رہا تھا۔ جب امی نے میرے سر پر ہم سادے مارا وہ پتا کے سلسلے میں میری رائے لے رہی تھیں، جو نہ جانے اتنی لڑکیوں میں سے کیسے بچ گئی تھی، حالانکہ وہ بد شکل تو نہیں تھی۔

میں بوکھلا کر رہ گیا۔

”امی..... پتا نہیں مانے گی.....“ میرے لہجے کی خجالت تین میں بدل گئی۔

”کیوں.....؟“ امی کی حیرانی خاصی زیادہ تھی۔

اس کیوں کا جواب دینے سے بہتر تھا، میں بن باس کا نئے نکل کھڑا ہوتا۔

”ایسے ہی..... دیکھیے ناں..... میں ایک بچی کا باپ ہوں؟ مجھے آخر کچھ تو کہنا تھا۔

”تو اس سے کیا ہوتا ہے، بوڑھے تو نہیں ہو..... بھری بہار میں کھیتی اُجڑی ہے۔“

امی کی آواز بھڑا گئی۔

اور میرے اندر وحشتیں اُتر آئیں۔

”تمہاری پھوپھو تمہیں بیٹوں کی طرح چاہتی ہیں۔ وہ تمہاری پریشانی نہیں دیکھ

سکتیں، ان سے پوچھ کر ہی تم سے بات کر رہی ہوں۔ اُنھیں قطعی کوئی اعتراض نہیں۔“

”لیکن امی..... پتا.....؟“ میں پھر الجھا۔

”وہ ماں کے سامنے نہیں بول سکتی۔“

”پھر یہ تو اس پر ظلم ہوا ناں۔“ میں پتا نہیں یہ جملہ کیوں کہہ بیٹھا، جیسے مجھے اس کا

بہت خیال رہا ہو۔

”کوئی ظلم ولم نہیں ہے، ہمارے خاندان کی بچیاں اپنے والدین کی خوشی دیکھتے

ہوئے فیصلے کرتی ہیں اور پھر یعنی پتا کے قریب ہو رہی ہے۔“ امی نے سمجھایا۔ (اتنی ریت ایسا

ہو پتا۔ ذرا دیر کو تو میرے لیے چیلنج بنتی)

”ٹھیک ہے پھر۔“

یقین کریں، میری یہ آمادگی جبری نہیں، پر خلوص تھی۔ (بسیہ نہیں) سچ کہہ رہا ہوں۔

میں نے یہ سوچ کر ہامی بھری کہ ضمیر کی غلطی مٹانے کا سنہری موقع مل رہا ہے۔ اگر ہو سکا تو

معافی تک مانگ لوں گا۔

رشتوں کے ریشم

پھر ایک سادہ ور نکلیں سے سے وہ میری ہو گئی۔ (وہ تو شاید ہمیشہ سے میری تھی)

رات دو بجے تک میں نے لان میں سگریٹ کے کئی پکٹ پھونک ڈالے مگر میری

ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس کا سامنا کر سکوں۔ ایک عجیب سا خوف تھا۔

میرا باطن اس پر گویا قرض کی صورت چڑھا ہوا تھا۔ مجھے اندیشہ ہوا رہے تھے کہ

میرا قرض ضرور لوٹائے گی۔

یعنی پھوپھو کے پاس تھی۔ آج رات کے لیے وگرنہ میں یہ سوچ کر ہی قدم اندر رکھ

دیتا کہ وہ یعنی میں مصروف ہو گئی۔

بہت ہمت کر کے آخر میں اپنا ہی سامنا کرنے کمرے میں داخل ہوا تو حیرت کا

شدید جھٹکا لگا۔ وہ لان کے ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں کروٹ کے بل رخسار کے نیچے ہاتھ رکھے

بے خبر سو رہی تھی۔

مٹے مٹے میک اپ کے نشان اس کے چہرے پر موجود تھے۔

نکاح کے وقت میں نے دیکھا تھا۔ وہ بہت دلکش اور خوبصورت لگ رہی تھی۔

میری ایک بے وقوف سی کزن ہے۔ اسے ہمیشہ بے موقع بات کرنے کی عادت ہے

مجھ سے چپکے سے بولی تھی..... ”آج تو شمع بجھ جائے گی۔“ میں جڑ سا ہو کر رہ گیا تھا۔

میں نے ”معذرت نامہ“ اپنے ذہن کے ہی کسی خانے میں بند کر کے کپڑے تبدیل

کیے اور خود بھی سو گیا۔ حالانکہ نیند بڑی منتوں کے بعد آئی تھی۔

اس کا قرب مجھے آنچ کی طرح محسوس ہو رہا تھا مگر میں بہت مجبور تھا۔



اس کی مسلسل خاموشی سے حوصلہ پا کر ایک روز میں نے اس سے بے توجہی کا گلہ کر

دیا۔ وہ یعنی کی فراک بدل رہی تھی، رک گئی، مجھے غور سے دیکھا اور مسکرا دی، پھر اپنے کام میں

لگن ہو گئی۔ میں بھڑکتے تنور میں جا گر تھا۔

وہ میرا اور یعنی کا بہت خیال رکھتی تھی۔

جو میں کہتا وہ سنتی اور مانتی۔

بعض اوقات میں اسے بے وقت پریشان کر دیتا اور وہ تھل سے جھیلی۔

میں نے اس کے چہرے پر بدلتے رنگ نہیں دیکھے، ہمیشہ سمندر کی سطح جیسا سکون

دیکھا، ایسا سکون جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ مگر یہاں تو چار ماہ گزر گئے۔ کوئی سیلاب

”تانیہ کے بچے کی پرسوں سے طبیعت خراب ہے، امی کہہ رہی تھیں آپ کو بتادوں۔“
اور یہ آپ نے کل والی شرٹ کیوں پہن لی۔ میں نے دوسری لٹکا دی تھی ناں۔“
وہ اٹھ کر کمرے میں ادھر ادھر آنے جانے لگی۔

میرے دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگے۔
”یہ رومال.....“ اس نے مجھے تہہ شدہ صاف ستھرا رومال پیش کیا۔
”اپنا خیال رکھا کرو پتا۔ میں بہت پریشان ہو جاتا ہوں۔“
میں نے پھر اس پر اپنا استحقاق استعمال کیا، وہ مچھلی کی طرح پھسل گئی اور مجھے
بتانے لگی:

”سودا لانے والا کہیں چلا گیا ہے۔ گھر بھر پریشان ہے۔“
”بکرے کا گوشت مزید مہنگا ہو گیا ہے۔“
”یعنی چار بجے سے آپ کے انتظار میں بیٹھ جاتی ہے۔“
”پرسوں برابر والوں کے تینوں بچوں کا عقیقہ ہے۔“
میرے اعصاب اس کے جملوں سے چنچنے لگتے ہیں۔
وہ مجھ سے ذہیروں باتیں کرے گی، سارے جہاں کے ڈکھڑے سنائے گی۔
یعنی کی شرارتوں پر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔
مگر..... میری شدتوں سے نظر چرائے گی۔
میری بات۔ محبت کی بات۔ گویا ایک روپے کے نوٹ کی طرح ارزاں ہے۔
میں اس کی آواز سنوں گا..... باتیں سنوں گا۔
مگر شاید کوئی ایسا حرف معتبر میری قسمت میں نہیں کہ میرے قلب میں تانیہ کی شادی
کے عہد کا گزرا تیر نکل جائے۔
کوئی وہ جملہ نہیں جس میں سراسر میری ذات کا حوالہ ہو۔ میری رہائی ہو پتا..... اے
میری غلش، میرے کرب، میرے ادھور پن.....
اگر کوئی حرف معتبر نہیں تو۔
کوئی حرف ملامت ہی سہی۔



کوئی طوفان نہیں آیا۔
ایک روز وہ میری ”جی حضوری“ کر کے باہر نکل رہی تھی میں پھٹ سا پڑا۔
”پتا.....!“
وہ میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔
”لوگ شادی کی ساگرہ مناتے ہیں۔ میں ”یوم استقلال“ منایا کروں گا۔ ایسا ضبط،
ایسا استقلال میں نے آج تک دیکھا نہ سنا جو تمہارے رویے اور چہرے سے ظاہر ہے۔“
وہ سر جھکا کر باہر چلی گئی۔ میرا جی چاہا خود کو شوٹ کر لوں۔ یہ تھا میرے غم و غصے
کا جواب۔
بعض اوقات ہم کسی پارٹی میں جاتے۔ اور میری ہدایت کے مطابق وہ اچھی طرح
تیار ہوتی تو روح بن کر میرے وجود میں سرایت کر جاتی، ایسے میں، میں اپنا استحقاق استعمال کرتا
یا ساتھ اس کی تعریف کر دیتا تو.....
میرے ہاتھوں سے وہ اپنے ہاتھ چھڑا کر عینی کی کوئی تازہ شرارت بتانے لگتی یا
شور یک سے میرے جوتے نکال کر سادگی سے پوچھتی۔
”یہ ٹھیک ہیں.....؟“
آپ سوچ نہیں سکتے ایسے سے میری کیا حالت ہوتی۔
ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔
میں صبح آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ وہ خلاف معمول بیڈ پر تھی۔
میں سخت حیرانی کے عالم میں اس کے پاس آیا۔ اس کی پیشانی چھوئی۔ وہ بخار میں
جل رہی تھی۔ میں گھبرا کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔
”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“
اس نے آنکھیں موند لیں۔
”آپ میری طبیعت کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ یعنی بہت خوش نصیب ہے“
اسے سہاروں کی کمی نہیں۔“
”کیا بکواس ہے۔“ میری ساری انسانیت بھاپ بن کر اڑ گئی۔
”غلام ربانی صاحب کا رات فون آیا تھا۔ وہ ٹرپ سے لوٹ آئے ہیں، آپ کو بلا
رہے ہیں۔“

پیدا تو ہو گئے ہیں عالم فاضل بھی بن جائیں۔
 عالم فاضل تو خاک بنتے کٹھوپن میں البتہ ان کا کوئی ثانی نہ ٹھہرا تھا۔ جسمانی طور پر
 ان کی وضع قطع یوں تھی گویا بانس پر کپڑے چڑھا رکھے ہوں۔ مارے کمزوری کے جھلاہٹ کا
 عارضہ الگ لاحق تھا۔ کچھ ہوش سنبھالا تو گھر بھر انھیں برسر روزگار دیکھنے کا تمنائی ہو گیا۔
 مگر محنت مشقت بھی ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ سائیکلوں کی دکان پر تھوڑے دن
 کام کیا۔ ماں چھینیں کہ اتنے سے پیسوں میں کیا کرے گا؟ تو اللہ کے صابر شاگردوں کی طرح
 فرمانے لگے۔
 ”گزر اوقات تو ہو ہی جائے گی اماں۔“
 چند دن ایک آڑھتی کے پاس بیٹھنے کا ارمان پورا کیا۔ کسی نے پوچھا ”کیا کما رہے ہو؟“
 فرماتے ”گزر اوقات ہو رہی ہے۔“
 پھر ایک اسٹور پر جزوی سیل مین کے طور پر کام کرنے لگے۔ اسٹور کے مالک نے
 بہت کباہہ تمام دن کی ڈیوٹی کر لیں۔
 مگر ”اسٹیمنا“ کی کمی کے باعث انھوں نے درخور اعتناء نہ جانا، بولے ’جول رہا ہے
 گزر اوقات ہو رہی ہے۔“
 اس قدر قناعت پسند آدمی تھے کہ ”گزر اوقات“ سے آگے پیڑھی نہیں رکھتے تھے۔
 دوسرے بہن بھائی پڑھ لکھ کر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ وہ گزر اوقات ہی میں لگے
 رہے۔ یوں گزر اوقات ان کی عرفیت بن کر رہ گئی۔
 سب سے پہلے تو ماں انہی کی شادی کرنا چاہتی تھیں وہ تو ”تایا گزر اوقات“ کے لیے
 رشتہ لے جانے میں قطعی کوتاہی نہ برتی تھیں۔
 لڑکی والے ہی انھیں دوسرے سارے کا باشندہ قرار دے دیتے تھے تو وہ بے چاری
 کیا کرتیں۔
 پھر دوسرے بھائیوں کی موجودگی میں ان کی حیثیت ہی زائل ہو جاتی تھی۔ بے
 چاری ماں ہار کر دوسرے بچوں کے گھر بسانے میں لگ گئیں۔
 ان سے چھوٹے بھائی کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا جس نے ببا نگ دہل انھیں تایا کہنا
 شروع کیا۔

تایا گزر اوقات

اڈل اول تو وہ ایک واحد گھر کے ہی تایا بنے تھے مگر پھر شیطان کی طرح قریہ قریہ، گھر
 گھر تایا مشہور ہو گئے تھے۔
 تایا اگر ان کا نام پڑ گیا تھا تو ”گزر اوقات“ عرفیت ٹھہری تھی۔ ہر عرفیت کی کوئی نہ کوئی
 وجہ ہوتی ہے۔ ان کے ہاں بھی وجہ موجود تھی کہ یہ کائنات ہی اسباب و علل کا گورکھ دھندا ہے۔
 ”شنید تھی کہ برسوں کے انتظار کے بعد وہ اپنے والدین کو میسر آئے تھے۔ خیال تو
 یہی تھا کہ تبرک کے طور پر استعمال ہوں گے ہمیشہ مگر ان کی پیدائش کے چار سال بعد یوں ہوا کہ
 ایک تو اتر سے ان کے بہن بھائی عالم ناسوت میں وارد ہونا شروع ہوئے۔
 پہلے ان کی اماں، حکیم حکمت عملی سے بچے پیدا کرنے کے نسخے لیتی تھیں پھر بند
 کروانے کے لیے لگیں۔
 ہونے والے متولدین کی چیخ و پکار میں تایا کی ماں بہری ہونے لگیں کم از کم تایا کی
 آواز تو ”اسفہان ریڈیو“ بن کر رہ گئی کبھی سنی جاتی کبھی نہیں۔ ایسی مٹی پلیڈ ہوئی کہ حد نہیں۔
 تایا جو چار سال تک اکلوتے ہونے کے مزے لوٹتے رہے تھے یوں چونکے گویا نرم
 گرم چھپر کھٹ سے دھڑام فرش پر گر پڑے ہوں۔
 کچھ تو پیدائشی ہی ”باریک“ سے تھے۔ بے توجہی نے باقی ماندہ عریقات بھی نچوڑ
 لیے۔ پڑھائی لکھائی سے انھیں سوکن کا سایہ تھا۔ پٹ پٹا کر بھی مڈل تک نہ پہنچ سکے حالانکہ ابھی
 تک اماں ان کی پیدائش کی منت پوری کر رہی تھیں۔ ہر سالانہ عرس پر چادر چڑھانے جاتی تھیں۔
 یہ اور بات کہ تایا کے کچھن دیکھ کر انھیں چادر پر خرچ ہونے والی رقم کا قلق ہونے
 لگتا تھا۔

ان کی وادی نے بی بی فاطمہ کے کوٹھے مان رکھے تھے۔ سال کے سال بیٹھی
 کوٹھوں پر بھینھنی کھیاں ہلاتیں تر بہ تر پوریاں کھلاتیں۔ ایک نئی منت اور ماننے لگ جاتیں کہ

پھر ان کے گھر میں ”تایا“ کا ورد کرنے والی ایک لائن تیار ہو گئی۔

پہلے لوگ اپنی حس مزاح کا اظہار غلام علی گزر اوقات کہہ کر کرتے تھے۔ اب تایا گزر اوقات کہنے لگے۔ اب وہ جگت تایا گزر اوقات بن چکے تھے۔

اچھی بی کے لیے اگر تایا گزر اوقات کا رشتہ آیا تھا تو یہ کوئی اچھنبے کی بات نہ تھی۔ تایا گزر اوقات کا رشتہ تو ان کی قدر افزائی کا باعث ہی تھا۔

بلو کی اماں نے سنا تو یہی کہا کہ اللہ نے ملائی چوڑی ایک اندھا ایک کوڑھی۔

اچھی بی کو چوتیسواں سال لگ رہا تھا گو دوں کے کھلائے بھتیجے بھانجیاں جزیشن گیپ کا نعرہ لگانے کے قابل ہو چکے تھے۔ اچھی بی ہنوز کنواری تھیں۔

دراصل ان کی ”دانائی“ کے چرچے اس قدر ہو چکے تھے کہ ان کے ہم پلہ ہونے کا دعویٰ کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔

پرلے سے بھی پرلے درجے کی سیدی یا بے وقوف تھیں اس پر مستزاد لگائی بھائی کی عادت ایسی تھی جیسے کسی کو نشے کی لت ہو۔

تین بھائیوں کو علیحدہ گھر لے کر بھی عافیت کا سانس میسر نہیں تھا۔ بڑی بھادج کو گھر آئے ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کھڑی میاں سے دکھڑے کہہ سن رہی تھیں کہ ”ہفتہ بھر ہو گیا ماں کی صورت نہیں دیکھی اماں (ساس) کو بخار چڑھ رہا ہے کیسے جاؤں؟“

جھٹ اماں کو رپورٹ پہنچادی کہ ”بھابی کہہ رہی ہیں کہ اماں تو مرض الموت میں مبتلا لگتی ہیں، میکے کیسے جاؤں؟“

ساس نے سنا تو بہو کو ہمیشہ کے لیے میکے کا رشتہ دکھا دیا۔ وہ تو بھائی کی سوجھ بوجھ کام آئی اور گھر اُڑنے سے بچ گیا۔

دوسری بھادج نئی نولی دلہن تھیں، بن ٹھن کر رہتی تھیں۔ پہلی والی کو بھی حرص آئی۔

کسی کسائی نظر آنے لگیں۔

چھوٹی دلہن نے کہہ دیا یونہی کہ بھابی کو چار ماہ کا پیٹ ہے۔ کیسی پھنسی پھنسی قیصیں پہنتی ہیں۔

جھٹ بڑی بھابی تک ”تاس“ کا نمائندہ بن کر پہنچ گئیں کہ چھوٹی بھابی کہہ رہی ہیں کہ بڑی بھابی کپڑا جسم پر چڑھا کر سلواتی ہیں۔

ان کی اسی قسم کی لگائیوں بھائیوں سے گھر میں ہمہ وقت بغیر ٹکٹ ”ریسلنگ“ شروع ہو جاتی۔

اس پر حد یہ تھی کہ مبالغہ ان کی گھٹی میں پڑا تھا، کوئی بات شروع کرتیں تو وہ طومار باندھیں کہ لگتا میری جنگ عظیم گلی گلی لڑی جا رہی ہے۔

اخبار میں کہیں دھماکے کی خبر پڑھیں تو چار بلڈنگیں بیٹھے بیٹھے گرا دیتیں کہیں کسی ساس بہو کا جھگڑا سننے کو مل جاتا تو کسی ایک کو اسپتال پہنچانے بغیر خبر پوری نہ کرتیں۔

کہیں آگ لگنے کا واقعہ ہوتا تو سمندر سے آگ عبور کر دیتیں۔

بھادجیں تو انھیں اپنے گناہوں کی سزا تصور کرتی تھیں کہ پست قامت آٹے کی بوری جیسی ہیئت رکھنے والی کے لیے رشتہ ملنا بھی دشوار تھا اس پر پورا منہ دانتوں سے بھرا تھا۔ جس کے سبب بیٹھے بٹھائے ان پر خوش اخلاقی کا دورہ پڑتا دکھائی دیتا تھا کہ دانت نکالتی نہیں تھیں نکلے

رہتے تھے پچھلے برس رمضان کا چاند دکھائی نہیں دیا تھا اور وہ چھت پر دیکھ آئی تھیں اور اماں گھڑی میں تین بجے کا الارم لگا کر بیٹھ گئی تھیں۔

انیسویں روزے کو وہ عشاء تک چار بار چاند نکال آتی تھیں جس پر بڑی بھادج چیخ کر بولی تھیں:

”اے اچھی بی پلک کا بال ٹوٹ کر ڈیلے پر تو نہیں چپک گیا؟“

تایا گزر اوقات بچپن سے اوپر ہو چکے تھے اور شادی کا خیال دل سے نکال کر روزانہ بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں کا تصور لیے بیٹھے رہتے تھے۔

اچانک ان کی اماں کو سن گن ملی کہ اچھی بی نام کی کوئی ”لڑکی“ آس میں بیٹھی ہے۔

امتا تو سب کے لیے ایک سی ہوتی ہے۔ محروم بیٹا دل میں پھانس کی طرح گڑا رہتا ہے۔

عین رمضان میں ہی رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔ سب نے کہا بھی کہ عید کے بعد چلی جانا مگر وہ نہ مانیں۔

اچھی بی کی بھادجوں کو شنید ہوئی تو دنوں میں پھلجڑیاں جھوٹے لگیں۔ انھیں تایا گزر اوقات کسی نجات دہندہ سے کم نہ دکھائی دیے۔ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر وہ تایا کو کوہ قاف کا

باشندہ ثابت کرنے پر تل گئیں۔

اچھی بی کی اماں بولیں:

”اے دلہن، لڑکے کی عمر زیادہ ہے۔“ منجھلی بہو تیزی سے بولیں۔

”عمر زیادہ ہے تو کیا ہوا؟ لڑکا تو ہے۔ باریک ہے تو کیا ہوا اچھی بی کا حاشیہ ہی بن

جائے گا۔“

تایا جو بے گھر دیکھ دیکھ کر آہیں بھرا کرتے تھے یہ سن کر خوشی سے پھولے نہ سائے

تھے کہ ان کا رشتہ منظور ہو گیا ہے اور ان کا بھی گھر بس رہا ہے۔“

مارے خوشی کے ڈیڑھ گھنٹے تک بتیسی ہاتھ میں لے کر ”منجھلی“ تھی۔ اور تصورات کی

دنیا میں اچھی بی کو بسایا تھا۔

خاندان کی لڑکیوں نے سنا تو خوشی سے چیخ پڑیں۔ اچھا شغل ہاتھ آیا تھا۔ روزہ

کھولنے کے بعد ڈارکی ڈار انھیں چھیڑنے پہنچی تھیں اور وہ اتنا شرمائے تھے کہ باقی جسم میں خون

کی کمی واقع ہو گئی تھی۔ سارا چہرے پر جو آ گیا تھا۔

طے ہوا عین عید کے دن برات جائے گی۔

تایا نے شرما کر فرمائش کی کہ ان کی شادی کی مووی بھی بنائی جائے اور مہندی کا

سلسلہ ضرور ہو۔

لڑکیوں نے اس سلسلے میں بڑی یک جہتی کا مظاہرہ کیا اور بزرگوں کی ہر آواز کو دبا

دیا گیا۔

سارا رمضان تایا کی شادی کا موضوع زیر بحث رہا ہر گھر میں رونق اتر آئی۔ چاند

رات کو لڑکی والے مہندی لار ہے تھے۔

بہنیں بھاوجیں سرخ دد پٹا تھامے ان کی منتظر کھڑی تھیں اور وہ کمرے سے نکلنے کا نام

ہی نہیں لے رہے تھے۔

خوب شور شرابے پر ہانپتے کانپتے باہر آئے اور بہن کو چپکے سے بتایا کہ بتیسی گم ہوئی

ہے، وہ ڈھونڈ رہے ہیں۔

بہن نے ولاسا دیا کہ کوئی بات نہیں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ لڑکیوں نے موقع کی

مناسبت سے ایک گانا مزید تیار کر لیا تھا۔

کسی کی دید ہو جائے

ہماری عید ہو جائے

ایک لڑکی گاتی باقی ”آمین“ کہتیں ایسا لگتا کہ میلاد کے آخر میں مناجات پڑھی جا

رہی ہو۔

اچھی بی کی طرف سے مہندی آئی، ہر شخص کے چہرے سے چاند رات طلوع تھی

عجیب سی گدگدیاں ہر ایک کو ہو رہی تھیں۔

تایا نے ہر رسم میں بھرپور حصہ لیا۔ بتیسی سنبھال سنبھال کر مسکراتے رہے مووی کی

لائٹ میں ان کا تانبہ جیسا رنگ دک رہا تھا۔ مووی میکرو انھوں نے خصوصی ہدایت دی تھی کہ

ان کے کلوز اپ ضرور لیے جائیں جیسے سینما کی اسکرین پر ”ندیم“ کے کلوز اپ آتے ہیں۔

لڑکیوں نے گانا چھیڑ رکھا تھا۔

دلہن گاؤں کی گنوار تایا بولتے نہیں

تایا نے بہن کے کان میں سرگوشی کی:

”ہم نے تو سنا ہے وہ کچھ پڑھی ہوئی ہیں؟“

”یہ تو گانا ہے۔ ہوت کر رہی ہیں دلہن والوں کو۔“ بہن نے تشفی دی۔

”کہیں وہ برانہ مان جائیں؟“ انھوں نے خدشہ ظاہر کیا۔

”ان کے ایمپلی فائر یہاں فٹ نہیں ہیں۔“ بہن جل کر بولی تھیں۔

لڑکیوں کی خوشی کی تو کوئی حد نہیں تھی۔ اتنی مدہوش تھیں کہ چاند رات کی شاپنگ بھول

چکی تھیں۔

ساری رات گانے گانے گا کر آوازیں بیٹھ گئی تھیں۔ خدشہ لاحق ہوا کہ ابھی تو کل کا دن

باقی ہے۔ آوازیں کا یہی حال رہا تو کیا کل تایا کو اشاروں سے چھیڑیں گی؟ لہذا تین بجے سو گئی

تھیں۔

اگلی صبح عید تھی جلد اٹھنا پڑ گیا۔ آنکھوں میں لال ڈورے، بیٹھی آوازیں، پھیلے بال،

مٹے مٹیک آپ ایسا لگ رہا تھا، تایا کی شادی میں جو کرشریک ہوں۔

تایا کی شادی کیا تھی ایک دلچسپ ڈراما تھا جس میں ہر کردار جوش و خروش کے ساتھ

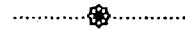
عید کی نماز کے بعد بارات کی تیاری کا سلسلہ شروع ہو گیا..... تایا کے حوالے سے ایک دوسرے سے چیخڑ چھاڑ کر کے لڑکیوں کے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔

بزرگ بظاہر انھیں ٹوک رہے تھے مگر گدگدیاں انھیں بھی زبردست ہو رہی تھیں۔
اللہ اللہ کر کے رات گئے رخصتی عمل میں آئی۔

تایا کی بھابی نے گھر پہنچنے سے پیشتر ہی کرتا دھرتا لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ دولہا دلہن کو گود میں لے کر دہلیز پار نہیں کرائے گا۔ خدشہ ہے کہ ایسا کرنے کی صورت میں دولہا جملہ عروسی کے بجائے اسپتال پہنچ جائے گا کہ ایک تو جانِ ناتواں اس پر ”عمر کا تقاضا“ اس پر سب نے اتفاق کیا۔

دلہن کی خالہ دلہن کے ساتھ آئی تھیں۔ رات دو بجے تک انھیں چپکے چپکے نہ جانے کیا مشورے دیتی رہیں۔ ادھر تایا، ظالم سماج قسم کی خالہ ساس کو دل ہی دل میں برا بھلا کہہ رہے تھے۔

بڑی عمر کی خواتین نے لڑکیوں کو ڈانٹ پھنکار کر سونے کے لیے بھیج دیا تھا۔
بہنیں، بھادجیں البتہ تایا کو اپنے جلو میں جملہ عروسی میں لے گئی تھیں۔



صبح کو بڑی عمر کی خواتین کی وجہ سے، کچھ فطری حجاب کی وجہ سے لڑکیاں تو ایک دم کمرے میں نازل نہیں ہوئیں البتہ بہنیں بھادجیں طوفان کی طرح دلہن کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

”کیسی ہو دلہن رانی؟“ ایک بھادج معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

وہ شرما کر دوہری ہو گئیں۔

”کیا تھخہ ملا؟“

انھوں نے تکیے کے نیچے سے ایک ایک کے کئی نوٹ نکالے اور لجا کر بولیں۔ ”کہہ رہے تھے کہ آپ کے شایان شان کوئی تھخہ سمجھ نہیں آیا یہ پیسے رکھ لیجیے اپنی مرضی سے کچھ خرید لیجیے گا۔“

”آپ کو دیکھ کر کیا تاثرات تھے تایا کے، آپ میں کیا چیز پسند آئی انھیں؟“ ایک اور

سہاگن نے شوخی سے پوچھا۔

”کہہ رہے تھے کہ آپ کی آنکھیں بہت حسین ہیں۔“ وہ شرم سے دوہری ہوئیں تو گاؤں تکیہ بن کر رہ گئیں۔

بے ساختہ ہنسی کو بمشکل بریک لگے تھے۔

”اور کچھ کہہ رہے تھے؟“ ایک اور چلی کو مزید جانے کا اشتیاق ہوا۔

”کہہ رہے تھے آپ میرا خیال رکھیں گی اور میں آپ کا۔ گزراوقات تو ہو ہی جائے گی۔“

اب قہقہہ رک نہیں سکے تھے۔

جب تایا گزراوقات کی بھابی انھیں باتھ روم کی طرف لے جا رہی تھیں تو اچھی بی بی کی

حس مبالغہ پھڑکی اور وہ رازداری سے بولیں۔

”بھابی..... مجھے ”متلی“ سی ہو رہی ہے..... لگتا ہے۔“ وہ شرما کر رک گئیں۔

بھابی نے پہلے تو ہکا بکا ہو کر ان کی شکل دیکھی پھر خاموش رہنے میں ہی بہتری سمجھی۔

ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انھیں کس قسم کے تاثرات کا اظہار کرنا چاہیے۔

انھیں تایا کی ”گزراوقات“ خطرے میں نظر آ رہی تھیں۔



ظاہر کیا۔

”بیٹھو تو سہی، غصہ تھوک ددیار۔ لو میں اس کی طرف سے پیٹھ کیے لیتا ہوں۔“
مختتم نے اسے منایا۔

”رہنے دو۔“ بے ادبی“ ہوگی۔“ عباس جل کر بولا تھا۔

”کھیل شروع کرو بھی، ختم کر دیتے۔“ مختتم مستعد ہو کر بیٹھ گیا۔

”فائدہ کیا، جان بوجھ کر ہار جاؤ گے۔ اس طرح کھیل میں کیا مزہ آتا ہے؟“ وہ ہنوز ماش کے آنے کی طرح اکڑا ہوا تھا۔

”مارہ ہر جمعرات کو ڈرامہ ہونے لگا ہے۔“ وہ ناراضگی سے بولا۔

وہ شطرنج کا رسیا تھا۔ نشے کی طرح اسے اس کی لت تھی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ محتشم نے پھر اصرار کیا۔

”میں کہہ رہا ہوں کہ اب میرا بیٹھنا بے کار ہو گیا۔ کیونکہ ڈانسنگ فلور آباد ہو رہا ہے۔“

”اب تم پہلے سے زیادہ بے توجہ ہو جاؤ گے۔“ عباس نے ٹیبل سے کار کی چابی اٹھائی۔

وہ کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ تاہم مختتم کو اس کے اٹھ جانے کا افسوس ہو رہا تھا۔

عباس ”اوکے“ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

مختشم نے سگریٹ سلگایا اور لان میں نظر دوڑانے لگا۔ سرخ لباس میں حسن خاموش پورے لان کا جائزہ لے رہا تھا۔

مختتم اب خود پر قابو نہ پاسکا تھا، اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا رخ اسی خاموش تصویر کی طرف تھا۔

“ہیلو۔“

وہ ایک مگن جوڑے کو بے حد اشتیاق سے دیکھنے میں مصروف تھی۔ ایک دم چونک پڑی۔

”تھینکس گاڈ، آپ سختی تو ہیں۔ میں نے تو سنا ہے عموماً جو بولنے کی صلاحیت

سے محروم ہوتے ہیں وہ سُن بھی نہیں سکتے۔“ محتشم نے حاصل کردہ معلومات اسے منتقل کیں۔

ایک حرف تسلی تو؟

”شوفر ڈرون“ کا رشتہ کی طرح چمکتے ہوئے فرش والے وسیع و عریض پورٹیکو میں

آگئی تھی۔

”اب یقیناً مار جاؤ گے۔“ عباس نے منہ بنا کر کرسی کی پشت سے کمر دکھائی۔

”ہاں! اسی کو کہتے ہیں مفت میں بدنام ہونا۔“ مختتم کچھ کھیا گیا۔

”تجرے کی مات ہے، کوئی فکشن نہیں۔“

”ادھر وہ آئی نہیں اور تم ہمارے نہیں۔ جب کھیل سے تمہاری توجہ ہی ہٹ جاتی ہے تو ہمارے تو انجام ہوگا ہی۔ بساط پر مہرے انتہائی نازک پوزیشن میں تھے۔“ اور عباس کی بات کی تصدیق ہو رہی تھی۔

مختشم غائب دماغی کی کیفیت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اس کی بات اس کے انداز کی تردید کر رہی تھی۔

”مار گونگی ہے تمام عمر اقرارِ محبت سننے کو ترسو گے۔“ عباس چڑ کر بولا۔

”ہا.....ہا.....“، محترم کا قہقہہ بے حد جاندار تھا۔

”یار! تم بہت فاسٹ ہو۔ میں تو ابھی حسن بے مثال کو جی بھر دیکھنے کے مرحلے سے گزر رہا ہوں اور تم سوچ میں اتنا آگے بڑھ آئے۔“

”تو کیا فلرٹ کرو گے؟“ عباس کی مٹی ہی ”سنجیدہ“ مقام سے اٹھائی گئی تھی۔ بہت مدبرانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”دیکھو یار! ذرا دیکھو، کلب میں یہاں سے وہاں تک اس وقت ”اسی“ خاموش لہو کی بہار نظر آ رہے ہیں۔“ محترم نے اسے حاروں سمت متوجہ کیا۔

”یار شطرنج کے وقت کچھ اچھا نہیں لگتا۔“ عباس سخت جھلایا ہوا تھا۔

تم سے سخت متاثر ہو رہا ہوں۔“ مختتم نے اسے چھیڑا۔

مس سلیمان نے ذرا اپنا دوپٹہ مزید آڑا تر چھا کیا۔ سوکھی چھڑی سے کپڑا بھی یوں چمکا رہتا تھا جیسے اس کی مامتا پھڑک رہی ہو۔“

وہ دلو جھوٹے سے قد والا آفتاب صدیقی کتنی مشکل سے ان کی طرف مائل ہوا تھا مگر اب وہ بھی اسکوئش کورٹ کے بجائے سامنے کرسی پر بیٹھا اسے دیکھتا رہتا ہے۔ یہ احساس نکلتا انھیں اب جین نہ لینے دیتا تھا۔

”مجھے تو یہ ایسا مل گئی ہے۔“ مس جہاں پناہ نے غالباً بابا فرائیڈ سے کچھ اکتساب کیا ہوا تھا۔ ”آئی ہے بیٹھی مگر کمر دیکھتی رہتی ہے۔“

”ہونہر دیکھتی رہتی ہے۔ شہیدان عشق کی گنتی کرتی رہتی ہے۔“ مسز برلاس نے انتہائی کڑوا سا منہ بنایا۔

”میرا تو ویک اینڈ پر آنے کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔ میری دیگر مصروفیات بھی بہت ہیں مگر برلاس صاحب کی وجہ سے آنا پڑتا ہے۔“

”حیلے بہانے سے وہ بھی گونگی کا تذکرہ کرنے لگ جاتے ہیں۔“ مسز برلاس واقعی مشکل میں تھیں۔

”بھئی اسے یہاں سے دفعان کرنے کا کوئی پروگرام بنانا چاہیے۔“ مسز لائین والا کو اپنی فکر پڑ گئی تھی۔

”پروگرام.....“ مس سلیمان طنز سے مسکرائیں۔ ”منصوبہ کہیے۔“

”مجھے لگتا ہے اس کے پیچھے کوئی اتھارٹی ہے، انداز نشست نہیں دیکھا اس کا؟ جیسے ہم سب اس کی رعایا ہوں۔“ مس جہاں پناہ کے غرور و خود پسندی کو اس کی وجہ سے سخت ٹھیس پہنچ رہی تھی۔

”میرا بس چلے تو یا جوج ماجوج بنا کر ہمیشہ کے لیے کسی دیوار کے پیچھے پھینک دوں۔“ مسز برلاس نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا تھا۔

ان کا دکھ بڑا جائز قسم کا تھا اور نسوانی و معاشرتی ہمدردیاں ان کے ساتھ آسانی سے بگھاری جاسکتی تھیں۔ اس لیے وہ اس گونگی کے خلاف کھل کر بولنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں۔ آخر آل مسز برلاس۔ ”بڑی شے“ تھے۔

جوں جوں رات بڑھتی جا رہی تھی ہلچل و چہل پہل بڑھ رہی تھی۔ سرودھ کھڑے افراد کی وجہ سے اس کی ٹیبل یا ترا ضرور کرتا ہے۔ اتنی کرکری کرتی ہے، پھر بھی اس کے پاس جاتے ضرور ہیں۔“

اس نے انتہائی ناگواری سے پیشانی پر ہل ڈال کر مختتم کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

”کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟“

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ مختتم کھینچا سا گیا۔ ”کیا آپ کسی کا انتظار کر رہی ہیں؟“ وہ سر کھجا کر پوچھنے لگا۔ اس نے اپنی سبز آنکھیں مختتم پر جمادیں۔ پھر انتہائی بے زار کن انداز میں اثبات میں گردن ہلا دی۔

”کس کا؟“ مختتم پوچھ بیٹھا، حالانکہ اس قسم کے سوالات کرنے کا کوئی حق اسے حاصل نہیں تھا۔ یونہی تختس بیدار ہو گیا تھا۔ کلب کے تمام ہی ممبران کو وہ جانتا تھا۔

”بلی“ نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ اپنی گاڑی اور ڈرائیور کا، پھر پلیٹ میں رکھے پاپ کارن ٹونکنے لگی۔ جیسے کہہ رہی ہو ”اب آپ جائیے۔“ مختتم سخت مایوس حالت میں وہاں سے لوٹا تھا۔

اب وہ مزید شدت سے عباس کی خفگی پر ضمیر کی ملامت من رہا تھا۔

اس نے ایک پیاسی نگاہ ”بلی“ پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

”یہ ہے کیا شے؟“ مسز برلاس کی تیوری پر ہل پڑے ہوئے تھے۔

”ارے اپنے حسن کا تماشہ دیکھنے آتی ہے۔ لباس ایڈوانس پہنتی ہے اور چال دیکھو۔“

”مس جہاں پناہ“ نے اپنے گدے جیسے جسم کو کرسی پر ٹھکانے لگاتے ہوئے جل کر کہا تھا۔

”حالانکہ سب کو پتا ہے کہ گونگی ہے پھر بھی بد ذات کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔“

مس ابراہیم شہی کی جان ناتواں جیسے سلگ کر آدھی رہ گئی تھی۔ صرف زبان میں کچھ طاقت کے اثرات پائے جاتے تھے۔

”ارے یہ کرنے کیا آتی ہے یہاں؟ کوئی کھیل کھیلتے اسے نہیں دیکھا گیا۔“

”کلب پکنک سے یہ غائب تھی۔ ڈانس فلور پر اسے کبھی نہیں دیکھا گیا، مجھے تو یہ کسی عجوبے سے کم نہیں لگتی۔“

مسز لائین والا کی سمجھ یوں بھی زیادہ کام نہیں کرتی تھی۔ معلومات کا گھوڑا چ میں کہیں گر پڑتا تھا۔ مگر اس کے بارے میں تو وہ بھی سوچ سوچ کر ہلکان ہو جاتی تھیں۔

”جیسے دیکھو، اس کی ٹیبل یا ترا ضرور کرتا ہے۔ اتنی کرکری کرتی ہے، پھر بھی اس کے پاس جاتے ضرور ہیں۔“

معاہدات یونیفارم میں ملبوس کپ ہاتھ میں لیے ہوئے ڈرائیور سامنے میزبیں پر نمودار ہوا اور آگے بڑھنے کے بجائے وہیں کھڑا رہ گیا۔

حسن لب بستہ آ، سگی سے اٹھ کھڑا ہوا اور مختتم آ فریدی پھڑپھڑا کر رہ گیا، گویا ”انکل“ ”نومی پودے کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔

”ہوں۔“ مختتم نے نظر کا چشمہ نیچے کر کے بچے کو دیکھا۔

”ممی بلا رہی ہیں آپ کو۔ وہ کہہ رہی ہیں مزے کی چیز دکھاؤں گی۔“ نومی نے جیسے

اسے پتایا۔

”یارتہم ہی دیکھ لو۔“ مختتم نے بے زاری سے کہہ کر کتاب چہرے کے سامنے کر لی۔

”بڑی ہے اس سے، اس کے قابل نہیں ہے۔“ رشی اندر وارد ہو کر چڑ کر مخاطب

ہوئی تھیں۔

”آئیے بھابی۔“ مختتم سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”انداز تو ایسا ہے جیسے کہہ رہے ہو جانیے بھابی۔“ وہ اس کے پاس رکھے موڈھے پر

بیٹھ گئیں۔

”مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ نومی کو خرابی ہو گئی۔ اس لیے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ ذرا باہر تو

آؤ بھی۔“

”کیا ہے باہر؟ وہی منظر وہی چیزیں جو روز دیکھتا ہوں۔“ مختتم غالباً اس وقت

مطالعے کے موڈ میں تھا۔ پھر ایک دم ذرا چونکا۔ ”آپ کیا کہہ رہی تھیں، کیا بڑی ہے اس سے؟“

”انجو بھائی کی بہن آئی ہوئی ہے۔ سچ دیکھ لو، ورنہ پچھتاؤ گے۔“

”جہاں اتنے کام کرتا ہوں، پچھتا بھی لوں گا۔“ مختتم پر قطعی کوئی اثر نہیں ہوا۔

”کتنے روڈ ہو رہے ہو مختتم، تمہیں احساس نہیں کہ میں تمہارے لیے کتنی فکر مند

رہتی ہوں۔“

”سوری بھابی، میرا یہ مطلب نہیں۔ بھئی جب میں فی الحال شادی ہی نہیں کرنا چاہتا

تو اس قسم کی باتوں سے کیا فائدہ؟“ وہ لا پرواہی سے بولا۔

”ویسے کوئی دین ایمان نہیں تمہارا، لمبے بالوں والی ہو، ایسی ہو، ویسی ہو، کتنی مشکل

سے لمبے بالوں والی ڈھونڈ نکالی تھی۔ تمہیں اس کی آنکھیں چھوٹی لگی تھیں۔ بڑی آنکھوں والی

دکھائی تو اس کے چہرے پر غائبانہ قسم کی چھائیاں تمہیں نظر آ گئی تھیں۔ امی لاہور سے فون پر کتنی

”میں ان سے پوچھتی ہوں کہاں کہاں سے؟“ بھابی سخت ناراضگی سے کہہ رہی تھیں۔

”دیکھو! یہ جو فاطمین آئی ہوئی ہے۔ ہر لحاظ سے تمہارے لیے موزوں ہے بہت

پڑ و قار لڑکی ہے۔“

”آؤ تو سہی مل لینے میں کیا ہرج ہے؟“ مختتم چارو ناچار اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس سے

زیادہ بھابی کو ناراض بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”انتہائی بددلی سے ان کے پیچھے پیچھے لاؤنچ میں آیا۔ نفیس سے تراش خراش کا بلیک

سوٹ پہنے وہ واقعی بڑی گریس فل نظر آ رہی تھی۔ کھلی کھلی آستینیں کہنیوں سے اوپر تھیں۔ دامن

سے کارٹیک چھوٹے چھوٹے گولڈن بن تھے جو یوں چمک رہے تھے جیسے اندھیرے میں جگنو۔

بٹی ہوئی رسی کی طرح چوٹی کمر پر جھول رہی تھی۔ کانوں میں رنگ تک نہیں تھے مگر

اس پر بھی اس کا حسن نگاہ سے دل میں اتر رہا تھا۔

”السلام علیکم۔“ اس نے بڑے سجاؤ سے سلام کیا تھا اور مختتم کے جواب کا انتظار

کیے بغیر بھابی کی سمت متوجہ ہوتے ہوئے کہنے لگی تھی۔

”یہ دیکھیے، میں نے آپ کے لان میں کھلے ہوئے پھولوں کا کیسا استعمال کیا ہے۔“

اس کے ہاتھ میں بہت خوبصورت گلدستہ تھا۔ جو وہ گلدان میں آرائش کر چکی تھی۔

”تھینکس۔“ بھابی نے تشکرانہ انداز میں مسکرا کر جوابا کہا۔

”کیا میں پھول اور خواتین کے بیچ خل نہیں ہوں؟“ مختتم کو فاطمین کی بے نیازی

سے اپنی ہنک سے محسوس ہوئی۔

وہ تو یوں بھی آج کل کسی سمت متوجہ ہونے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ اس کے خیالات

پرتو اب ”ویک اینڈ“ سواری رہتا تھا۔ دن کا لے نہیں کھتے تھے۔

”فاطمین! یہ مختتم ہیں۔ ہمارے اکلوتے اور بگڑے ہوئے دیور۔“ بھابی کے لہجے

میں مختتم کے لیے از خود شفقت در آئی۔

”اور مختتم! یہ فاطمین ہیں۔ انجو بھابی کی چھوٹی بہن۔“ (انجو، مختتم کے سب سے

بڑے بھائی کی بیگم)

”اچھا، بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ مختتم نے جیسے جان چھڑائی تھی۔

”میں آپ کو آپ کا یہ جملہ واپس کرتی ہوں۔“ وہ گلدان اٹھکانے پر پہنچا کر خوش دلی

سے بولی۔

بات کر رہی تھی۔“ وہ شرمندہ سی نظر آنے لگی تھی۔ رختی ہنس پڑیں۔
آج عباس نہیں آیا تھا۔ اس پر مستزاد وہ بھی نہیں آئی تھی۔ وہ انتہائی بددل ہو کر
آفتاب صدیقی کے ساتھ اسکوائش کورٹ چلا آیا۔

مگر اسے محسوس ہوا جو سلوک وہ عباس کے ساتھ کرتا ہے وہی سلوک آفتاب صدیقی
اس کے ساتھ کر رہا تھا۔ مختتم اپنا سر ہی پیٹ سکتا تھا۔ عباس کم از کم رقیب رویہ تو نہیں تھا۔
کافی دیر ایک دوسرے کو دھوکا دینے کے بعد وہ بددلی سے باہر آئے اور مختتم کی خوشی
کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا یوں جیسے انتہی سوئیں روزے کو عید کا چاند نظر آ گیا ہو۔
سفید رنگ کی ستاروں بھری ساڑھی میں وہ تجسے کی طرح کرسی پر ایستادہ تھی۔
”آج میں معاملہ آ رہا کر کے ہی رہوں گا۔“

”اس لیے کہ میں سائے کے تعاقب پر یقین نہیں رکھتا۔ میری زندگی اجیرن ہو چلی
ہے۔ تمہارا گونگا ہونا تمہارا بہت بڑا عیب ہے، یہاں تو اتنے لوگ ہیں اور جو تمہیں ملتے اور جلتے
ہوں گے۔ وہ محض تمہارے حسن سے چند دن بہل سکتے ہیں، نباہ نہیں سکتے۔“
”میں تمہارے اس گونگے اور خاموش حسن کی وجہ ہی سے تم پر مر مٹا ہوں۔ میں
تمہیں وفا و محبت کی حقیقت سے روشناس کراؤں گا۔“ وہ نہ جانے کیا انٹ حثت سوچتا اس کی
نبیل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

یہ دیکھ کر اس کی شریانوں میں جوار بھانا اٹھنے لگا کہ آفتاب صدیقی نیپکن سے ہاتھ
پونچھتا اس کی نبیل کے آس پاس منڈلانے لگا تھا۔
”ہوں تو یہ بھی ان پر ہاتھ صاف کرنے کے چکر میں نظر آتے ہیں۔“ وہ سلگ کر
سوچنے لگا اور بے اختیار سے انداز میں اس کی نبیل کی طرف بڑھا۔

اور جب دو چار ہاتھ لب بام رہ گیا یعنی دو قدم کے فاصلے پر وہ تھی کہ مس جہاں پناہ
درمیان میں آ گئیں۔ اپنی مردانہ چال اور تحکمانہ انداز گفتگو کی وجہ سے یہ نام مختتم ہی نے انہیں
مرمت کیا تھا۔ وگرنہ اصلی نام تو ان کا امینہ مغل تھا۔
”ارے مختتم صاحب! جسٹ اے منٹ پلیز۔“

”ہونہہ! ایک منٹ میں زلزلے سے کئی ہزار عمارتیں کر سکتی ہیں۔ ان کے لیے ایک
منٹ کوئی چیز نہیں۔“ مختتم کو ان کی مداخلت سخت گراں گزری۔
”کل آپ پھولوں کی نمائش میں آ رہے ہیں ناں؟ میں نے جاپان میں جو کچھ سیکھا

”ویسے میں اس سے قبل..... میرا مطلب ہے آج سے قبل آپ سے ملاقات کا
شرف حاصل نہیں کر سکا، کیا یہ بات تعجب خیز نہیں؟“ مختتم نے محض یہ احساس دلانے کے لیے
کہ وہ خاصا خوش اخلاق ہے یہ بات کہی تھی۔

یوں بھی ویک اینڈ سر پر تھا۔ کسی نئے جادو کا اثر امکان سے دور تھا۔
”میں گزشتہ آٹھ سال سے اپنے بھائی بریگیڈیئر عارف کے ساتھ اردن میں تھی اور
میں ایگزیم کی وجہ سے آپ کی شادی میں شریک نہیں ہو سکی تھی۔ بس یہ وجہ ہے۔“ وہ لاپرواہی
سے ہنس دی۔

اس کے لہجے، اس کے رویے میں مختتم کی خاطر کوئی تکلف نہیں تھا۔ استغنا اس کی
شخصیت کا خاصہ تھا۔

”اب تو نہیں جاؤ گی۔“ بھابی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔
”ارے بھابی! آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے میں نے جا کر کوئی غلطی کی تھی کہ اب تو
نہیں کرو گی؟“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”بھابی پلیز ذرا کھانا جلدی لگوا دیجیے گا۔ مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔“ مختتم
زیادہ دیر خود پر جبر نہ کر سکا۔ واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔
”بہت موڈی ہے یہ مختتم۔“ رختی نے ماحول میں توازن پیدا کیا۔

”مردوں کی اکثریت موڈی ہی ہوتی ہے کیونکہ مذکر کی صورت پیدا ہونے کی وجہ
سے ان کی عظمت کے ڈنکے روز پیدائش سے پٹ رہے ہوتے ہیں۔ یعنی ان کا کتنا بڑا احسان
ہے دنیا پر کہ یہ مذکر ہیں۔ یہ بھی اپنی اہمیت کا احساس دلانے کا انداز ہوتا ہے بھابی۔ موڈی تو
بے چاری عورتیں بھی بہت ہوتی ہیں مگر انہیں بہت اور جگہ جگہ اپنا آپ کچلنا پڑتا ہے۔ قربانی دینا
ہوتی ہے۔ ماحول و فضا کو قابل قبول رکھنے کے لیے، کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

”تمہاری آبروریشن اچھی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم دنیا کو سرسری نہیں دیکھتیں
اور غافل نہیں ہو۔ ایسی لڑکیاں گھرانوں میں توازن برقرار رکھنے کے لیے بہت ضروری ہوتی
ہیں۔ جاگتا ہوا ذہن رکھنے والی، اپنے مسائل کا حل ڈھونڈنے والی خود اعتماد قسم کی لڑکیاں۔“
رختی کو اس کی سنجیدگی اچھی لگی۔

”میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔“ فاطمین بھینپ گئی۔
”آپ نے کچھ زیادہ ہی ستائش کے پہلو نہیں ڈھونڈ لیے؟ میں تو ایسے ہی کامن سی

مختشم بہت اضطراب کی کیفیت میں رسٹ وایج پر نگاہ ڈال رہا تھا۔ معا اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

اس کا شوفر آ گیا تھا۔ مختشم بجلی کی سی سرعت سے اس کی سمت بڑھا۔
”شوفر۔“

شوفر نے آواز کی سمت نگاہ دوڑائی اور مختشم کو اپنی طرف آتے دیکھ کر رک گیا۔
”ییس سر۔“

”آپ اس شہر کے کس علاقے سے تشریف لائے ہیں۔“ مختشم نے کچھ تہذیب بگھا کر رام کرنا چاہا۔

”آپ یہ کیوں جاننا چاہتے ہیں سر؟“ وہ حیران سا نظر آنے لگا۔

”یہ جو ہاٹ ساری میں مس ٹیٹھی ہیں۔ مجھے ان کے بارے میں کچھ ضروری بات چیت کرنا ہے۔ بات یہ ہے شوفر کہ یہ بے چاری تو گوگئی ہیں اور ہمارے کلب کی سالانہ تقریبات کا آغاز ہونے والا ہے۔“

”ہم ان کے گارجین سے مل سکتے ہیں؟“

”لیکن سراسر بات کا جواب تو وہ خود بھی دے سکتی ہیں کیونکہ وہ سنی تو ہیں؟“

”یہی تو سارا مسئلہ ہے کہ وہ جواب تک دینا پسند نہیں کرتیں۔“ مختشم نے دکھڑا رویا۔ ”اب دیکھیے ناں وہ ہمارے کلب کی بیوٹی کونین ہیں۔ اگرچہ یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ صرف میں ہی نہیں کلب کا ہر ممبر ان سے دوستی کا خواہش مند ہوگا بلکہ.....“

”معاف کیجیے سر! بس، بہت ہو چکا۔“ مختشم کو شوفر کا انداز دلچسپ شاق گزرا، مگر وہ یہاں کوئی تماشا برپا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر نوبت یہاں تک پہنچی تھی مگر وہ تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔

خاصے فاصلے سے اس نے اس کی گاڑی کا تعاقب شروع کیا تھا۔ اس وقت اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ جب اس نے ایک موڑ پر گاڑی رکتے ہوئے دیکھی۔ مختشم نے بھی اپنی گاڑی فاصلے پر روک لی۔ وہ گوگئی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر نیچے اتری اور شوفر نے اگلا دروازہ کھول دیا۔ وہ تقریباً کھلکھلاتی ہوئی آگے بیٹھ گئی۔ مختشم حیران و ششدر دیکھ رہا تھا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ مختشم نے بھی گاڑی بڑھائی۔

کافی فاصلہ طے کر کے اور امرا کی مشہور بستی میں پہنچ گئے۔ چند بلاک کے موڑ

کل اس کا بھرپور اظہار ہوگا۔ آپ کو یاد دہانی کر رہی ہوں۔ بھولیے گا نہیں۔“ مختشم نے جان چھڑانے کو جلدی سے حامی بھر لی مگر چند لمحات کے لیے سوچ میں پڑ گیا کہ مس جہاں پناہ نے پہلا انویٹیشن کب دیا تھا جو یاد دہانی کی نوبت آئی۔

پھر ایک دم سوچ کو جیسے جھٹک کر آگے بڑھا۔

”ہیلو۔“ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا پھر نگاہیں سامنے مرکوز کر دیں۔

”میں صرف ایک دو باتیں کر کے یہاں سے چلا جاؤں گا۔ آپ اس کلب کی ممبر ہیں۔ اس شہر کے چیدہ چیدہ بلکہ یوں کہیے کہ اس شہر کی ”کریم“ یہاں موجود ہوتی ہے۔ ہماری بات چیت کے لیے اس کلب کی ممبر شپ ہی بہت ہے۔“

”آپ نے یہ کلب جوائن کیا ہے مگر یہاں کی ایکٹیویٹیز سے آپ بہت دور نظر آتی ہیں۔ ہم مذاق ممبر نہ سہی مگر ممبر تو ہیں۔ بات چیت میں کوئی حرج ہے کیا؟“ مختشم اس خوف سے وضاحتی گفتگو کرتا چلا گیا کہ کہیں وہ اٹھ کر نہ چل دے۔

سبز آنکھوں والی پراسرار لڑکی نے اپنی پرفسوں نگاہیں اس پر گاڑ دیں، مگر جلد ہی جھکا لیں۔ وہ ایک مرد کی پڑ اعتماد نگاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

”کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟“ کم عمر دو شیزہ کی یہ ادا اسے حوصلہ افزا لگی۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”آپ تو واقعی پتھر ہیں۔“ مختشم کے لہجے میں شکستگی در آئی اور اس حسن جہاں تاب نے اپنے سفید سفید ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے۔ گویا کہہ رہی ہو وہ کچھ سننا نہیں چاہتی۔

”مگر آپ کو آج اس طرح جانے نہیں دوں گا۔“

”ابھی آپ کا شوفر آئے گا۔ پھر تماشا دیکھیے گا۔“ مختشم نے جیسے دھمکی دی۔

”ہاں نہیں تو۔“ بندہ کم از کم کسی کی بات تو سن لے۔“

وہ ممبران کی اس ٹولی کی طرف چلا آیا جو کلب میں ”برج پارٹی“ کے عنوان سے مشہور تھی اور اپنی آج کی پرفارمنس پر گفتگو کر رہی تھی۔

”آپ دیکھیے سبز برلاس؟ سبز لائین والا نے اشارہ کیا۔

”کچھ دنوں میں اس کا اپاٹمنٹ اس شہر کے بہترین سائیکازسٹ سے ہونے والا ہے۔“ مس ابرا میرٹھی نے بھی جلے دل کے پھپھو لے پھوڑے۔

دونوں بیگمات کے قہقہے بے ساختہ اور خاصے بلند تھے۔ بے چارہ مختشم۔

موڑنے کے بعد ایک کونھی کے سامنے گاڑی رک گئی۔ مختتم کو یہ راستہ جانا بچانا لگا جہاں وہ ایک آدھ بار آچکا تھا۔ مختتم نے بھی فاصلے پر گاڑی روک دی تھی۔

شوفر نے زور سے ہارن بجایا۔ چند لمحوں بعد گیٹ وا ہو گیا۔ گونگی گاڑی اندر جانے سے پہلے ہی دروازہ کھول کر اتر گئی تھی۔ مختتم کنگلی باندھے ہستور سامنے دیکھ رہا تھا اور اس لمحے تو وہ چکراتے چکراتے رہ گیا جب بھرپور ہنسی کے ساتھ اس نے فاطمین کو گیٹ میں ایستادہ دیکھا۔ وہ یہاں پہلے بھی آچکا ہے اور کیوں آچکا ہے۔ ظاہر ہے بھائی کی سسرال میں داخلہ ممنوع نہیں ہوتا۔ گونگی مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ اندر چلی گئی۔

مختتم چند ٹائیے حیران پریشان کھڑا رہا۔ پھر جیسے ہوش میں آ کر پوری رفتار سے گاڑی بڑھالے گیا۔

اسے وہ راستہ ازبر تھا، وہاں تو قرابت داری نکل آئی تھی مگر فاطمین سے گونگی کا کیا رشتہ تھا؟ کیا کیا جائے کہ اس دن کے بعد وہ گونگی کلب ہی میں نہیں آئی تھی۔

دوویک اینڈ کے تکلیف دہ انتظار کے بعد وہ حالت جنوں میں پھر اس راستے پر آ گیا تھا۔ آج وہ قطعی فیصلہ کر کے آیا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کی مڈ بھیڑ فاطمین سے ہی ہوگی۔ وہ اسی ادارے سے آیا تھا، انتہائی بے تابی سے کال ٹیل بجائی تھی۔

چوکیدار نے گیٹ کھولا تو اس نے دیکھا کہ پورچ میں وہی شوفر گاڑی پر بہت دل و جان سے کپڑا پھیر رہا تھا۔ گونگی اس کے قریب کھڑی تھی۔ اونچی سی شلوار اور گھاکھرا غما لمبی سی فراک پہنے۔ دونوں کی نگاہ ایک ساتھ مختتم پر پڑی شوفر تیزی سے اس کی سمت آیا۔ اس کی آنکھوں میں تحیر تھا۔

”یس سر؟“ وہ قریب آ کر گویا ہوا۔ گونگی اندر بھاگ گئی تھی۔

”یہ، یہ، کیا.....“ مختتم کو کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔

”آپ کو کس سے ملنا ہے سر؟“ شوفر انتہائی ادب سے پوچھ رہا تھا۔

”مجھے اس لڑکی کے گارجین سے ملنا ہے۔“ وہ بدقت تمام گویا ہوا۔ فاطمین کا نام مصلحتاً

نہیں لیا۔

”تو پھر ملیے۔ میں ہوں اس کا گارجین۔“ شوفر اطمینان سے بولا۔

”ہائیں۔“ مختتم ہوتی ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

”یہ..... کون ہے؟“ اب اسے کچھ تو بولنا تھا۔

”میری بیوی ہے سر۔“ وہ پرسکون انداز میں گویا ہوا۔ بھک سے جیسے مختتم کی ہستی فضا میں بکھر گئی تھی۔

”میں کرنل صاحب کا شوفر ہوں سر اور یہ میری بیوی ہے۔ میں سمجھ رہا ہوں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“

”سر! یہ ہماری مس کی شرارت تھی اور کچھ بھی نہیں۔“

”سر! یہ آزاد علاقے کی لڑکی ہے۔ میں پشاور کا رہنے والا ہوں۔ پچھلے برس دس ہزار روپیہ لے کر اپنے گاؤں گیا تو میرے دوستوں نے سیر کا پروگرام بنایا۔ ہم آزاد علاقے کی طرف نکل گئے۔ وہاں یہ ہوا کہ ایک گھرانے سے کچھ علیک سلیم ہوئی۔ وہیں میں نے پلوٹے کو دیکھا۔ پتا چلا اس کی شادی ہو رہی ہے۔ ایک ستر سال کا بوڑھا پانچ ہزار دے رہا تھا اس لیے مجھے اس لڑکی پر بہت ترس آیا۔ میں نے اس کے باپ کو دس ہزار دے کر شادی کر لی، مگر اپنے گھر والوں کی ناراضگی مول لے کر میں اس کو سیدھا کراچی لے کر آ گیا۔“

ہماری بیگم صاحبہ ایک ویمن کلب کی ممبر تھیں۔ میں ان کو کلب لے جایا کرتا تھا۔ ایک روز پلوٹے کہنے لگی کہ اس کا دل کرتا ہے وہ بھی بیگم صاحبہ کی طرح کپڑے پہنے، گھومے پھرے۔ ہماری مس صاحبہ نے شرارت کر ڈالی۔ وہ بہت اچھی ہیں۔ میں نے پلوٹے کی بات ان کو بتائی تھی۔ مس صاحبہ کچھ ہی دن ہوئے پاکستان آئی ہیں۔ پہلے وہ اپنے بھائی کے پاس اردن میں رہا کرتی تھیں۔

مجھ سے کہنے لگیں کریم خان میں تمہاری بیوی کی خواہش پوری کر سکتی ہوں اور تمہیں دکھا سکتی ہوں کہ تمہاری بیوی کتنی اہم ہستی ہے اس شہر کی۔ تم ایک خزانے کے مالک ہو۔ میں نے ان کو منع بھی کیا تھا۔ پلوٹے بھی ضد کرنے لگی۔ مس صاحبہ کہنے لگیں چند دنوں کی بات ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہم دلچسپ شرارت کریں گے اور پلوٹے خوش ہو جائے گی۔“

”میں راضی ہو گیا۔ سربات یہ ہے کہ ہماری مس صاحبہ بہت اچھی ہیں۔ انھوں نے ذمہ داری لی تھی۔ انھوں نے ہی پلوٹے کو ممبر شپ دلائی۔ پلوٹے ان کے ہی کپڑے پہنتی تھی۔ ہم تو غریب لوگ ہیں سر۔ بس اتنی سی بات ہے سر۔“ مختتم گنگ سا کھڑا رہ گیا تھا۔

”یہ بہت خطرناک شرارت تھی شوفر۔“ وہ جیسے کونٹیں سے بول رہا تھا۔

”سر میں انسان کا بچہ ہوں۔ آپ کو دیکھ کر بات سمجھ گیا تھا۔ پھر پلوٹے بھی مجھے بتاتی تھی اور آپ ہی کی وجہ سے میں نے مس صاحبہ کو کہہ دیا تھا کہ اب پلوٹے کلب نہیں جائے گی۔ آپ یہاں کیسے پہنچ گئے سر؟“ کریم خان کو اچانک یاد آیا۔

مختتم کو شوفر کے محل نے از حد متاثر کیا۔

”بس ایسے ہی۔“ وہ کھیانی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا۔ ”سوری شوفر۔“ وہ شرمندہ

نظر آیا۔

”کوئی بات نہیں سر۔ جو کچھ ہوا اس میں حیرت کی بات نہیں۔“ وہ سمجھ دار تھا۔ ”سر میری بیوی کو لگی نہیں ہے۔ مس صاحبہ نے اسے کو لگی بنایا تھا۔ اب دیکھیں ناسر بات کرنا تو اسے آتی نہیں۔“

”آں..... ہاں..... اچھا میں چلتا ہوں۔“ وہ چونک سا گیا۔

”کریم خان، یہ وہی ہے یہ ادھر بھی آگنی بیڑا غرق۔ اجی۔ ام مس صاحبہ کو بلانا اے۔“ پھول سے آگ نکلنے لگی۔ فاطمین سے سامنا کرنے کے خیال سے ہی مختتم کانپ گیا۔

”تم نے بھی اپنی ضد کا انجام دیکھ لیا۔ کان پکڑو۔“ کریم خان اپنی بیوی سے مذاق

کرنے لگا۔

”ام مٹی سے ناک لگاتا اے بابا۔“ وہ قہر آلود لڑکا ہوں سے مختتم کو دیکھنے لگی۔

”اس کی عمر بہت چھوٹی ہے سر، اس لیے اس کی ضد نے مجبور کر دیا تھا، ورنہ یہ کوئی

اچھا مذاق تو نہیں ہے۔ مجھے احساس ہے۔“

”مختتم تو وہاں سے پوپن نکلا جیسے اس کے پیچھے بھوت لگے ہوں۔ وہ شکر منا رہا تھا

کہ کریم خان سلجھا ہوا مرد تھا۔ ورنہ اس کی خیریت نہیں تھی۔

”اب میں تمہیں سمجھوں گا فاطمین۔“ مختتم نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ نہ تمہیں نکو بنایا

اسی شوفر کے سامنے۔“ چوکیدار حیران و پریشان سا کبھی اسے کبھی دونوں میاں بیوی کو دیکھنے لگتا

تھا۔ وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔

”اب یقیناً کرمل صاحب سے جلد شرف بازیابی حاصل کرنا ہوگا۔“ وہ اگلے منصوبے

کے تحت گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

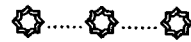
اسے اپنے کانوں میں رختی بھابی کی شریر آواز گونجتی محسوس ہوئی۔

”اب خدا کے لیے شادی کر لو مختتم۔ تمہارے بچے ایک پنشنر کی اولاد ہونا پسند نہیں

کریں گے۔ کم از کم اپنے ہونے والے بچوں ہی کا خیال کر لو۔“

اسے محسوس ہوا جیسے گاڑی کی بیک سیٹ پر تین چار بچے دھاچو کڑی مچا رہے ہوں اور

فاطمین اگلی سیٹ پر گردن موڑے انھیں آرام سے بیٹھنے کی تاکید کر رہی ہو۔



پھوپھی جان

پھوپھی جان کو خدا نے سات عدد بیٹیاں دے کر گویا دیگر خاندان کی ہمہ صفت لڑکیوں کے حقوق غصب کرنے کا ٹھیکہ دے دیا تھا۔ میں یوں نہیں کہ خاندان بھر میں یکتا و لاثانی تھی مگر شاید شخصی کشش مجھے خدا نے وافر عطا کی تھی۔ بد قسمتی سے پھوپھی جان کے نزدیک بھی رہتی تھی۔ ایک بات واضح کر دوں کہ یہ میری سگی پھوپھی نہیں ہیں بلکہ اباجی کی قریبی کزن ہوتی ہیں۔

میں تینتیس برس کی لڑکی ہوں۔ میرے آرزوؤں کے دن بھابیوں کے ڈھیر میں اور راتیں کھستے، روتے گزر رہی ہیں۔ نکھری رنگت ہے مناسب قد و قامت، اعلیٰ تعلیمی ڈگری کی حامل خدمت گزار، مقفل لب خاموش تماشائی۔ مگر ناشکری ہوں۔ میرا وجود عورت پن کے احساس سے خالی ہے۔ میں شوہر کی سنگت، بچوں کی کلکاریوں سے محروم، خدا کی مکمل اور مخلوق کی نگاہ میں نامکمل ہوں۔

اب میں ضبط کے اس دور سے گزر رہی ہوں جہاں بارہا ماتھا پیٹ کر رونے کو جی چاہتا ہے۔ دیوار سے سر ٹیک کر ٹپ ٹپ کر رونے کو جی چاہتا ہے، سر میں خاک ڈال کر گلیوں میں پھرنے کو جی چاہتا ہے۔

اس لیے نہیں کہ مجھے شوہر نصیب نہیں ہوا۔ اس لیے نہیں کہ میں تخلیق کے کرب سے محروم ہوں اس لیے کہ میرے کانوں کے پردے تار تار ہو چکے ہیں، اس لیے کہ میں خودداری اور کھڑی ناک سے جینے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھ میں کسی چیز کی کمی نہ ہونے کے باوجود مجھے شرمسار ہو کر جینا پڑ رہا ہے اس لیے کہ میں چودہ زیورات کے سیٹ جو میرے پاس ہیں استعمال کرنے کے مواقع سے محروم ہوں..... کہ محافل سے مجتنب ہوں کہ وہاں مری انا دو تار کو ٹھیس لگتی ہے۔

”ہائے ہائے۔ بے چاری کی قسمت۔ کیا کی تھی بھلا؟“

”اس کے ساتھ کی بچیاں مدتوں پہلے بیابانی گئیں خیر سے ان کے بچے بھی بڑے ہو

رہے ہیں۔“

”ہائے کرموں جلی، سات بھائیوں کی اکلوتی بہن، نہ پینے کی کمی نہ کھانے کی۔“

”آہ.....ہا.....“

”او.....ہو.....“

”ہائے.....ہائے.....“

خواب سجاتے سجاتے تھک گئی۔

سر ہانے موتیا سجاتے سجاتے تھک گئی۔

اپنے نفس سے لڑتے لڑتے ہار گئی۔

اونچے سر سے جینے کی تمنا کرتے کرتے ہار گئی۔

اب اپنے آپ کو سزا دینے کو جی چاہتا ہے۔

اپنی روح کو سٹگلتے کوئلوں پر ڈال دینے کو جی چاہتا ہے۔

جب میں تڑپ تڑپ کر رونے کا پروگرام بناتی ہوں۔ میری ماں..... پیاری

ماں..... سادہ ماں روغن بادام کی شیشی ہاتھ میں لیے آ جاتی ہے۔

”لاچندا۔ تیرا چہرہ کہہ رہا ہے تیرا سر دکھ رہا ہے۔ لامالش کر دوں۔“

”ہائے..... تجھے وجدان ہوتا ہے، تجھے الہام ہوتا ہے۔ ماں..... ماں..... کہ تیری

بیٹی..... آج گریہ کرے گی۔ شب گریہ منائے گی ہاں ماں۔ تو نعت ہے۔“ میں بال کھول کر

گھٹنوں کے گرد ہاتھ باندھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ میری ماں کے ٹھنڈے بوڑھے ہاتھ میرے سر پر

حرکت کرنے لگتے ہیں۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ میں سسکیاں دبانے لگتی

ہوں۔ یہ کیسا راز ہے جو ماں پر بھی آشکارا نہیں کیا جاسکتا؟

پھر مجھے غنودگی آنے لگتی ہے۔ میں ماں کی طرف پشت کیے بستر پر آ جاتی ہوں۔ سو

جاتی ہوں۔



میری ذہانت اور اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ میری بد قسمتی کا دور آغاز بن گیا۔ خاندان کے تمام

پڑھے لکھے لوگ مجھے سراہتے تھے۔ حتیٰ کہ پھوپھی جان بھی۔ کسی نے بھی کیا میں نے بھی کبھی

محسوس نہیں کیا کہ میری تعریفوں سے پھوپھی جان پر کیا گزرنے لگی ہے وہ ہمیشہ تعریف کرتی

زبانوں کے بیچ میں حسد ماری آواز نکالتیں۔ ”اے بھائی نصر اللہ کتنا پڑھا لو گے بیٹی کو کرنا دے

ہانڈی چولہا۔“

”ہاں بہن! میں جانتا ہوں مگر جابلوں کے ہانڈی چولہے میں اور پڑھی لکھی عورت

کے ہانڈی چولہے میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔“ اباجی لیاقت سے لفظوں کی مالا گوندھتے۔

میں پھولی پھولی فراکوں اورنگی ٹانگوں کے دور سے نکل کر شلوار قمیض میں آ گئی۔

تعریفیں سواتر ہو گئیں بقول امی کے بڑی ہونہار بیٹی ہے۔

پھر میرے بے ترتیب دوپٹے کو سنبھلنا آ گیا۔ تعریفیں مزید بڑھیں محض ایک اچھی

طالبہ ہی نہیں تھی ایک ہونہار گھریلو لڑکی بھی تھی۔

میرا میٹرک کارڈ لٹ بھی نہ نکلا تھا کہ شادی کی تقریب میں موضوع گفتگو بن گئی۔

میری پھوپھی جان کی نندا اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آ گئیں۔ میں محض پندرہ برس کی تھی۔ رشتہ تو

میری کم عمری کے سبب واپس کر دیا گیا۔ مگر پھوپھی جان کو چوکنہ کر گیا ان کی دو بڑی بیٹیاں

تھیں۔ مجھ سے ہزار درجے خوبصورت پانچ مجھ سے چھوٹی تھیں مگر وہ کم نہ تھیں۔

میں انٹر میں تھی کہ میرا رشتہ دور کے رشتہ داروں سے آیا۔ جانے کس طرح خبر پھیلی

کہ پھوپھی جان صبح ہی آدھکیں۔

”اے بھابھی! تمہیں کبھی بھابی نہ سمجھا بہن ہی جانا۔ تم ہی کچھ دھیان کرو۔ آخر

میری نور جہاں چندا سے بڑی ہے تمہاری بیٹی کی جگہ ہے چندا کی عمر تو ابھی کچھ نہیں ہے اس جگہ

نور جہاں کی ہو جائے۔“

”ہاں ہاں۔ کیوں نہیں؟ ہمیں تو ابھی جلدی بھی نہیں.....“ امی نے صاف دلی و

خلوص سے کہا۔

میں عجب لا ابالی سی تھی مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ یہ بڑوں کے

جھگڑے ہیں وہ جانیں۔

مگر یہ بہر حال میرے نوٹس میں تھا۔ اپنی شادی کا سن کر عجیب سے تاثرات ہو جاتے

میرے۔ خود بخود شرم آ جاتی تھی۔ دلہنیں بہت اچھی لگتی تھیں مگر نتھ، بندیا پہن کر مرکز توجہ بننے کا

جنون بھی نہیں تھا۔

میں پانچ بھائیوں سے چھوٹی اور دو بھائیوں سے بڑی ہوں۔

پھر ایسا ہوا کہ میرے شاندار اٹھان والے بھائی دنیا کی نظروں میں آ گئے۔ آئے

دن گھر میں شادی بیاہ کی باتیں ہونے لگیں۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ پھوپھی جان اپنا کام کر چکی ہیں..... امی جان نے سرور جہاں کا رشتہ بھی مانگ لیا۔ میرے بھینا اس غضب کے حسین تھے، پہن اوڑھ کر تو نظروں میں نہ سماتے تھے۔ سرور جہاں خوبصورت تھی مگر اس میں بلا کی شخصی کشش نہیں تھی، بے نکا لباس، بے سوچے سمجھے گفتگو کرنا، باتیں کرنے کی شوقین تو ہے پر سے روٹی جلا کر اتارتی تھی۔ میں ایک حساس اور نفیس لڑکی ہوں۔ میرے ذہن میں تو ایک آئیڈیل بھابی کا بسیرا تھا۔ مگر پھوپھی جان کو کائنات سے خوشیاں سمیٹنے کا ہنر آتا ہے۔ جو لوگ نفس مار کر خوشیاں سمیٹنے کے قابل نہیں ہوتے وہ ہاتھ مار کر خوشیاں سمیٹتے ہیں۔ سرور جہاں آخر کار ہمارے گھر کی بڑی بہو بن کر آگئی۔ وہ تو امی اور میں چالوشین ہیں اس لیے اس کی پول نہ کھل پائی۔

پھوپھی جان تو حور جہاں کو بھی ہمارے در پر بیٹھنے کے درپے تھیں۔ اب امی اتنی بھی نادان نہ تھیں انھوں نے سرور جہاں سے ہی بہت سُرور لے لیا تھا۔

پھوپھی جان امی کے ساتھ رہا کرتی تھیں ان سے کرید کرید کر میرے متعلق پوچھا کرتیں کہ کہیں رشتہ تو نہیں ہو رہا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر نیم خواندہ لوگ میرے لیے منتخب کرتی تھیں اس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو بہت اعلیٰ اور ارفع مقام پر دیکھنا چاہتی ہیں جس طرح بعض لوگ پیدائشی طور پر مخصوص رجحان رکھتے ہیں، انھیں میں ایک حسد ہے اور یہ وہ ناگ ہے جو عرصے سے میری آستین میں پھنکار رہا ہے اسی حسد کا ناگ۔ حسد کی اپنی زندگی میں سکون نہیں ہوتا۔ اس کا تخریبی ذہن ہمہ وقت جوڑ توڑ میں مصروف رہتا ہے۔

میں آج اس عمر میں نہیں بہت عرصے پہلے پہچان چکی ہوں۔ پھوپھی جان کو۔ میری امی بہت بھولی ہیں۔ محبتوں میں بہہ جاتی ہیں۔ پھوپھی جان کی خود نمائی کی تمنا نے خون نہیں سیاہ حسد کا زہر بھر دیا ہے۔ مجھے ان سے نفرت نہیں ہمدردی ہے کہ خدا تو کل خدا خونی سے ہوتا ہے۔ دوسروں کی ہمہ وقت غیبت و بدائی سے دل سیاہ پڑ جاتا ہے، سفاک ہو جاتا ہے۔ خدا خونی ہو تو عیب جوئی نہیں رہتی۔ خدا پر اعتماد ہو تو کسی کا حق نہیں مارا جاتا، چھین لینے کی تمنا نہیں ہوتی۔

میں نماز کی عادی ہوں اس لیے صبر کی عادی ہوں..... میں نے ہمیشہ یہی سوچا خدا اگر بھلائی کرنا چاہے تو اس کو کون روک سکتا ہے؟ اگر میرے حوصلے جواب دینے لگے ہیں اگر اب میں کھلم کھلا ناگواری کا اظہار کرنے لگی ہوں کہ میرے بھی سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہے۔

میں بھی ارا مانوں کی چٹا میں جلتی ہوں، میرا بھی دل سنورنے کو چاہتا ہے، میرا بھی دل محفلوں میں دل سے ہٹنے کو چاہتا ہے، میرا بھی دل چاہتا ہے لوگ مجھے دیکھیں۔ حسد سے نہیں، ہمدردی سے نہیں، ترس کھا کر نہیں، رشک سے دیکھیں۔ مسکرا کر دیکھیں۔

میں اپنی ہم عمر لڑکیوں کی طرح باتیں کروں کہ ساڑھی میں نے میاں کی پسند سے باندھی ہے۔

ان کی چپائیاں میں اپنے ہاتھ سے ڈالتی ہوں۔ وہ مجھے فلاں بات پر ڈانٹتے ہیں وہ میری فلاں بات پسند کرتے ہیں۔ میرا بیٹا بہت ذہین ہے اپنے باپ کی طرح ہمیشہ فرسٹ آتا ہے۔ میری بیٹی بہت پیاری ہے۔ میں بہت دوراندیش ہوں، بیٹی کے لیے انشورنس پالیسی لے لی ہے۔ میری بھی اپنی ساس سے کبھی کبھار ”تو تو آپ آپ“ ہو جاتی ہے۔ میرے وہ..... میرے وہ۔

پھر میں رو پڑتی ہوں کہ جسے موت نہ مار سکے اسے نشانے لگا لگا کر طعنے مارو۔ میں لوگوں کے طعنوں سے آہستہ آہستہ مر رہی ہوں۔ آہستہ آہستہ میرے گھر میں بھائیوں کا ڈھیر ہو گیا ہے۔ میرے دو بھائی باہر ہیں۔ ہر بھائی کی شادی پر سونے کا سیٹ بنتا ہے۔ پانچ بھائیوں کی شادی ہو چکی ہے میرے پاس سونے کی چوڑیاں اتنی ہیں کہ دونوں کلا بیاں بھر کر بھی بچ رہی ہیں۔ میں وہی بھی ہو گئی ہوں۔ ہیرا نہیں پہنتی۔ نیلم نہیں پہنتی۔ زمر نہیں پہنتی کہ شاید مجھے اس نہیں۔ عقیق پتھر کی انگلی پہنے رہتی ہوں کہ یہ پتھر بہادر بناتا ہے، حوصلہ مند بناتا ہے اور اسی چیز کی مجھے زیادہ ضرورت ہے۔

آپ کو ایک واقعہ اور سناتی چلوں: اس وقت میں اٹھارہ برس کی تھی بی۔ اے فائل میں۔ ہمارے چچا زاد بھائی آفس کے کسی کام کے سلسلے میں ملتان آئے تو ہمارے ہاں قیام کیا۔

ہم کوئی دقیقہ نویسی لوگ نہیں ہیں اور پھر وہ فرسٹ کزن بھی تھے میں باتیں وغیرہ بھی کر لیتی تھی۔ ہمارے ابا جی فریج کا پانی نہیں پیتے ان کا گلا خراب ہو جاتا ہے تو ہمارے خوبصورت برآمدے میں دو گھڑے بھی رکھے ہوئے ہیں۔ میں گرمیوں میں موتیا کے گجرے گھڑوں پر لپیٹ دیتی ہوں پورا برآمدہ مہک جاتا ہے۔

اس روز میں نے گجرے بنائے بنائے کچھ پھولوں کو ملا کر گلہ مستہ بنایا اور ازارا

مہمان نوازی مہمان کے کمرے میں بھی سجانے چلی آئی۔ انتصار ہاتھ روم میں تھے۔ شاید میں نے گلدان سجایا جو نہی پٹی انھیں انتہائی انہماک سے اپنی جانب دیکھتا پا کر زرد ہو گئی۔ خدا جانے کیا خصوصیت آگئی تھی ان آنکھوں میں کہ مجھے حیا آگئی۔

”جی..... یہ پھول ہیں.....؟“ میں گڑبڑائی۔

”میں نے کب کہا کہ دھول ہیں۔“ شوخی سے جواب ملا۔ میں گھبرا کر چلی آئی۔

امی جی، ابا جی اور میں ہمیشہ گرمیوں میں کھلی چھت پر سوتے ہیں۔ میں سرشام ہی چھت پر بستر کرتی ہوں۔ آج بھی میں حسب معمول چھت پر آئی تو انتصار ایک پلنگ بچا کر ایک کتاب لے کر لیٹے ہوئے تھے۔

میں نے آہستگی سے اپنا کام جاری رکھا اور شیڈ میں کھڑے نوازی پلنگ اٹھا اٹھا کر درمیان میں لانے لگی..... انتصار اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ارے بھئی مجھے کہہ دیتیں۔“

”یہ تو میری روزانہ کی ڈیوٹی ہے۔“ میں نے بے نیازی سے کہا اور بستر لگانے لگی۔ جو نہی چادر جھٹک کر بستر پر پھیلائی انتصار نے دو کوئے تھام لیے اور بچھوانے لگے، مجھے عجیب سا لگا تھا۔ ابا جی کا سفید تکیہ سر ہانے رکھ کر دوسرے پلنگ کے لیے انھوں نے چادر اٹھالی اور بچھانے لگے تب میں نے دو کوئے تھام لیے اور بچھوانے لگی۔ یہ سب برجستہ و بے ساختہ تھا۔ مگر میں آتے ہوئے پلٹ کر نہ دیکھ سکی۔ کھلی چھت پر مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ جذبے تو خاموشی کی سیڑھی پر چڑھتے ہیں، جب آواز جاگتی ہے تو یہ نیند لیتے ہیں۔ پھر میں انتصار سے بہت کترائی۔

سرور جہاں بھابھی تو بھائی جان کے پاس سعودی عرب میں تھیں مگر پھوپھی جان اسی دم خم سے آتی تھیں انتصار کو بہت بہت بلا جاتی تھیں مگر جانے کیوں وہ وہاں رکھنے نہیں تھے۔ ایک روز پھوپھی جان آئی ہوئی تھیں کہ انتصار ایک قیص ہاتھ میں لے کر آ گئے۔ ”چندا..... ذرا یہ بٹن تو لگا دو۔“ میں نے ان کے ہاتھ سے قیص لے لی، ساتھ ہی پھوپھی جان کا کلیجہ بھی۔

جاتے ہوئے وہ انتصار کو اپنے ساتھ لے گئیں۔ ساتھ ہی میرا مقدر اور میرا سکھ بھی۔ پھر انتصار کا تمام وقت ان کے ہاں گزرنے لگا۔ آخر ایک دن خاموشی سے کراچی

سدھار گئے۔ میں الجھنوں میں نہیں تھی۔ سب سمجھتی تھی اسی لیے جب انتصار کا پیغام پھوپھی جان کی نمبر چار بیٹی منظور جہاں کے لیے آیا تو مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ منظور جہاں اب جہاں کو منظور تھی یا نہ تھی انتصار کو منظور تھی۔ منظور جہاں مجھ سے سال بھر چھوٹی تھی۔

میرا اپنا گھر سکھ کا گہوارہ تھا ملال جلد ہی مٹ گیا۔ میں نے بڑے اہتمام سے شادی میں شرکت کی..... انتصار سے ٹیگ جو تاج چھپائی جی بھر کر لی۔

میں بائیس برس کی ہوئی تو امی اور ابا جی کو فکر لاحق ہوئی اور اس وقت میں سرپیٹ کر رہ گئی جب اس بات کا تذکرہ پھوپھی جان سے کیا گیا۔ انھوں نے مجھے چکار کر گلے سے لگا لیا۔ ”اے ہاں..... میری لاڈل پری کو رشتوں کی کیا کمی۔ خواہ خواہ ہی فکر کر لیتے ہیں آپ

لوگ۔ اس کا ڈولا تو شان سے نکلے گا۔ میری چندا۔ میری بچی۔“ میں نے بمشکل مکر جال باتوں اور بانہوں سے پیچھا چھڑایا۔

اس مرتبہ میرا رشتہ منجھلی بھابھی کے رشتہ داروں میں سے آیا۔ وہ لوگ مسلسل کئی دن آتے رہے..... پھوپھی جان بھی شریک رہیں۔

”اے ہاں۔ یہ چندا تو میری سرور جہاں کی ہم عمر ہے، دو بچوں کی ماں ہے میری سرور جہاں۔“ باتیں تو پھوپھی جان کو ایسی لکھے دار آتی ہیں کہ سب بے ساختہ ان کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ”میری پانچویں بچی چندا سے دو برس چھوٹی ہے اے بڑی بھولی ہے۔ حسن تو بچوں میں بہت۔ اللہ ماری جانے کس پر گئی ہیں۔ میں بھی یونہی واجبی شکل کی، باوا الگ کم شکل بچیاں خدا معلوم کس پر گئی ہیں۔ اے میری چھوٹی بیٹی کو تو چندا کی شادی کا بہت ارمان ہے۔ خوب کپڑے بناتی رہتی ہے۔ میں تو ٹوک دیتی ہوں کہ آخر ماں کا کلیجہ ہے کہ نامراد ایسے اچھے کپڑے نہ پہنا کر کسی کی نظر کھا جائے گی۔ کام کاج میں تو یہ میری بچی ساری بہنوں سے آگے ہے۔ مشکور جہاں باوا نے بڑے دل سے نام رکھا تھا میری بچی کا۔ اے بہن کبھی ہمارے ہاں بھی آئیے.....“ انھوں نے لہجے میں مٹھاس بھر کر کہا۔

اور پھر وہ لوگ دوبارہ پلٹ کر ہمارے گھر نہ آئے۔ شاید اس لیے کہ اگر سرور جہاں دو بچوں کی ماں اور میری ہم عمر ہے تو جانے میری عمر کیا ہوگی۔ یا پھر اس لیے مشکور جہاں اپنی ماں کے بقول ہم صفت تھی۔ اور یوں مشکور جہاں بھی مٹ گئی۔

مگر اس مرتبہ ابا جی کو بہت تاؤ آیا کیونکہ اب وہ میرے مسئلے میں بے حد سنجیدہ ہو

امی کہہ رہی تھیں آئے تو ٹھیک کر دوں گی۔“ میں چونک گئی۔

”بے بی آپا کہہ رہی تھیں جب تک میرے پاؤں نہیں پڑیں گے میں نہیں جاؤں گی، بڑے گندے ہیں انتصار بھائی بے بی آپا کو جاہل، پھوہڑ اور بدتمیز کہتے ہیں۔ خود تو بڑے تمیز دار ہیں جیسے۔“ مخمور جہاں نے منہ بنایا۔

میری نگاہوں میں انتصار کا نفیس سراپا اور منظور جہاں کا بے ڈول جسمانی جغرافیہ اور بے ڈھب انداز گھوم گئے۔

”اگر ایسا ہو رہا ہے تو کوئی حیرانی کی بات نہیں.....“ میں نے سوچا۔

پھوپھی جان چلی گئیں امی کو مشورہ دے کر کہ لڑکی کی عمر نکلی چکی ہے۔ کسی رنڈوے، دوہا جو سے بیاہ کر اللہ اللہ کر دو۔

اباجی اور بھائیوں کو تو پچھنے لگے۔

”خبردار! سعیدہ سے کہنا آئندہ ایسی بات نہ کرے۔ ہم جانتے بوجھتے بیٹی کو کنوئیں میں دھکا دے دیں۔ کوئی بھاری نہیں ہے ہمیں اپنی بیٹی، تعلیم یافتہ ہے زندگی گزارنے کا سلیقہ ہے اس کے پاس۔ سعیدہ کو تو دشمنی ہے شاید چندا سے۔“

”اے توبہ! کیا کہہ دیا آخر اس نے ہمدردی میں کہہ جاتی ہے شامت ماری؟“ امی بولیں۔
”تم چپ کرو جی۔“ اب اباجی برہمی سے بولے.....“ کھلی آنکھوں سے کبھی نکلتی ہو۔ جس نے چندا کے رشتے کا قصد کیا سعیدہ نے وہیں اپنی بیٹی بیابانی زبردستی۔ میں اللہ کے بھروسے پر خاموش رہا۔ زمانہ دیکھا ہے میں نے۔ سعیدہ سے کہنا خیریت اسی میں ہے کہ وہ ہمارے معاملات میں مداخلت نہ کرے۔“ اباجی کے غصے پر امی چپ ہو رہی تھیں۔



میں چندا تھی۔ کیسا چندا؟ جو اماؤں میں چکراتا پھرتا تھا اور جبکہ اب میں نے انتظار ختم کر دیا تھا۔

اپنا آپ حالات کے سپرد کر دیا تھا۔

شوریدہ سرلہر کی طرح جھنور..... سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

تب ایک روز گھر میں کچھ پچھل سی مچی صرف مروانے میں۔

تیسرے روز ایک مختصر سی بارات آئی تھی۔

چکے تھے۔

”یہ سعیدہ نے کیا کھیل شروع کر رکھا ہے۔ ایک رشتہ ہمارے گھر سے یوں لے گئی تھیں کہ نور جہاں چندا سے بڑی ہے اس کا حق بھی ہے اور عمر بھی۔ مگر اب کیا ہو رہا ہے؟ لگتا ہے سعیدہ ہمارے ساتھ پر خلوص نہیں ہے۔ اسے صرف اپنی بیٹیوں کی فکر ہے بلکہ وہ چالیں چل رہی ہے۔“

”اے توبہ کریں خاں صاحب! کیوں بہن کو برا بھلا کہہ رہے ہیں وہ تو بے چاری خود اتنی فکر کرتی ہے..... اتنی مخلص ہے۔ یہ تو نصیب کی بات ہے۔“ امی پھوپھی جان سے مسکورتھیں اباجان کو ٹھنڈا کر دیا۔

مشرقی شرم و حیا نے کبھی مجھے ماں سے کہنے نہ دیا کہ ماں! دنیا وہ تو نہیں جو نظر آتی ہے۔ آنکھیں کھولو ماں کچھ سوچو۔ دیکھو۔ مگر مجھے خدا کا فرمان یاد آتا ہے کہ وہ فرماتا ہے خدا جس کا بھلا کرنا چاہے تو کوئی اسے روکنے والا نہیں اور اگر خدا کسی کو تباہ کرنا چاہے تو کون ہے جو اسے روک سکتا ہے۔ میں چپ سا دھم رہتی۔

بھابھیاں اپنے میں مگن رہتی تھیں اور کوئی دنیا میں بیس بائیس سال عمر کی لڑکیوں کی کی ہے جو مجھ پچیس سالہ کو کوئی گھاس ڈالتا یا پھر اس شہر میں میں واحد لڑکی تھی کہ ہر لڑکے والا ادھر ہی آتا۔ جنہیں آنا تھا آ چکے تھے۔

جمعہ کا دن تھا مہمان آئے ہوئے تھے پھوپھی جان کے گھر والے بھی تھے پھوپھی جان سمیت میں بعد نماز ظہر صلوٰۃ التسبیح سے فارغ ہو کر درود شریف پڑھ رہی تھی۔ جمعہ کے لیے یہ میرا خاص اہتمام ہوتا ہے۔ پھوپھی جان جھانک کر چلی گئیں۔ میں فارغ ہو کر باہر آئی تو عجیب سے لہجے میں بولیں۔

”اے بیٹیا کیا وظیفہ کر رہی تھیں اتنی دیر تک؟“

”جی ہاں۔ برائے دشمن و بلا ارض و سموات۔“ میں نے تنکھے لہجے میں جواب دیا تو گڑبڑا کر اپنا برقع تہہ کرنے لگیں۔ منجھلی بھابھی نے گھور کر مجھے دیکھا پھر جانے کیوں مسکرا دیں۔ میں کچن میں جائے بنانے آ گئی تو پھوپھی جان کی آٹھ سالہ مخمور جہاں بھی وہیں آ گئی اور باتیں کرنے لگی۔

”بے بی آپا (منظور جہاں) آئی ہوئی ہیں۔ بہت لڑتے ہیں انتصار بھائی ان سے

تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

”ارے بھئی، اس طرح تو نہ دیکھو۔ فی الحال یہیں ہوں تمہارے پاس بلکہ قریب..... اطمینان سے دیدار کر لیتا۔“

وہ آنکھوں میں جامد ہوتے تھیر کو شوخ مسکراہٹ میں چھپا کر گلے سے پھولوں کے ہار اتارتا ہوا بولا۔

وہ جو بیڈ سے پاؤں لٹکائے دوپٹے تک سے بیزار انتہائی خشکی نظر دے اس کی طرف متوجہ تھی، مزید تب گئی۔

”دراصل میں آپ کی اپنے کمرے میں بے تکلفانہ موجودگی برداشت نہیں کر پار ہی ہوں۔“

تب اس نے موزے کھینچتے ہوئے حیران نظریں اس پر دوڑائیں، پھر خود کلائی کے انداز میں گویا ہوا۔

”میں نے سنا نہیں ہوگا۔“

”کیا سنا نہیں ہوگا؟“ وہ اسی اکھڑپن سے بولی۔

”یہی کہ مہر مجمل کے ہمراہ بیوی کو ایک کمرہ بھی دینا ہوگا جہاں صرف وہی داخل ہوں گی سب بے دخل..... حضور سارا گھر آپ کا ہے، گھر والے سمیت۔“

وہ کوٹ وارڈ روب میں لٹکا کر پلٹا۔ قیص کے اوپری بٹن کھول کر جیسے ہی اس کے برابر میں بیٹھا وہ لپک کر دوسری طرف بڑھ گئی۔

”مانا کہ میری دوسری شادی ہے پر تمہاری تو پہلی ہے۔ تھوڑا سا حجاب مجھ سے ہی لے لو اُدھار..... لاؤ تمہارا گھونگھٹ ہی نکال دوں۔“ وہ اسے چھیڑتے ہوئے آگے بڑھا۔

”جب میں آپ کے لیے کوئی جذبہ اپنے دل میں محسوس ہی نہیں کرتی تو شرم کا فائدہ شاہ صاحب!“

”ارمان تو میرے کم ہونے چاہئیں کہ دوبارہ..... تمہارے لیے تو بہت ارمانوں و

اباجی نے سارا کام بالا بالا طے کر دیا تھا۔

صبح وہ خود خاص خاص گھروں میں دعوت دے آئے تھے۔

پھوپھی جان ہانپتی کانپتی آ پہنچیں۔

”اے توبہ بھابھی! ایسی بھی کیا پردہ داری۔ مانو ہوا ہی نہ لگائی۔ اے کیا ہم دشمن ہیں؟“

”اے میری چندا۔ میری لال۔“ وہ مجھے لپٹائے میری بری کا جائزہ لے رہی تھیں۔

چار مختلف جواہرات کے سیٹ، بے حساب کپڑا، میوہ، الم غلم۔

پتہ چلا میرے شوہر اپنے والد کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ چند ایک رشتہ داروں کے سوا ان کا کوئی نہیں۔ پچیس سال کی عمر میں ایک حادثے سے ان کی آنکھ ضائع ہو گئی تھی دو کامیاب آپریشن کے بعد بینائی بحال ہو گئی تھی..... پینتیس کے لپیٹے میں تھے پہلے ایک آنکھ کی وجہ سے ہر رشتہ دار نے بیٹی دینے سے انکار کر دیا تھا اب سزا کے طور پر وہ خاندان سے لڑکی لانا نہیں چاہتے تھے، اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ میرے سونے کے زیورات میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

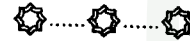
مگر سب سے بڑا زیور تو میرا سیف الرحمن ہیں۔

سب سے بڑا تاج تو میرا سیف الرحمن ہیں۔

میری سکھتا، میرا آسمان صرف سیف الرحمن۔

اور اب میں خوبصورت ساڑھی میں ملبوس اپنی زندگی کے ہمراہ اپنی شاندار موٹر سے اتر کر بیٹے کی انگلی تھام کر پھوپھی جان سے ملنے جاتی ہوں تو جانے کیوں سوچتی ہوں کوئی کتنا بگاڑ سکتا ہے؟ کس قدر بگاڑ سکتا ہے؟؟

مگر جانے کیوں میرا احساس دل پھوپھی کی بیٹیوں کے دکھ پر افسردہ ہو جاتا ہے۔



جب وہ ہاتھ روم سے باہر آئی تو وہ کمرے میں موجود نہ تھا۔ اس نے کمرہ تاریک کیا۔ پچھل اسپیڈ پر کیا اور بیڈ پر ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح گر گئی۔

”اوہ مائی گاڈ! یہ پھول میں نے تمہیں یہاں لگانے کو کہا تھا۔“ وہ گلا پھاڑ کر چیختی تھی۔ مائی کپکپا کر رہ گیا۔

”جی اب کیا کروں؟“ وہ لرزتا ہوا بولا۔

”یہ کھرپا اٹھا کر میرے سر پر دے مارو۔“ وہ بھڑک کر بولی۔

”مار دے یار! ایسے موقعے کبھی کبھار نصیب ہوتے ہیں۔“ وہ اپنی پشت سے اجنبی آواز سن کر بے طرح اچھلی۔

ڈارک براؤن پینٹ اور لائٹ براؤن شرٹ میں بے حد شوخ سا نوجوان سینے پر ہاتھ لپیٹے کھڑا تھا۔ اسے اپنی جانب متوجہ دیکھ کر بوکھلا سا گیا۔

”چلیں، بے چارے کو معاف کر دیں۔“

”آپ کہاں سے آئے ہیں اس کے ہمدردین کر؟“ وہ چیختی۔

”گلشن سے، میرا مطلب گلشن اقبال۔“

”کیا پوچھ رہی ہوں، میں تم سے۔ کہاں رہتا ہے تمہارا دماغ؟“ وہ اس اجنبی کو یکسر نظر انداز کر کے دوبارہ مائی پر برس پڑی۔

”میں تمہارے باپ کی نوکر ہوں ہر وقت تمہارے سر پر نازل رہوں کبھی تو ڈھنگ سے کام کرو یا کرو۔ مجھے مل جائے کوئی ڈھنگ کا مالی دیکھنا کیسا پتہ کاٹتی ہوں تمہارا۔ ناس مارو یا اتنے خوبصورت پودوں کا۔“ وہ پیرنچ کر اندر کی سمت بڑھی تو وہ سامنے آ گیا۔

”کم از کم مجھ سے تو پوچھ لیں کہ آپ کے گھر میں کیوں نظر آ رہا ہوں؟“

”یہ میری ڈیوٹی نہیں ہے۔“ اس نے آگ برساتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”پھر وہ شخص بتادیں جو آن ڈیوٹی ہے۔“

مگر وہ آگے بڑھ گئی۔

”یا اللہ خیر رکھنا۔“

”جایا! تو کہہ دے اندر کہ کامران کے دوست آئے ہیں اور جلدی میں ہیں۔“ وہ

انتظار کا صلہ ہے آج کا دن، بلکہ اب تو رات.....“

”خوش فہمی ہے آپ کی۔ میں نے کبھی ایسی لغویات کا ارمان نہیں پالا۔ جانیئے اپنے کمرے میں، میں سونا چاہتی ہوں اب۔“

”آپ بچی نہیں ہیں ماہر! عمر کے جس دور میں آپ ہیں وہاں تو ہر بات از خود سمجھ میں آ جاتی ہے۔“ اس نے پھر انداز بدل دیا بلاتوں کا۔

”اور بھی چلو اب دو چار باتیں ہی کر لو۔ اتنے عرصے بعد کمرہ آباد ہوا ہے۔“ وہ ہنکے ہوئے انداز میں اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

”رسم ہے، پوری کرنا ہے، یہ انگلی ہی قبول کر دینی الوقت“ وہ اس کی انگلی میں انگلی ڈالتا ہوا بولا۔

اس نے شاہ عالم کے صحت مند چہرے و نفیس تراش کی مونچھوں کو بیزاری سے دیکھا۔

”اب تو آپ کو میرے سونے پر اعتراض نہ ہوگا؟ سخت تھکی ہوئی ہوں، بات کرنے کا قطعی موڈ نہیں۔“

”سننے کا بھی نہیں؟“ وہ اپنی ہنسی ہوئی آنکھیں اس پر گاڑ کر بولا۔

”نہیں۔“ وہ سختی سے نہیں کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ اس کے شانوں کو تھام کر بولا۔

”کل بچے اپنی نانی اماں کے پاس سے آ جائیں گے اور ان شیطانوں کی موجودگی میں، میں بات کرنے کو ترس جاؤں گا اور آج تو ویسے بھی.....“

”شاہ صاحب! یہ شادی نہیں ہے معاہدہ ہے۔ بچوں کے سکھ کی تجارت، وگرنہ میں نے کبھی آپ کی بیوی بننے کی خواہش اپنے دل میں محسوس نہیں کی بلکہ مجھے آپ سے..... آپ سے..... یوں سمجھ لیں ایک طرح کی نفرت سی ہے۔ آپ نہ میرا آئیڈیل ہیں نہ پسند۔“

اتنا کڑواہٹ بھرا لہجہ، شاہ کو جھرجھری سی آ گئی۔ اس کی گرفت شانوں پر ڈھیلی پڑ گئی۔

”کیا ضرورت تھی مجھ پر احسان کرنے کی؟“

”میں نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا۔ آپ مجھے بچوں کی آیا تصور کر لیں یہ بچے مجھے جان سے زیادہ عزیز ہیں، بس۔“

جواب ایسا تھا کہ وہ بے ساختہ چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔ آنکھوں کے چراغ بجھ سے گئے۔

گدی پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ مالی اندر بڑھ گیا۔



”اس گھر میں جتنی بے انصافی و زیادتی میرے ساتھ ہوئی ہے کوئی تصور نہیں کر سکتا۔“ وہ پیر شیخ کر بڑبڑاتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو اپنا مسکرا دیں۔
”اب کیا ہو گیا؟“

”مجھے ندا کے گھر جانا ہے۔ پایا چھ بجے آئیں گے۔ کامی بھائی خدا معلوم کہاں ہیں۔ سب اپنی اپنی گاڑیوں پر اترتے ہیں۔ انشاء اللہ میری بھی ایک دن رولس راکس ہوگی۔ پھر سب کی رالیں ٹپکیں گی۔ ماہی! مجھے دے دو۔ ابھی لا دوں گا۔ ماہی! دو گھنٹے کے لیے۔ دوں گی اچھی طرح۔“ وہ منہ پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بڑبڑاتی۔

”اے شیخ چلی کی تانی! کیوں خون جلاتی ہو۔ وہ لان میں بیٹھا ہے کامی اس کا کوئی دوست آیا ہوا ہے۔“ اپنانے بے حد چاہ سے اپنی پیاری بہن کو دیکھا۔

وہ ایک دم کامران کے سر پر پہنچ گئی۔ ”کامی بھائی! پلیز ذرا مجھے گلشن ڈراپ کر آئیں۔ سچی آنے کی کوئی پرابلم نہیں ہے۔“

کامران لائسنس جلائے آگے کو جھک کر دوست کی سگریٹ جلا رہا تھا۔

”آگے پیچھے بھی دیکھ لیا کرو۔“ اس نے پشت پر کھڑی بہن کو ٹوکا۔

”کل پیچھے دیکھا تھا۔ آج آگے دیکھ رہی ہوں۔ ایک ہی چیز ہے۔“ وہ لاپرواہی سے کل والے نو جوان پر نگاہ ڈال کر بولی۔

”سوری یار! یہ میری چھوٹی بہن ہے۔ مزاج میں بچپن بہت ہے اور.....“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ اب یہ مت کہہ دیجیے گا کہ سولہ کا سن لگا ہے۔ پورے بائیس برس کی ہوں گر بچوٹ۔ کامران بھائی پلیز۔ اگر آج وعدے کے مطابق نہ پہنچی تو وہ ندا کی بچی کل میری کھال کھینچ ڈالے گی۔“ اس نے ایک تسلسل میں تعارف و دھڑکا بیان کیا۔

”ایک تو تمہاری سہیلیاں بھی تمہاری طرح چڑیلیں ہی لگتی ہیں۔ بال کھال نوچنے والی۔“

”چلو یار! مجھے بھی ڈراپ کر دینا اگر گلشن ہی جا رہے ہو۔“ وہ نو جوان اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دونوں آگے بیٹھے تھے۔ وہ پیچھے باقاعدہ دراز تھی جس پر کامران نے ٹوکا بھی تھا۔

”آپ کو ہوگی ان راہ چلتوں کی پرواہ، زمانے کی فکر، مجھے نہیں۔ ہمیں آزاد زمین پر

آزاد وطن میں آزاد پیدا کیا گیا ہے۔“ وہ اپنی دو چونیاں پیچھے پھینک کر بولی اور پھر اسی طرح ہو گئی۔
دونوں بے ساختہ ہنس پڑے۔

”کم از کم میرے مہمان ہی کا لحاظ کر لو۔“ آخر کامران نے کہہ دیا۔

”روز روز آنے والے مہمان نہیں ہوتے۔“

”تم نے انھیں کہاں روز روز دیکھ لیا؟“ وہ ایک موڑ کاٹ کر بولا۔

”کل آئے تھے آج بھی دیکھ رہی ہوں۔ لگتا ہے اب عمر بھر دیکھوں گی کیونکہ اتنا بے

تکلف تو کسی کو بھی نہیں دیکھا آپ سے۔“

گیٹ پر ندا غالباً اسی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ وہ ہاتھ ہلا کر چیخی۔

”ندا! میں آگئی ہوں بھئی۔ لڑنا مت۔“

کامران نے اسٹیرنگ چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

”اچھا کامی بھائی! خدا حافظ۔“

”کیا کیا جائے یار! اس کا، بالکل بھی سنجیدگی نہیں۔“

وہ مسکرا دیا۔ ”برانہ ماننا یار! اول تو میں نے کبھی گھرے دوست نہیں پالے۔ میرے

دوستوں کی بھی عادی نہیں۔ ایٹھ تک تم ہی دوست تھے اس کے بعد کوئی نہ بن سکا۔ پھر میڈیکل

لائسنس کی مصروفیات۔ اسی لیے تمھیں کوئی..... سوری یار۔“

”ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ اخلا قاف بولا۔



”ارے ایسا! کسی طرح ملو بھئی، کوئی رشتہ امی کو پسند نہیں آتا، کوئی پایا کو، کوئی آپ کو

اور کامی بھائی کو۔ کیسی لڑکی ہیں آپ؟ ذرا جلدی نہیں۔“

اپنا ہنستے ہنستے دہری ہو گئیں۔ ”ارے بھئی، بہت بری لگ رہی ہوں۔ اگر تمھیں

جلدی ہے تو تم چلی جاؤ بی کے نگر۔ میں بھلا منع کر رہی ہوں۔“

”میں تو خیر شادی ہی نہیں کروں گی۔ مجھے تو اپنی کوئی فکر نہیں ہے۔ ایم اے میں

ایڈمیشن لے رہی ہوں۔ اس کے بعد لیکچرر شپ کروں گی۔ اپنی رولس راکس کا خواب پورا

کروں گی مگر شادی نہ کروں گی، سمجھیں آپ کہ نہیں؟ بھئی آپ کو آخر کرنی ہی ہے تو جلدی

سے کر ڈالیں۔“ وہ شیف میں کتابیں جماتے ہوئے بڑی مصروفیت کے انداز میں سرسری سا

کر لائے ہیں۔“ وہ کھر درے انداز میں گویا تھی۔

وہ چکرا کر رہ گیا۔

”کامران کہاں ہیں؟“

”آج ہمارا سارا گھر نکاح پارٹی میں ہمارے سب سے بڑے تایا کے ہاں مدعو ہے،

سب تماشا کی وہیں ہیں۔“

”تماشا کی؟“ وہ شپٹایا۔

”یہ نکاح بیاہ لڑکا لڑکی کا تماشا ہی تو ہوتا ہے۔ بلائٹ نہیں تحفہ و حنفہ بھی دینا پڑتا

ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا؟“

”جی نہیں، آپ کے علم سے آج ہی فیض یاب ہوا ہوں، شکریہ۔“

وہ پلٹا عجیب بدتمیز لڑکی ہے۔ خود بھی بھیگ رہی ہے میرے کپڑوں کا بھی ناس مار دیا۔

اخلاق تو چھو کر نہیں گزرا کہ کہیں بیٹھنے تک کو نہیں کہا۔ مزاج تو پیدا نشی تیکھا تھا سیہ دکھانے سے تو وہ کہیں بھی نہیں چوکتا تھا۔ اپنی گاڑی کی سمت بڑھ گیا۔ معاسے اپنی پشت کی سمت سے آواز آئی۔

”عبدالرحمن، انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔“

ملازم اتنے ادب سے گویا ہوا کہ اسے ناچار ڈرائنگ روم کی طرف مڑنا پڑا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سبز کا ہی پلین سوٹ میں ٹرائی لیے اندر داخل ہوئی۔

”ہمارا خانساں بھی آج چھٹی منارہا ہے اس لیے مجھے ہی تکلیف کرنا پڑی۔ ایک

بات بتائیے گا۔“ وہ جائے بناتے ہوئے گویا ہوئی۔

”دو پوچھ سکتی ہیں۔“

اس کے مذاق پر اپنی بد مزاج نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

”میں نے آپ سے اجازت نہیں مانگی۔“

”ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ آپ کا اور کامران بھائی کا کیا جوڑ ہے؟ وہ سنجیدہ ڈاکٹر

جب کہ آپ تو بگڑے نوابوں کی طرح بس گھونٹنے پھرنے عیش کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔

کیوں کامی بھیا کو تباہ کرتے ہیں۔ ویسے ہی ان کے ناپ کی لڑکیاں نہیں خاندان میں۔ غلط

صحبت میں بگڑ گئے تو میں تو ڈھنگ کی بھابی کو ترس جاؤں گی۔ پلیز انھیں کچھ کرنے دیں کیوں

ہر وقت ان کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔“

مسکرا کر بولی۔

”ہونہہ! جب شادی کا وقت آئے گا تو چوں بھی نہ کر سکے گی میری گڑیا۔ بڑے

آرام سے بغیر روئے دھوئے چلی جائے گی۔ جب اپنا پیچھے سے آ کر چپکے سے پوچھے گی تو مایہ

کہے گی۔ وہ تو مذاق تھا اپنا۔“ وہ دوپٹہ اٹھا کر شانوں پر پھیلاتی باہر نکلتے ہوئے ہنس کر بولیں۔

”جی نہیں، شکریہ۔ اللہ کرے آپ ٹلیں جلدی سے۔ ہمارے گھر کے در و دیوار کو بھی

پتا چلے کہ شادی کیا ہوتی ہے۔“

اپنا کی خوبصورت سی ہنسی اس نے کمرے میں سن لی۔ گویا انھوں نے اس کی

بڑ بڑاہٹ سن لی تھی۔



وہ اپنا اور کامران سے چار برس چھوٹی تھی۔ اپنا یعنی ماہ رخ اور کامران چند منٹ

چھوٹے بڑے تھے۔ عثمان صاحب کا بڑے پیمانے پر چڑے کا کاروبار تھا۔ ماہ رو جسے سب پیار

میں ماہی کہتے تھے، گھر بھر کی لاڈلی تھی مگر خاندان بھر کی آنکھوں کی ٹھنڈک بھی تھی۔ لا پرواہ،

صاف گو، پڑ اعتماد، ڈھیروں محبتوں و چاہتوں اور اہمیتوں نے اس میں بلا کا اعتماد بلکہ تھوڑی

تھوڑی خود سری بھی بھردی تھی۔

آج شاہ عالم کامران سے ملنے آیا تو پورنیکو سے باہر نکلتے ہی بوندیں برس پڑیں۔ گھر

میں بے حد خاموشی تھی۔ وہ تیزی سے برآمدے کی سمت بڑھا مگر پھر ٹھٹک گیا۔ وہ گلاب کے

کنج کے پاس کھڑی جان بوجھ کر بھیگ رہی تھی۔ بال ایک طرف ڈالے وہ گردن پر پھوار لے

رہی تھی۔

”بات سنیں۔“ وہ قریب جا کر گویا ہوا۔

”پیے لگیں گے۔“ بے نیازی سے جواب ملا۔

”بات یہ ہے۔“ وہ اس کی طراری پر جزبہ ہو کر رہ گیا۔ اس نے جھکے سے بال پیچھے

پھینکے۔ ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔

”کہاں ہے؟“

”کیا؟“ وہ سخت حیران ہوا۔

”بھئی، بات“ اور کیا۔ آپ ہی تو کہہ رہے تھے بات یہ ہے۔ میں کبھی ”بیزر“ پر لکھ

وہ بے نیازی سے رسالہ پڑھنے لگی تھی۔
تب اسے غصہ ضبط کرنا پڑا کہ کامران کی غیر موجودگی میں ویسے بھی اس کا رکنا غیر ضروری تھا جبکہ ماہی سے ڈھنگ کا تعارف بھی نہ تھا۔
وہ برہمی میں چاہنے کے باوجود اس پر آخری نگاہ نہ ڈال سکا۔ بغیر پلٹے اس سے مخاطب ہوا۔

”کامران سے کہیے گا کہ ڈاکٹر خان نے رات فائل کے لیے فون کیا تھا۔“ اس کے ساتھ ہی تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔
ماہی نے اس کے بھیکے لباس کو نظر اٹھا کر دیکھا اور بے آواز ہنس پڑی۔



اور پھر آہستہ آہستہ شاہ عالم گھر کا ایک فرد بن گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ ایشیہ میں تھا جب اپنے والد اور بہن جو بڑی تھیں، کے ہمراہ لندن چلا گیا تھا۔ اسی زمانے میں وہ کامران کا بہترین دوست بن چکا تھا۔ لندن جانے کے بعد ان میں باقاعدہ فون و خط و کتابت کا رشتہ قائم رہا تھا۔ تب ماہی کو یاد آیا کہ کسی شاہ عالم کو اس نے دو ایک بار فون پر ریسیو بھی کیا تھا۔ یہ آج سے دو برس قبل کی باتیں تھیں سو اس کے ذہن سے محو ہو چکی تھیں۔ ویسے بھی وہ ایک خود میں گم رہنے والی لڑکی تھی۔ ہر دم خوشیاں سمیٹنے والی، کھلکھلانے والی۔ کسی بھی بات کو سرسری سے زیادہ لینے کی عادی نہ تھی۔

اب یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہ عالم بہن کی شادی کے بعد پاکستان مستقل آ گیا تھا۔ یہاں بہت بڑے پرائیویٹ ہسپتال میں نمبر دوسر جن تھا۔ ماہی کو یہ سن کر سخت تعجب ہوا کہ وہ سر پھر اسانو جوان اتنے سنجیدہ پیشے میں.....؟
اس کے والد کا قالینوں اور آدنی کپڑوں کا بہت بڑا بزنس تھا۔ وہ زیادہ تر باہر ہی رہتے تھے۔

یہ باتیں اسے خود بخود معلوم ہو گئی تھیں وگرنہ اس نے کبھی جستجو نہ کی تھی۔
آج سنا کہ کوسٹ سے آئی ہوئی شاہ عالم کی بہن ان کے گھر آ رہی ہیں۔ اپنا چائے کے لوازمات میں لگی ہوئی تھیں۔ امی کا خیال تھا کہ کھانے پر کسی روز انھیں میاں کے ہمراہ مدعو کریں گے۔

”آپ کامران کی باجی ہیں؟“ وہ مسکرایا۔
”جی نہیں، جانشین بہن ہوں۔ چھوٹی ہوں ان سے۔ اسی وجہ سے آپ کو چائے بھی بنا کر دے دی کہ وہ برامنا نہیں گے کہ ان کے جگہری یار کو انٹرٹین نہیں کیا، ویسے بھی۔“
”کیا ویسے بھی.....؟“
”کچھ نہیں.....“ وہ ٹرائی سے تلے ہوئے باداموں کی پلیٹ نکال کر تپائی پر رکھتے ہوئے بولی۔

”ویسے عجیب بات ہے مجھے آج تک آپ کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔“
”میری خوش نصیبی کہ آپ کو اس کا خیال تو آیا۔“
وہ واقعی اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھنے لگا۔
”ناچیز کو شاہ عالم کہتے ہیں۔“ وہ ہلکا سا شرارتی ہوا۔
”آپ کا تعلق خاندان مغلیہ سے تو نہیں۔“ وہ بڑی سادگی سے گویا ہوئی تھی۔
”جی نہیں۔“ وہ جل کر بولا۔ ”آپ کو کیوں کر گمان ہوا؟“
”دیے ہی کہ جہانگیر، عالمگیر، شاہ جہاں تو ہو گزرے۔ بس شاہ عالم ہی رہ جاتا ہے“
”عالمی ناموں“ میں۔ میں سمجھی.....

وہ اپنا بے ساختہ تہقہ نہ روک سکا۔ جب کہ وہ اسی سرد مہر انداز میں بیٹھی رہی۔ اپنے تہقہ پر وہ خود ہی شرمندہ ہو گیا۔ ایک ہی بات پر ایک آدمی ہنسے دوسرا چپ رہے تو ہنسنے والا خود کو احق ہی لگتا ہے۔

”کب تک آئیں گے کامران؟“
”ظاہر ہے رات گئے تک ہی واپسی ہوگی۔“ وہ ٹرائی دکھیل کر ایک طرف کرتے ہوئے بولی۔

”آپ کی چائے کا بے حد شکریہ۔“ وہ میز سے چائیاں اٹھا کر کھڑا ہوتا ہوا شکر گزار ہوا۔
”کوئی بات نہیں۔ میں اپنے پیارے بھائی کی خاطر اس سے زیادہ بے کار کام بھی کر سکتی ہوں۔ گھر میں تو خانہ ماں تک نہیں تھا آج۔ ظاہر ہے مجھے ہی بھگتنا تھا۔“ وہ اپنی دانست میں روداداری برت رہی تھی۔

ادھر شاہ عالم کا جی چاہا حلق میں انگلی ڈال کر وہیں چائے الٹ دے۔

میں وہ شاہ عالم کا قرار بن کر آ گئی۔

بجو نے اسے اور ندا کو پیار کیا۔ پھر تعارف ہوا کہ یہ ماہ رخ سے چھوٹی ہے اور یہ ان کی سہیلی ہے۔

سب نے انھیں محبتوں سے الوداع کہا۔

بجو بے حد خوش تھیں۔ ”ماشاء اللہ بہت اچھے لوگ ہیں، لڑکیاں بھی بہت پیاری ہیں۔“ وہ مسرور سا ہو گیا۔

صبح وہ بالکنی میں تھا۔ بجو گل بھائی سے کہہ رہی تھیں۔ ”پرسوں بیگم عثمان نے کھانے پر بلایا ہے۔ تب باقاعدہ بات کروں گی۔ پاپا کی طرف سے بھی رات اجازت مل گئی ہے۔ انھوں نے آپ پر اور مجھ پر اعتماد ظاہر کیا ہے۔ چلیں شکر ہے اس گھر کا بھی نصیب جاگے گا۔ عورت کے بغیر گھر ہی کیا۔“ وہ باتیں کرنے لگیں۔

وہ جان بوجھ کر ڈنر پر نہ گیا۔ اس کی خود سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کیوں اسے بہت بے چینی سے دونوں میاں بیوی کا انتظار تھا۔ کتنے ہی چکر وہ گیٹ کے کاٹ چکا تھا۔ بجو کی ہنسی پورنیکو سے پھوٹی تو وہ بے قرار سا ہو گیا۔ وہ لپک کر باہر آیا تھا۔ بجو نہیں۔ ”چھری تلے دم تو لو۔ لڑکی والے کیا ایک دم ہی ہاں کر دیتے ہیں.....؟“ ”ویسے انھوں نے ناامید تو نہیں کیا ہے کیونکہ تم انھیں بہت پسند ہو۔ وہ ہفتے بعد جواب دیں گے۔ گزار لو گے؟“

وہ مسکرائیں تو شاہ عالم جھینپ گیا۔ گل بھائی نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ دو ہفتے کیسے گزرے، نہ بیان ہو سکتا ہے نہ تحریر۔ وہ ان دو ہفتوں میں ایک مرتبہ بھی ”عثمان والا“ نہ گیا۔ کامران البتہ دوسرے تیسرے روز آتا رہا۔ مگر دونوں کی زیادہ باتیں پیشے سے متعلق ہوئیں۔

جس روز بجو جواب لینے گئیں اس نے سارا عرصہ ریکارڈز سننے میں گزارا۔ پاپا بھی لندن سے آ گئے تھے۔ آج وہ بھی ہمراہ تھے۔ بجو کے آنے کے بعد وہ کافی دیر کمرے سے باہر

اس روز وہ صبح سے ندا کے ہاں گئی ہوئی تھی۔

”ہاں بجو! وہ لوگ بہت اچھے ہیں، آپ کو پسند آئیں گے۔“

”بھئی، یہ بات تھی تو پہلے بتا دیجئے۔ مجھے تو اس سونے گھر سے بہت ہول آتا ہے۔ بہت پہلے گھر بس جاتا۔“ وہ شرارت سے مسکرائیں وہ بھی مسکرا دیا۔ منزل خود بخود اتنے قریب آجائے گی گمان بھی نہ تھا۔ جانے کیوں دل بے حد یقین و مطمئن سا تھا، مگر ایک گبیہر سادھڑ کا صرف اسی کی طرف سے تھا۔ اسی لیے اس نے بجو کے سامنے باقاعدہ نام نہ لیا تھا۔ کامران نے ایک ماہ قبل بتایا تھا کہ ماہ رخ کے لیے کسی گزشتہ آفسر کا رشتہ آیا ہوا ہے اور سب گھر والوں کو بے حد پسند آیا ہے۔ اس روز وہ بے حد خاموش سا تھا۔ شاہ عالم کے پوچھنے پر اس نے یہ بات بتائی تھی۔ مزید کہا تھا کہ اسے ماہ رخ سے بے حد پیار ہے۔ کہاں پنڈی، کہاں کراچی؟ بس اسی وجہ سے اداس ہوں۔ یار اب یہ کڑا وقت آنا شروع ہو گیا ہے۔ اتنی پیاری بہنیں جانے کہاں کہاں بسیں گئیں؟

وہ کامران کی اداسی دل سے محسوس کر رہا تھا۔ اس پر بھی یہ کڑا وقت آیا تھا جب بجو برطانیہ سے پاکستان آئی تھیں۔

اسے معلوم تھا کہ ماہ رخ کے بعد ماہ رو کا نمبر ہے۔ اس مرتبہ بجو نے اس کی شادی کا تذکرہ کیا تو اس نے عثمان صاحب کے گھر کا بتا دیا۔ ماہ رو سے جانے کیوں ڈھڑکا تھا کہ اس نے اگر انکار کر دیا تو وہ یہ انسلٹ برداشت نہ کر پائے گا۔ وہ چاہتا تھا بجو اپنے طور پر بات کریں تاکہ وہاں دوبارہ جانے والا منہ نہ جائے۔ جب وہ بجو اور ان کے شوہر جسٹس گل کے ہمراہ وہاں پہنچا تو سب ان کے منتظر تھے مگر وہ نہ تھی جس کے بغیر کچھ بھی نہ تھا۔

ماہ رخ سرخی مائل براؤن شلوار سوٹ میں نفیس جار جٹ کا ہم رنگ دوپٹہ پہنے دراز بالوں کی سادہ سی چوٹی، سپل سی لیدر کی چپلوں میں بے حد حسین لگ رہی تھی۔ عصر کی اذان کی وجہ سے گلابی چہرہ دوپٹے کے ہالے میں لوٹے لے رہا تھا۔

سادہ سی لڑکی بجو کی روح تک کو جھنجھوڑ کر رکھ گئی۔ وہ سمجھ گئیں ان کا عقل مند و لائق فائق بھائی واقعی گہر یکتا جن رہا ہے۔ وہ جانے ہی والے تھے کہ وہ ندا کے ہمراہ اندر داخل ہوئی اور بجے بجے سے شاہ عالم کے چہرے پر نور آ گیا۔ سیاہ شلوار قمیص، سرخ کڑھائی کے دوپٹے

مہندی کی شب، سبز کرتے پانچاھے، دھنک کچکے سے سجے دوپٹے میں وہ اس کا دل خون کر گئی تھی۔

اس کی انگلی پکڑے چپکتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اس کا جی چاہا اس خوش باش و بے فکری لڑکی کو اتنا بڑا دکھ دے کہ اس کے آنسو کبھی خشک نہ ہوں۔

”میں تمہیں ایک بار ترپ ترپ کر روتا دیکھنا چاہوں گا۔ میں تمہیں بے جل مائی دیکھنا چاہتا ہوں۔ کاش! تم نے مجھے تھوڑا سا بڑھنے دیا ہوتا۔ میں کسی اعتماد کے شکنے کے سہارے تمہارا نام لے کر بجو کو بھیجتا۔ کاش! میں تھوڑا سا بے حمیت ہوتا۔ کاش! مجھے اپنی انا عزیز نہ ہوتی۔ اب تو سدا ایک جھلکتی نار بن کر مجھے جھلسائے گی، سلگائے گی۔ مجھے بے ایمانی کے راستے پر لگانے والی..... خدا کرے تیرے دل میں بھی کوئی کاشنا، چھ جائے۔“ اس نے سفاکی سے دل ہی دل میں بدو عادی۔

اس کے موتیوں جیسے دانتوں سے نکلنے والی کرنیں اسے دہکانے لگیں۔ رسم کے بعد وہ گاڑی لے کر کلفٹن کے ساحل پر چلا آیا۔ چپل اتار کر دیر تک ٹھنڈی نم ریت پر ٹہلتا رہا۔

کیا غم عشق کو غم ہستی بنا لوں.....؟

وہ پیاری سی، معزز، کم گو، بے مثل لڑکی ماہ رخ۔ اس کا گناہ، اس کی خطا.....؟

اس نے مجھ سے کتنی توقعات باندھی ہوئی ہوں گی۔

جو کل شب اپنے دل کی تمام کلیاں کھلا کر میرا انتظار کرے گی۔

میرے منہ سے جانے کیا کچھ سننا چاہے گی۔

نہرا کے قابل تم ہو ماہ رو۔

میں، میں..... ماہ رخ کے لیے ستم گر نہ بنوں گا۔ اسے اتنی محبت دوں گا کہ ماہ رو مارے رشک کے تم کبھی سوچو گی۔ ضرور اپنے گرد اس قدر حصار باندھ کر رکھے تم نے؟ کس قدر خود پسند ہو تم۔ کتنا غرور ہے تم میں۔ تم نے مجھے تباہ کر دیا۔ کاش! تم کبھی اپنے خول سے باہر نکل کر مجھے ملتیں۔ میں کیا کیا نہ کر لیتا۔ کیا تم اتنی اہم ہو میرے لیے کہ میں شب کے دو بجے بے کلی کے عالم میں خود سے بے گانہ ہو چلا ہوں۔ انا پرستوں کا دل محبت بھرا نہ بنایا کہ مولیٰ! خوشیاں خود بخود حرام ہو جاتی ہیں۔

وہ تھک کر ریت پر بیٹھ گیا۔

نہ نکلا تو وہ خود آگئیں۔

”کہاں ملے گی تمہیں ایسی بجو؟ بہت مبارک ہو بھئی۔ لڑکی بھی پیاری مقدر بھی پیارا۔ انشاء اللہ دو ماہ بعد دلہا بن جاؤ گے۔ سچ بے حد خوشی ہے کہ اتنی پیاری، باسلیقہ اور حسین رکھ رکھاؤ کی لڑکی بھوج بن رہی ہے ورنہ اتنی ساری خوبیاں ایک لڑکی میں کہاں ملتی ہیں؟ بہت مقدر والے ہو ماشاء اللہ۔“ انھوں نے محبت سے کہا۔

”اگر میرا ایک اور بھائی ہوتا تو میں چھوٹی کو بھی مانگ لیتی۔ اگرچہ وہ تھوڑی لا پرواہی ہے مگر لوگ واقعی بہت اچھے ہیں۔“

اس کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا..... چھوٹی..... چھوٹی..... چھوٹی.....؟؟

”کیا کہہ رہی ہیں بجو.....؟“

”ماہ رو کی بات کر رہی ہوں جسے سب گھر میں مائی کہتے ہیں۔ واقعی بہت اچھی ہے مگر ماہ رخ کی سی بات کہاں.....“

اس کے ذہن پر تھوڑے سے برسنے لگے۔

بجو تو مسکراتی ہوئی باہر نکل گئیں مگر وہ پتھر سا ہو کر رہ گیا۔ تقدیر کا مذاق۔ بھیا نک مذاق۔ دو چار ہاتھ جب لب بام رہ گیا۔ بجو نے بتایا تھا کہ انھوں نے ایک اور شان دار رشتے پر اسے ترجیح دی ہے۔ ایک ماہ سے وہ رشتہ آیا ہوا تھا وہ بے طرح خاموش ہو کر رہ گیا۔ بجو اور گل بھائی تو زیارت واپس چلے گئے کیونکہ بچے دادی اماں کے پاس چھوڑ کر آئے تھے۔ اسکول کی وجہ سے اس لیے جلدی جانا پڑا۔

پاپا تو پاکستان آ کر مصروف رہتے تھے۔ اس کا دکھ کوئی نہ جان سکا۔

کامران آخر پوچھ بیٹھا۔ ”یار! کیا بات ہے بہت اپ سیٹ رہتے ہو۔“ تو وہ بے معنی سے ہنسی ہنس کر رہ گیا تھا۔

جی جلنا کوئی ایک بار کا تھا۔

کتنی بار وہ ماں کے ہمراہ آئی تھی۔ گھر دیکھا تھا۔ گھر کی پیشانی پر سچے نام کا جی بھر کر مذاق اڑا کر گئی تھی۔

جب آتی جی بھر کر تنگ کرتی۔ وہ اسے خونی نظر سے دیکھ کر رہ جاتا۔ اس کے نزدیک

تمام تر قصور وار وہی تھی۔

شرارت سے ہنسی۔ تب ایسا جھینپ گئیں۔

”ایسا! آپ کا دلہا تو واقعی دل والا ہے ورنہ تو ابھی تک ہم نے دلہاؤں کو انگوٹھیوں، گھڑیوں پر ٹرختاتے دیکھا ہے۔ میری ایسا کو کسی کی نظر نہ لگے۔“ اس نے بہن کا رخسار چوم لیا۔

ایسا بے طرح شرمار ہی تھیں۔ وہ ان سے علیحدہ ہوئی تو دیکھا شاہ عالم آئینے کے سامنے کھڑا برش بالوں میں پھیر رہا تھا۔

”ہیلو..... ناٹی گرل..... کیسی ہو.....؟“ وہ مسکرایا۔

”بہت اچھی مگر آپ سے زیادہ نہیں۔ آپ تو پھولے نہیں مار رہے۔“ وہ حسب عادت چٹاخ سے بولی۔

”کیوں نہیں تمھاری ایسا ہیں ہی ایسی چیز۔“

وہ وارفتہ نظروں سے ماہ رخ کو دیکھ کر بولا۔

وہ بری طرح شرما گئیں۔

وہ ایسا کو مسرور پا کر بہت خوش تھی۔

”ایسا! آپ کو خوش دیکھ کر شادی کی ساری تھکن اتر گئی ہے۔“

”اچھا! چل میں تیری شادی پر بدلہ اتار دوں گی۔“

وہ اسے محبت سے دیکھ کر بولیں۔



دن بہت مصروف گزر رہے تھے۔ یونیورسٹی میں اس قدر مصروف ہو گئی تھی کہ ایسا کے ہاں ہفتوں نہ جا پاتی۔ جب وہ آتیں ناراض ہو کر جاتیں۔ وہ انھیں فون پر منالیتی۔ اس کا پریولس ختم ہوا تو ایسا ڈیوری کے سلسلے میں میکے آ گئیں۔

وہ زمانے بھر کی منہ پھٹ شاہ عالم کے سامنے ہی بول پڑی۔

”ہائے! ایسا! آپ ابھی سے بھنس گئیں۔ سچی مجھے تو بہت افسوس ہو رہا ہے۔“

ایسا شٹا گئیں۔ شاہ عالم نے میگزین چہرے کے آگے کر لیا۔ اسی ہوں ہوں کر کے

رہ گئیں۔

”یہ ایم اے کر رہی ہے۔ عقل رتی بھر نہیں ہے۔ بھلا بہنوئی کے سامنے افسوس

کرنے کی کیا تک تھی۔ اللہ نے انھیں خوشی کا دن دکھایا ہے۔ تم بیٹھ گئیں غم منانے۔ وہ تو شکر کرو

پتا نہیں کس بہانے جوتا اس کے پاؤں سے غائب ہوا تھا۔ اب تمام پریاں اس کا گھیراؤ کیے ہوئے تھیں۔ کیمروں کی فلش، مرکری بلب کی چکا چوند، مودی کا ہنگامہ..... وہ بوکھلا سا گیا۔

”جوتے کا کرایہ دیجیے۔ ورنہ ایک پاؤں میں پہن کر جائیے۔“

وہ کس قدر شوخ ہو رہی تھی۔

”ہوں..... ویسے تو بہت بولتے ہیں..... آج..... ارے ابھی تو ایسا گھر نہیں

پہنچیں۔ ہنس بول لیجیے کہ

پھر کہاں یہ فرصتیں، پھر کہاں یہ رات دن

وہ کھلکھلائی۔

اور وہ ہجسم ہو کر رہ گیا۔ سیاہ ڈنر سوٹ اور سرخ گلابوں کے ہار میں کھویا کھویا۔ بے

پناہ اچھا لگ رہا تھا۔

ایسا کی سہیلیاں بہت خوش تھیں۔

”کیا کرایہ ہوگا پندرہ منٹ کا؟“ وہ مسکرایا۔

وہ پریوں کی ملکہ ادھر ادھر سوالیہ نظروں سے دیکھ کر بولی۔

”ڈیڑھ ہزار۔“

چیچھے سے کامران بولا۔

”گڑیا! یہ تم نے جوتے کا کرایہ بتایا ہے یا انیکسی کا؟“

ڈھیروں قہقہے گونج اٹھے۔

شاہ عالم نے کوٹ کی جیب سے پندرہ سرخ سرخ نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر

رکھے تو وہ ٹھوڑی پرائنگلی ٹکا کر حیران ہوئی۔

”اتنی آسانی سے دے دیے۔ ہمیں یہ توقع ہوتی تو دو ہزار مانگ لیتے۔“

پھر فرشی سلام جھاڑتی ہوئی اٹنے قدموں واپس ہوئی تو سب اس کی اس بے ساختہ ادا

پر ہنس دیے۔



ویسے کی جگہ کو اس نے آنکھیں پینچنا کرایا کو نیا نازک سا ڈائننگ کاسیٹ پہنے دیکھا

چلی جاتی۔ شاہ عالم کے ساتھ ہنسی مذاق کا وہی عالم تھا۔ وہ اس سے بہت کنتا تھا۔ بعض اوقات ایسا مع بچوں دشوہر کے فارغ بیٹھی ہوتیں۔ وہ پہنچ جاتی۔ اس روز ندا کو اس کے گھر سے لے کر آپنی کے ہاں چلی آئی تھی۔ شاہ عالم اس کے سلام کا جواب دے کر بچوں میں مصروف ہو گیا تھا۔

”ایسا! یہ ندا بھی کہہ رہی ہے آج کہ تمہاری اپنا کے گھر کا نام کیسا عجیب سا ہے۔“ شاہ خانہ ”بالکل ایسے لگتا ہے جیسے دواخانہ، شفاخانہ، مرغی خانہ۔“ پھر مسکراہٹ دبا کر آہستہ سے بولی ”زچہ خانہ“ وغیرہ۔“

ایسا نے ایک دھپ جمایا اور ہنس کر شاہ عالم کی طرف دیکھنے لگیں۔ ”میں نے ندا کو بتا دیا کہ اپنا کے میاں بڑے اٹلکچو کل قسم کے ہیں، کیوں غلط کہا میں نے؟“ اس نے چوری سے شاہ عالم کو دیکھ کر اپنا سے سوال کیا۔

”پتا نہیں، الٹی سیدھی باتیں کرنا تو تم پر فرض ہے۔“ وہ چائے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”اور آڑی ترچھی باتیں سنئیں۔ نفل بھی بتا دیں اپنا۔ آسمانی نماز تو مجھ سے ڈھنگ سے ادا نہیں ہوتیں یہ زبانی۔“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر مسکرانے لگی۔ ”تو بہ مائی! لڑکیاں کیا دیتی ہوں گی تم سے۔ ذرا بھی تو سو رہیں ہو۔“ وہ چھیڑتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

”ارے میرا رنگ تو آ کر دیکھیں کسی روز کالج میں۔“ وہ صوفے پر دراز ہو گئی۔

ندا شاہ عالم سے مخاطب ہوئی۔

”بہت کم بولتے ہیں آپ دلہا بھائی۔ اپنا کا تو رعب نہیں؟“

”اب یہ مانیں گے تھوڑا سی۔ واقعی اپنا ہی کا رعب ہے۔ شادی سے پہلے کا رنگ تو تم نے دیکھا نہیں ندا۔ اپنا نے زمین آسمان کا فرق کر دیا ہے۔“ وہ شاہ عالم کی سمت دیکھ کر گویا ہوئی۔ جواب میں شاہ عالم کی بے ساختہ انھنی نظریں مائی کے جسم میں سنسانہٹ پیدا کر گئیں۔ وہ فوراً گڑیا کی سمت متوجہ ہو گئی۔

ایسا نے ندا کی وجہ سے چائے پر بہت اہتمام کر لیا تھا۔

کہ وہ تمہارا مزاج سمجھتا ہے۔ دانتوں تلے داب کر رکھا کرو یہ گز بھر کی زبان۔“ شاہ عالم کے جاتے ہی امی نے اسے پھنکارا۔ وہ کھی کھی بنے گئی۔

”بد تمیز۔“ اپنا کی بھی بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔

مگر خوبصورت گڈا آتے ہی سارے سمسٹر، یونیورسٹی اور افسوس بھول گئی۔ جب اس نے انگلی بھر کے روتے ہوئے بھانجے کے منہ میں شہد رکھا تو بڑی تائی اماں، جو اپنا کی وجہ سے ان کے پاس تھیں، سر پیٹ کر بولیں۔

”ارے ہے، شہد کس نے چنایا۔ اس بچے پر اللہ اپنا رحم کرے۔ دیکھ لینا بالکل اپنی خالہ کی طرح ہوگا۔“

”ہمیشہ سراٹھا کر چلے گا۔ بڑے بڑوں کو گھاس نہیں ڈالے گا۔“ وہ اس کا رخسار چوم کر مسکرا دی۔

ایسا مسکرا دیں۔ ”پھر تو تم ہی پالنا، میرا جگر امی جتنا نہیں ہے۔“

”پال لوں گی۔ کسی بے درد ہیں۔ ذرا پروا نہیں بیٹے کی۔ ظاہر ہے اور آجائیں گے۔“ ”ہے بے غیرت۔“ تائی اماں باسکٹ میں سر ڈالے جانے کیا ٹٹول رہی تھیں۔ باسکٹ میں سر دیے دیے ہی بد بدائیں تو وہ گڈا اپنا کی بغل میں دے کھلکھلاتی باہر نکل گئی۔

”اے رنجی، ٹوکا کرو، پرانے گھر جائے گی۔ کیسے گزارہ ہوگا؟“

”سب عقلیں آ جاتی ہیں تائی اماں!“ وہ بولیں اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ انھیں شاہ عالم کا انتظار تھا۔



تین برس بعد جب وہ ایک مقامی کالج میں انگریزی پڑھا رہی تھی تو اپنا اپنے گڈے، گڑیا اور گھر میں بڑی طرح پھنس گئی تھیں۔ شاہ عالم کی مرضی کے مطابق خود کو سیٹ رکھے ہوئے تھیں۔ بھرے بھرے بدن پر آج بھی جتنے کپڑے پہنتیں۔ ویسی ہی خوش اخلاق، مسکراتی ہوئی۔

بے حد خوبصورت بچوں کے اور بچوں کے باپ کے خڑے اٹھاتے ہوئے مصروف مصروف سی اپنا اسے پہلے سے زیادہ دل کش نظر آتیں۔ زیادہ تر وہ خود ہی کالج سے اس کے ہاں

مسکرا رہی تھیں۔

”ہائیں۔“ وہ بوکھلا گئی تھی۔ وہ دونوں جھینپ گئے تھے۔

زور سے گڈو کے دھپ مارا۔ گڑیا کو فرش پر پٹا۔ گڑیا روئی تو اس نے اس کے رخسار پر طمانچہ رسید کر دیا۔ اپنا تڑپ کر بڑھیں۔

”ارے مائی! توبہ ہے۔ اتنے سے بچوں کو اس طرح مارا کرتے ہیں؟“

اپنا نے گڑیا کو گود میں بھر کر شاہ عالم کی طرف دیکھا اور مائی کو لٹاڑا۔ مبادا اپنے بچوں کی اس درگت پر برا نہ مان گیا ہو۔

”یہ گڑیا ہاتھ روم میں ٹب میں ڈوب رہی تھی اور یہ گڈو۔“

وہ گڈو کو مارنے کو لپکی۔ اپنا نے گڈو کو اپنے پیچھے کر دیا۔

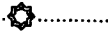
”گڑیا کے منہ میں تو تھ پیٹ کی ٹیوب ڈالے مسلسل دبا رہے تھے۔ ابھی پوچھتی ہوں تمہیں۔“ وہ گڈو کو گھور کر بولی۔

”ارے اپنا! انھیں مارا کریں۔ بگڑ جائیں گے ورنہ۔“

مخاطب وہ اپنا سے تھی مگر توجہ شاہ عالم کی طرف تھی۔ گڑیا ماں کی گود سے چپکی سسکیاں بھر رہی تھی۔

”توبہ کیا ظلم توڑا ہے میری بیٹی پر۔ تمہارے بھی دن قریب ہیں۔ دیکھو گی کتنا مارا کرو گی اپنے بچوں کو۔“

وہ گڑیا کا رخسار چوم کر شاہ عالم کی طرف پلٹ گئیں۔



کامران باہر تھا۔ مائی کی شادی کی وجہ سے اس کا گھر میں شدت سے انتظار ہو رہا تھا۔ انہی دنوں شاہ عالم کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ہارٹ ایکٹ کا عارضہ تھا انھیں۔ تب شاہ عالم لندن چلا گیا۔ وہاں بزنس دیکھنا تھا۔ شادی کو چوتھا سال تھا۔

شادی کے دن نزدیک ہونے کی وجہ سے مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ شام کو اسے خبر ملی کی اپنا ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں۔ دونوں ماں بیٹیاں پاپا کے ہمراہ روتی دھوتی پہنچ گئیں۔ پتا چلا کہ وہ لاف دھلوا کر تیار کر کے اوپر بکس میں رکھنے جا رہی تھیں کہ وہ دوسری منزل کے زینے سے سلب ہو گئیں۔ ابارشن الگ ہوا جان پر علیحدہ بنی ہوئی تھی۔ تین چار ماہ بعد ان کے ہاں ایک فرد کا

آج تائی اماں بری طرح اس کی شامت بلا گئی تھیں۔ بہت اچھا رشتہ لے کر آئی تھیں مگر اس نے حسب سابق انکار کر دیا تھا کہ اسے شادی ہی نہیں کرنا۔

آج ہی سارا گھر اس کے پیچھے پڑا تھا۔ امی نے صاف کہہ دیا کہ وہ ہاں کر رہی ہیں۔ بعد میں ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ۔

اور واقعی انھوں نے ہاں کر دی۔

اس نے سر پٹک پٹک کر دی۔

مگر اس بار اس کی نہیں چلی۔

”غضب خدا کا، عمر نکل گئی تو کون پوچھے گا۔ اسے تو آگے کی الجھنوں کا احساس نہیں ہے۔ زندگی خالی ہر وقت کا ہنسی کھیل نہیں ہے۔“

امی اس مرتبہ سخت برہم تھیں۔ ظاہر ہے سب ہی ان کو کہہ رہے تھے۔

اس کی ہونے والی ساس اور نندیں خاموشی سے اس کی انگلی میں احسان علی کے نام کی انگٹھی پہنا گئیں۔ اس کا پارہ سوانیزے پر رہنے لگا۔ اس نے باقاعدہ رونے کے لیے کالج سے ہفتے بھر کی چھٹی لے لی۔ کالج کے قیمتی گل دان توڑ ڈالے۔ پیر شیخ کرناٹوں میں درد کر لیا۔

امی کا اٹل فیصلہ تھا ”وجہ بتاؤ.....!“

”کوئی وجہ نہیں ہے۔ خدا کی قسم کوئی وجہ نہیں ہے۔ مجھ سے نہیں ہوگی کسی مرد کی غلامی۔ بس.....“ وہ گڑ گرائی۔

”اے ہاں تم سیدی آسمانوں سے اتری ہونا۔ مرد کی غلامی، بے وقوف.....!“ اس کی عقل پر تو سدا سے شبہ تھا انھیں۔ اب پختہ یقین ہو گیا تھا۔

جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ ہر وقت جھنجھلائی جھنجھلائی رہنے لگی۔

”ہونہ! شادی کے بعد بالکل سیدی ہو جائے گی۔“ وہ سوچا کرتیں۔

اپنا دور روز سے آئی ہوئی تھیں۔ شاہ عالم بھی تین بجے کے قریب وہیں آ جاتے ہیں۔

”میرے بس کے نہیں ہیں یہ آپ کے یا جوج ماجوج۔“

وہ بے ڈھنگے پن سے گڑیا کو پہلو پر نکائے گڈو کو گھسیٹتے ہوئے اندر داخل ہوئی مگر شیشا کر رہ گئی۔

شاہ عالم بیڈ پر دراز تھا۔ اپنا اس کی قیص کے بنوں سے کھیلتی ہوئی بڑی دلکشی سے

مزید اضافہ ہونے والا تھا۔ اس مرتبہ واقعی اسے بہت کوفت ہوئی تھی۔

”تو بے ایسا! آپ نے تو پڑھ لکھ کر ڈبو دیا۔ آپ تو مسلسل ترقی پر ہیں۔“

”میں کیا کروں ماہی! شاہ عالم کو بچوں کا بہت شوق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے گھر میں شور، بچوں کی رونق بہت اچھی لگتی ہے۔“

”آپ کا تو ہو رہا ہے ناستیاناس۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”اتنا تو آرام دیا ہوا ہے۔ کتنے ملازم رکھ چھوڑے ہیں۔ کتنا خیال کرتے ہیں میرا۔“

”بس آگئیں عورتوں والی روش پر، وہ یوں ہیں، وہ یہ ہیں۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”تمہیں دیکھیں گے۔“ وہ مسکرائی تھیں۔

وہ اور امی ماہ رخ کی حالت پر ویسے ہی غڈ حال تھیں۔ اس پر بچوں کا ردنا پیشنا۔

شاہ عالم بھی موجود نہیں تھا۔

امی ہاسپٹل میں رہ گئی تھیں۔ وہ بچوں کے ساتھ پاپا کے ہمراہ گھر آ گئی تھی۔

بچے تو ویسے ہی اس سے مانوس تھے۔ زیادہ پرالہم نہ ہوئی۔

پاپا کا کمرہ اوپر تھا۔ اس لیے فون کی گھنٹی پر اس کی ہی آنکھ فوراً کھلی۔

دوسری طرف امی تھیں مگر وہ کچھ نہ کہہ پا رہی تھیں۔ سوائے سسکیوں کے تب شاید

نرس نے ان کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔

جو کچھ اس نے سنا اس کے حواس گم کر دینے کو کافی تھا۔

وہ گڑیا اور گڈو کو سینے سے لگا کر روئی تڑپ تڑپ کر۔ وہ دونوں اس سے زیادہ چیخ کر

رونے لگے۔

گھر کی پرانی ملازمہ جاگ کر پاپا کو جگا آئی۔

وہ پاپا کے سینے سے لگ کر روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔

یہ لمحے جس پر گزریں وہی جانے۔ جان سے عزیز لوگ یکایک نظروں سے اوجھل ہو

جائیں تو دل سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ پاپا نے شاہ عالم کو فون کر دیا تو وہ اگلے ہی روز موجود تھا۔ بے

حس سپاٹ چہرے کے ہمراہ۔

وہ اسی طرح چیخیں مار مار کر روئی تھی جب ایسا مکان ابدی کی طرف روانہ ہوئیں کہ

جن کی آنکھیں بھیگی تھیں وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے جو رو رہے تھے، تڑپ تڑپ اٹھے۔

ایسا سا خنہ تھا کہ مبینوں دل کو قرار نہ آیا۔ لب مسکرانا بھول گئے۔ باپ کے بڑس کی وجہ سے شاہ عالم کو مبینے پندرہ دن میں لندن جانا پڑ رہا تھا۔ وہ کسی اچھے ناظم کی تلاش میں تھا۔ بچے نانی نانا کے پاس تھے۔ شاہ عالم کی بہن نے اپنے ساتھ لے جانا چاہا مگر ان لوگوں نے منع کر دیا۔ انھوں نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا کہ بچے یہاں بہت مانوس تھے۔

جب بھی شاہ عالم آتا بچوں کو ساتھ ”شاہ خانہ“ لے جاتا مگر وہ اس کی جان کو آجاتے۔ گڑیا کی دفعہ میں اس نے ایک ادھیڑ عمر کچین آیا کا انتظام کر دیا تھا۔ مگر بچے مشرقی گودوں کے عادی اور سر چڑھے تھے۔ سوتے وہ خالہ کے پاس ہی تھے۔



وہ خود داری سر اٹھا کر چلنے والی لڑکی۔ جانے کون سے بڑے بول کا نتیجہ سامنے آیا تھا اس کے کہ احسان علی نے جی بھر کے انسلٹ کی تھی۔

والدہ محترمہ تو جھجک کر جھینپ کر کہہ رہی تھیں کہ اس نے وہاں کی شہریت حاصل کرنے کے لیے شادی کی ہے مگر نہ اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ مجبوراً کی ہے۔ ساری زندگی میرے بچے نے محنت مشقت کر کے یہ دن دیکھے۔ وہ وہیں رہنا چاہتا ہے۔ جب کہ ملازمت عارضی تھی۔ ابھی ایک دھکا دل پر لگا تھا اور یہ تقدیر کا طمانچہ منہ پر۔ مگر وہ بھی ایک ہی تھی۔ ماں کو سنا ہی گئی۔

”بس امی آپ لوگ امریکا کا نام سن کر اتنے جذباتی ہو جاتے ہیں۔ بس نہیں چلتا فوراً پھینک ماریں ان کے در پر۔“

امی جن کا کوئی قصور نہ تھا بہت شرمندہ سی تھیں مگر اس کی روئین میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایک روز وہ ٹیرس پر کھڑی تھی جانے کیوں آنکھیں بھر آئیں۔ سامنے کمرے میں شاہ عالم کا دل پانی ہو گیا۔ اسے اپنی بددعا یاد آ گئی۔ کوئی اس لا اُبابی لڑکی کے متعلق قیاس نہ کر سکتا تھا۔

کہاں گئیں اس گھر کی رونقیں۔

سات سال کا سمندر ہے تم کناروں پر میں جزیروں میں۔ تقدیر کا اس قدر قائل ہو گیا ہوں کہ وقت کے دھارے پر خود کو چھوڑ بیٹھا ہوں۔ کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ نیچے چلا آیا۔ کچھ بھی تو نہیں رہا۔ دل ہے کہ مفلس کا گھر۔

میں جتنی اپنی انا کے معاملے میں حساس تھی، تذلیل اتنا ہی میرا مقدر بنی ہے۔ تم میری انسلٹ کرنے والے پہلے مرد تھے اور احسان علی دوسرا۔ اسی لیے میرے دل کا گوشہ تمہارے لیے نرم نہیں۔ مجھے کراہت آتی ہے مردوں سے۔ وہ زمانے بھر کی کڑواہٹ اپنے ذہن میں سمو کر خود سے گویا تھی۔

تین بجے پہرہ کا عالم۔ مالی چارپائی پر لیٹا ریڈیو سن رہا تھا۔ باقی سارے گھر میں ہو کا عالم تھا۔ وہ ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزری تو گورنرس این بڑے فرائے سے خزانے نشر کر رہی تھی۔ تھل تھل کرتا بدن صوفے پر ظلم توڑتا نظر آ رہا تھا۔ وہ پل بھر کو نکھر کر رہ گئی۔ پھر دبے پاؤں بچوں کے کمرے میں آئی۔ بغیر فراک کے گڑیا کرسی پر سو رہی تھی۔ بایاں رخسار دھک رہا

بچوں نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔
 ”پاپا! آج ہم خالہ جانی کے ساتھ کون کھانے جائیں گے۔“ گندو نے بہانہ بتایا۔
 ”بیٹا ہم کھلا دیں گے کون۔“
 ”ہمارا دل نہیں لگتا وہاں، بس آپ جھوٹ بولتے رہتے ہیں، امی لندن سے آنے والی ہیں۔ ابھی تک تو آئی نہیں۔ امی کو ایئر پورٹ سے لے کر یہاں آئیے گا، پھر سب چلیں گے۔“
 ”بیٹے! پاپا کو تنگ نہیں کرتے۔“
 ”ہم کو چلے جانا ہے۔ پھر آ جائیے گانانی کے پاس۔“
 ”پاپا! آپ بھی یہیں رہ جائیں نا۔“
 ”بیٹے! باری باری دونوں گھروں میں رہیں گے۔“
 ”گڑیا! چک کر اس کی گود میں چڑھ گئی“ ہم نہیں جاتے۔“
 ماہی نے انھیں چکارا مگر وہ نہ مانے۔
 ”آپ کیوں جاتے ہیں، یہیں رہ جائیں نا۔“ اس نے شاہ عالم سے کہا۔
 ”میرا گھر ہے، کچھ لمحے وہاں گزارنے کو بہت جی چاہتا ہے۔“ وہ پلٹ گیا۔

تب انھوں نے اس کا سر سینے سے لگا کر ماتھا چوم لیا۔
 ”بیٹے! اس دنیا میں بہت سی ناممکن باتیں بھی ممکن ہو جاتی ہیں۔ ہم نے اس لحاظ سے کہا کہ تمہاری عمروں میں بھی زیادہ فرق نہیں ہے۔ بے حد شریف پرکھا بھالا ہے۔ سوچا تھا بچہ بھی محفوظ ہو جائیں گے۔ تم ان پر جان چھڑکتی ہو اور وہ تمہارے دیوانے ہیں۔“

تھا۔ چہرے پر آنسوؤں کے نشان تھے۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس نے گڑیا کو آہستگی سے اٹھا کر بیڈ پر لٹایا۔ اچانک ہاتھ روم کا تل کھلنے کی آواز آئی۔ وہ فوراً لپکی۔ گڈومیاں آئینے کے سامنے کھڑے شاہ عالم کے ریزر سے اپنا گال کھسٹ رہے تھے۔ اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ گڈو سے ریزر چھین کر اسے نہانے کے لیے کہہ کر تیز تیز چلتی آیا کے سر پر پہنچ گئی۔

”میڈم این۔ آر یوسلپنگ.....؟“

گورنس خرخر کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”نو..... نو.....“

”نو..... وہاٹ نو.....؟ دین واز آئی سلپنگ؟“

”وہاٹ یو ڈو..... بے بی از ڈرٹی..... بابا..... ویٹ ناٹی بابا واز میکنگ اے شیو۔ اینڈ ہرڈر لیس از فیئر میڈم این..... بے بیز آر کیئر لیس بٹ یو؟“ مارے طیش کے وہ بری طرح برس پڑی۔

اپنا کے پھول سے بچوں کا اتنا برا حال دیکھ کر وہ تڑپ اٹھی۔ ”میڈم این! ناکندریو آر ہوئیٹ و دیورڈیوٹی نور یو آر ایکٹو۔ سو آئی ڈس مس۔“ وہ تھرا کر بولی۔

”سوری مس! آئی ایم ویری سوری، ریلی۔“

دل میں چور تھا اس لیے جھینپ کر سوری کر رہی تھی۔

”ازاٹ لاسٹ سوری؟“ وہ برہمی سے پوچھ رہی تھی۔

”لیس مس۔“ وہ گڑبڑا کر بولی۔

”آل رائٹ۔“

”تھینک یوس اوہ گاڈ۔“ وہ سینے پر صلیب کا نشان بنانے لگی۔

وہ پلٹی تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ سوئی سوئی آنکھوں کے ساتھ سامنے شاہ عالم کھڑا تھا۔ وہ

اس کے چیخنے پر ساتھ کے بیڈ روم سے آ گیا تھا۔

”میرے بچوں کے ساتھ ہمدردی کا بے حد شکریہ اور آپ جو گورنس کو ڈس مس کرنے

لگی تھیں۔ دوسری گورنس کے ملنے تک میں ان بچوں کا کیا کرتا؟“

”ہمارے ہاں چھوڑ دیتے۔“ وہ رکھائی سے بولی۔

”گویا آپ ساری زندگی اپنا احسان مندر کھنا چاہتی ہیں۔“

”اس میں احسان کیا ہوا؟“

”ویسے ہی انھوں نے مجھے دن رات تنگ کر رکھا ہے۔ آپ کے پاس جانے کی ضد کرتے رہتے ہیں۔ خوب بگاڑ دیا ہے آپ نے۔ ان کے اسکول کے پرابلم۔ پھر مجھے بھی فرصت نہیں ہوتی۔“

آج شاہ عالم کا لہجہ بالکل اچھی تھا۔

”آیا نے کس بری طرح گڑیا کو مارا ہے پتہ ہے؟“ وہ غیض سے بولی۔

”اسے میں نے مارا ہے، آیا نے نہیں۔“

”اوہ میرے خدا اتنی سے بچی پر اتنا بھرپور ہاتھ؟“ وہ اس کے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔

”مگر کیوں؟“

”ایک تو ویسے ہی گھر میں آتے ہوئے ذہن شل ہو جاتا ہے اس پر ان کی ضدیں۔“

”کتنے بے درد ہیں آپ؟“

”تھک گیا ہوں۔“

”بچوں کو میں لے جاؤں؟“

”نہیں.....“

”کیوں؟“

”میرا بھگتان ہیں بھگت لوں گا۔“

”شام کو چھوڑ جاؤں گی۔“

”شکریہ۔ انھیں میرا عادی بننے دیں۔“

”صرف آج۔“

”جی نہیں، جب تک وہ آپ لوگوں کو ذہن سے بھلا نہیں دیتے، اس وقت تک سوری۔“

وہ باہر نکل گیا تو وہ بچوں کے کمرے میں چلی آئی۔

گورنس نے انھیں نہلا دھلا کر تیار کر دیا تھا۔

”خالہ جانی! آج میں نے بھی پپا کی طرح شیو کی۔ میرے گالوں پر بال آگئے تھے

نا۔“ وہ اسے سمجھاتا ہوا بولا۔

”ہاں میرے بیٹے! تم جوان ہو گئے ہو اب۔“

وہ ہنس پڑی مگر بھیجھی بجھی سی۔

چونچال نظر آ رہا تھا۔

آہ۔ مرد کا دل کتنا بھلکھو ہوتا ہے۔ مجھے رفق برابر خوشی نہیں اور شاہ عالم کا وہی انداز جو پہلی مرتبہ مالی کو ڈانٹتے ہوئے دیکھنے میں آیا تھا۔
ہونہہ! تم مردوں نے عورت کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ اس نے کروٹ بدل کر کوفت بھرے انداز میں سوچا۔



وہ صبح دیر تک پڑی سوئی رہی۔ شاہ نے میڈم این کو غالباً اسے جگانے بھیجا تھا۔ ”آر یو اوانگ مسز شاہ؟“

”نہیں.....!“ وہ غنودگی میں بولی۔

”دین۔ گیٹ اپ مسز شاہ۔“ وہ کھڑکیوں کے پردے سرکا کر بولی۔

”اوکے۔“ وہ بالوں کو سنوارتی اٹھ بیٹھی۔

”مسز شاہ.....؟“ اس نے جاتی این کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہی ازان دی لائبریری، مسز شاہ!“ (وہ لائبریری میں ہیں)

”میڈم این! ڈویو نوٹ نوارو؟“

”نوسمز شاہ۔ ریٹلی۔“

”میرا تو بالکل منہ میڑھا ہوا ہے گا بڑی بی کے ساتھ۔“ وہ سیلپر پاؤں میں اٹس کر ہاتھ روم کا رخ کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ برش کرتے ہوئے اس کی نظر آئینے کے کارنر پر پڑی۔ اپنا کی سونے کی نازک سی زنجیر پڑی تھی۔ اسے ہاتھ بڑھا کر اٹھالی پھر کچھ موج کراپنے گلے میں ڈال لی۔ ایک اکلوتا آنسو اس کے دائیں رخسار پر ٹھہر گیا۔
وہ میرون ساڑھی میں کچن میں چلی آئی۔ خانسا مان تو ویسے بھی اس کا عادی تھا۔
سلام کر کے بولا۔

”ناشتا لگاؤں؟“

”ارے نہیں، کیا ناشتا۔ ایک انڈا فرائی کر دو اور دو سلاکس رکھ دو اس میز پر۔ یہیں کر لوں گی ناشتا۔“

”وہ جی صاحب نے بھی ناشتا نہیں کیا۔ وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”بیٹا! آپ لوگ پیا کو تنگ نہ کیا کریں۔ ورنہ وہ باقاعدہ مارا کریں گے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے ابھی۔“

”ہیں خالہ جانی۔“ گلد و خنزہ ہو گیا۔

”ہاں بیٹا۔“

”پرسوں انھوں نے مجھے مارا تھا۔ آج گڑیا کو، خالہ جانی! ہمیں پیا سے ڈر لگتا ہے۔“

گلد و کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اس کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔

”بیٹے! آپ شرارت نہ کیا کریں نا۔“ وہ اسے سینے سے لپٹا کر بولی۔ اس کی خودی

آنکھیں بھیگ گئیں۔



کامران جنم جنم کا دیوانہ شاہ عالم کا۔ آج ماہی کے پاس اسے سمجھانے بیٹھا تھا۔
شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں مگر وہ ماہی کی طرف سے بھی مطمئن ہونا چاہتا تھا۔

”دیکھو ماہی! وہ کوئی ایجنڈ تو نہیں ہے، بہت شان دار آدمی ہے۔ تمہیں زمانے کی فکر

ہوگی کہ لوگ یوں کہیں گے۔ لوگ تو کہتے رہتے ہیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اتنے اچھے لوگ بہت کم

ہوتے ہیں۔ یہ نہ سوچنا کہ وہ میرا دوست ہے تو تم میری بہت پیاری لاڈلی بہن ہو۔ ہم میں سے

کوئی تمہارا برابر نہیں چاہتا، تم بچی نہیں ہو۔ اٹھائیس آئیس برس کی باشعور لڑکی ہو اور پھر گلد و اور گڑیا۔

”شاید تمہیں شاہ کے پہلے رشتے کی جھجک ہو تو گڑیا! ہم لوگ نئی رشتے داری نہیں

جوڑ رہے بلکہ ہماری بہت سی مصلحتیں ہیں، دیکھو۔“

”کامی بھائی! میں کب انکار کر رہی ہوں۔ وہ بچے مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز

ہیں۔ ان کے معصوم شکوے، ان کی موٹی باتیں، ان کی تنہائی خدا کی قسم مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔

وہ گورنس سویتلی ماں سے بھی بڑی ہے۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

کامران اس کی پشت تھپتھا کر باہر نکل گیا۔



اور آج سات سال پرانے انداز میں شاہ عالم کو دیکھ کر وہ متحیر سی تھی۔ کس قدر

اس کا جی چاہا کہ ناشتا ہی نہ کرے مگر خانہ ماں سے بولی۔

”اچھا پھر وہاں ٹیبل پر لگا دو اور صاحب کو بلا لاؤ۔“

وہ ناشتے کی میز پر پہنچی تو شاہ عالم نے اپنی جیتی جاگتی آرزو کو مجسم دیکھا اور سیر سا ہو گیا۔ گیلیے کھلے بالوں میں فل آستین کے بلاؤز اور میرون ساڑھی میں وہ محض ایک طالبہ

سی کالج دیونیورسٹی کی نظر آ رہی تھی۔

”کیوں بھی، اچھی طرح تو سوئیں نا؟“

”بہت اچھی طرح۔“

”دیکھو بھی یہاں کی ہر چیز پر تمہارا مکمل اختیار ہے۔ خوش رہو کیونکہ کسی کو خوشی دینا تو

تمہیں آج تک آیا نہیں۔ کم از کم خوش ہی رہو۔“

اور سنو، اب یہ ڈرامے بازی نہیں چلے گی۔ آج سے تم اور میں ایک بیڈ روم میں

ہوں گے۔ بہت تنگ کیا ہے تم نے رات۔“

وہ مارے طیش کے کانپ کر رہ گئی۔

پچھلے رشتے بھلا نا اس قدر آسان ہے جیسے اس سے میرا سابقہ کوئی تعلق نہ تھا۔ تھوڑا

سالماظ، کچھ حجاب۔

”میں نے محض بچوں کی خاطر یہ سب کچھ کیا۔ ورنہ آپ سے تو کیا مجھے ساری دنیا

کے مردوں سے نفرت ہے۔“

”بہت لڑکیاں بولتی ہیں یہ ڈائلاگ۔“ وہ مسکرایا۔

”شاہ صاحب! میں بہت فرائخ دل ہوں مگر اپنی انسلٹ کبھی نہیں بھول سکتی۔“

ارے بھی، کیا انسلٹ کر دی میں نے تمہاری، اغوا کر کے تو نہیں لایا۔ باقاعدہ نکاح

ہوا ہے۔ تمہارے دستخط میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں بھی۔“

”شاہ صاحب! یہ مذاق نہیں ہے۔ آپ مجھ سے بطور شوہر کبھی بے تکلف ہونے کی

کوشش نہ کیجیے گا، ورنہ۔“ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

کامران اور دونوں بچے ہنستے ہوئے وہیں آ گئے۔

”خالہ جانی!“

”ارے گڈو! امی کہا کرو۔“ آج اسے کامران نے ٹوکا۔ اس نے بھائی کی سمت اتنی

گہری نظروں سے دیکھا کہ کامران گڑبڑا سا گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

”ہاں بھی امی کہلو انا ورنہ بعد میں بڑی پراہم ہو جائے گی کیوں شاہ.....؟“

”مرضی ہے ان کی۔“ اس نے قصہ ختم کر دیا۔



شادی کے چوتھے روز وہ شاہ کے ہمراہ اس کے دوست کے ہاں ڈنر پر جا رہی تھی۔

ڈارک براؤن کا مدانی کی ساڑھی باندھے، بالوں کا سادہ سا جوڑا بنائے، اپنا کامنہ دکھائی

والا سیٹ جان بوجھ کر پہن کر وہ اس کے سامنے آئی تھی۔ جانے وہ اسے کیا یاد دلانا چاہ رہی تھی۔

مگر شاہ نے سات سال پہلے والے انداز میں اسے دیکھا۔

کہاں وہ ماہی کہاں یہ سوہری گریس فل ماہی۔ وہ اس کے برابر بیٹھی تھی۔ شاہ نے

بہک کر گاڑی کو روانی سے چھوڑ دیا۔ آج اس کے پاس رولس رانس بھی تھی مگر وہ ماہی جانے

کہاں کھو گئی تھی۔ رولس رانس کی دیوانی۔

”اب اتنا تو نہ ترساؤ ماہی بیگم!“ وہ ایک نگاہ وارفتہ پھینک کر بولا۔ ”بس ختم کرو یہ

سزا ورنہ اپنا راستہ الگ ہی رکھو تو، مگر نہیں۔“

وہ جیسے تپ کر رک گیا۔ ”ماہی! مجھے کچھ کہنے کا حوصلہ دو۔ ماہی! میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”شاہ صاحب!“ وہ اپنی انگوٹھیوں سے کھیلتی ہوئی بولی۔ وہ چپ رہا۔

”شاہ صاحب!“ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

”جب تم شاہ صاحب کہتی ہو تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی مرشد بابریم سے

مخاطب ہو، مگر اس کے بعد کا طرز تخاطب، گویا مرشدوں کے حقے لوٹے دھونے والوں سے

بھی گیا گزرا ہوں۔“

وہ تیزی سے موڑ کاٹ کر بولا تو اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اتنے دن کی رفاقت میں

پہلی مرتبہ۔ اس نے کھڑکی کی سمت رخ موڑ لیا مگر شاہ دیکھ چکا تھا۔

”ہاں! کیا کہہ رہی تھیں؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ بدستور باہر دیکھ رہی تھی۔

”اور ایک بات تم سے کہنا ہے ماہ رو۔“

وہ سر جھکائے ہمہ تن گوش تھی۔

کالج تو اس نے چھوڑ دیا تھا خود بخود۔ بس گھر اور بچوں میں مصروف ہو کر رہ گئی۔ پانچوں وقت کی نماز باقاعدہ پڑھنے لگی تھی۔ گھر آئینہ شمال بن گیا تھا۔ بچے ہمہ وقت پھولوں کی طرح نکھرے نکھرے نظر آنے لگے تھے۔

شاہ کی وارڈ روب میں کپڑے فل میچنگ سے تیار رہتے۔ شوریہ میں جوتے تیار بچے ہوتے۔ شاہ بہت قد روان تھا۔ امی، پاپا، کامران مطمئن۔

مگر وہ اس قدر خاموش، اتنی اداس رہتی گویا اب رو پڑے گی۔ اس کے اس روپ کا تو وہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

”رات کو میرے لیے کافی لانا، مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔“ شاہ بچوں کے کمرے میں آ کر اسے کہہ گیا تھا۔

وہ اب کافی کا سامان سجائے اس کے کمرے میں موجود تھی۔ بلیو پلین ساڑھی میں بالکل سادہ، بانیں رخسار پر سجا تل اس کا قدرتی سنگھار تھا۔ بال کھلے ہوئے پشت پر لہرا رہے تھے۔ اس کے بال زیادہ تر کھلے رہتے تھے۔

اس نے کافی بنائی اور پیالی تپائی پر رکھ دی۔
”تم نہیں لوگی؟“
”نہیں۔“

وہ ضروری بات کے انتظار میں تیار بیٹھی تھی۔ شاہ کافی ختم کر کے ہاتھ روم چلا گیا۔ یہ کہہ کر برش کر کے ابھی آیا۔

واپس آیا تو ٹائٹ سوٹ میں تھا۔ اسے الجھن ہونے لگی۔

شاہ دروازے کی سمت بڑھا اور دروازہ لاک کر دیا۔ وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔

”ارے اس طرح تو نہ گھبراؤ، میں کوئی دن نہیں تمہارا شوہر ہوں۔“
”یہ آپ نے دروازہ کیوں لاک کر دیا؟“ وہ برہمی سے گویا ہوئی۔
”بچوں کے ڈر سے کہیں تمہیں پوچھتے ہوئے یہاں نہ آ جائیں۔“
”وہ سور ہے ہیں۔“

”یہ تو اور اچھا ہے۔“ وہ مسکرایا ”پھر.....؟“

”تم این پر زیادہ سختی نہ کیا کرو۔ ابا جی اسے لندن سے لائے تھے جب گڑیا سال بھر کی تھی۔ یہ تو تمہیں پتا ہی ہے بیوہ عورت ہے، بے حد ایمان دار۔ ابا جی کے پاس چھ برس سے تھی بطور منتظم۔ ہمارا وطن، ہم لوگ اس کے لیے اجنبی ہیں۔ ہمیں اس کی غلطیاں معاف کر دینی چاہئیں۔ اس کے ساتھ گھر کے فرد کا سا سلوک کرو۔ بہت وفادار ثابت ہوگی وہ تمہاری۔ وہ سختی کو اپنی انسلٹ تصور کرتی ہے۔ ہم اسے میڈم بلاتے ہیں۔“

”نو کروں کو دیکھنا تو پڑتا ہی ہے۔ وہ تو ملازمہ ہے، یہاں تو مالکوں کو روز ہی انسلٹ برداشت کرنا پڑتی ہے۔“

اس کے لہجے میں زمانے بھر کی سرد مہری سما گئی تھی۔ ایسا جگر کا ٹالہ کہ شاہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”میں سمجھا نہیں۔“

”میں سمجھا نہیں سکتی۔“

شاہ چپ ہو گیا۔

ڈنر بہت شان دار تھا اور بھی جوڑے مدعو تھے۔ ماہ رونے کی سرگوشیاں سنیں جو عورتوں نے کی تھیں۔

”یہ تو کنواری تھی، اس کی بڑی بہن تھی پہلے شاہ کے ہاں۔ بے چاری جوانی میں ہی دنیا چھوڑ گئی۔ آہ۔“

”شاہ کے تو مزے آگئے بھئی۔ قسمت اچھی ہے۔ سالی ابھی تک بیٹھی تھی۔“

”اے شاہ کون سا کم ہے۔ تم ہی کہو لگتا ہے دو بچوں کا باپ؟“ کسی خاتون نے

رائے لی۔

”سچی زمانے کے سرد گرم تو شاہ کو چھو کر بھی نہیں گزرے۔“

”مگر وہ کچھ خوش نہیں لگتی۔ او بھلا کیا کی ہے شاہ میں۔ خوبصورت، اسماٹ، محفلوں

کی جان، دولت مند، کیا ہوا جو دو بچے ہیں۔ بچے بھی اسی کی بہن کے ہیں۔“

وہ سر تھام کے بیٹھ گئی۔ بس ان خواتین کو موضوع ملنا چاہیے۔ واپسی میں شاہ نے محسوس

کیا کہ وہ بہت گم صم ہے۔ وہ اسے چھیڑنے کا ارادہ ترک کر کے خاموشی سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔

وہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”موڈ ٹھیک کرو اپنا۔“
 ”وہ کیا ضروری بات تھی؟“ وہ بہت ضبط سے پوچھنے لگی۔
 ”کہ اب مجھے تنگ نہ کرو۔“

”جی.....؟“

”دیکھو تم کوئی بچی نہیں ہو، بس اب زیادہ نہ ستاؤ۔“

”میں آپ پر تمام امور واضح کر چکی ہوں کہ.....“

”بکواس کرتی ہو تم۔“ وہ اتنی زور سے گر جا کہ وہ سہم سی گئی۔ پھر سخت حیران ہوئی۔
 شاہ جنونی انداز میں اٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا بیڈ تک لایا اور زور سے

اسے دھکیلا۔

”تم اتنی زور آور ہو کہ میری تقدیر کے رخ موڑ دو؟ مگر میں تمہیں اب خود سے کھیلنے کی اجازت نہیں دوں گا۔“

وہ دوسری سمت کھسک گئی۔

”ہوش تو ٹھکانے ہیں آپ کے یا آپ نے مجھے ذلیل کرنے کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔“
 مجھے جانے دیں۔ مجھے آپ کی ذہنی حالت پر شبہ ہو رہا ہے۔“ وہ نفرت سے اسے دیکھ کر بولی۔
 مجھے آپ جیسے مردوں سے نفرت ہے۔ کبھی یہی ڈرامہ آپ نے میری بہن کے ساتھ کیا تھا۔
 آج مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں۔“

”ہر بات کی ذمہ دار تم ہو۔ میں اولین روز سے تمہارا طلب گار تھا۔ یہ تقدیر کا مذاق تھا کہ ماہ رخ میری ہو گئی۔“ وہ سنسبھل کر بولا۔

”جب میں نے سنا کہ ماہ رخ کا رشتہ طے ہو رہا ہے تب میں نے بجو کو تمہارے لیے بھیجا۔ ہاں میں نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں تمہارے عشق میں مبتلا ہوں۔ مجھے ڈر تھا کہ تم ضد میں الٹ کام کرنے کی عادی ہو۔ کہیں انکار نہ کر دو۔ یہ میری عورت کے ہاتھوں بہت بڑی توہین ہوتی ماہ رو بیگم کہ تم سے زیادہ آن ہے میرے مزاج میں۔ میں چاہتا تھا بجو اپنے طور پر بات کریں۔ بس یہ میری غلطی تھی۔ مجھے واقعی اپنی بہن کو شریک راز کر لینا چاہیے تھا۔ بس میری نیت تھی کہ سب کو یہ کام یہ رشتہ اتفاقہ لگے اور میں عاشقی کا اعتراف تمہیں بیوی بنانے کے بعد کروں۔ جانے کیوں مجھے بھرم بہت عزیز ہے۔ آج میں نے تمہارے سامنے حرف حرف حقیقت بتایا ہے۔ اب تو میری سزائیں تخفیف کر ڈالو۔“

وہ بیڈ سے نیچے لٹکتا اس کی ساڑھی کا آئینل اٹھا کر اس پر ڈالتا ہوا بولا اور اس کا ادھر سانس اٹک کر رہ گیا تھا۔ گویا وہ صحیح سمجھی تھی۔ درست سمجھی تھی۔
 وہ رخ موڑتے ہوئے بولی۔

”آپ کیا سمجھتے ہیں۔ میں آپ کے جذباتوں سے بے خبر تھی؟ آپ کے رشتہ مانگنے پر میں نے زمین میں زندہ دفن ہونا چاہا تھا۔ میں نے اسے آپ کا کوئی انتقام، کوئی مذاق جان لیا تھا۔ اتنی بڑی توہین ماہ رو کی کسی نے پہلی بار کی تھی۔ کس طرح جھیلی ہوں، خبر نہیں۔ مگر شاہ صاحب میرے دل میں آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ آپ نے میری بچی، ایمان دار اپنا کو بھی بے وقوف بنایا۔ انہیں اندھیرے میں رکھا۔“ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ”ان کے ساتھ بے ایمانی کی۔“

”یا پھر؟“ وہ رک گئی۔

”یا پھر.....؟“ شاہ بے قرار ہو گیا۔

”یا پھر اب دھوکا کر رہے ہیں اپنا آپ منوانے کے لیے۔“

”میں تمہیں مزید یقین نہیں دلا سکتا۔“ وہ بہت شکستہ تھا۔

”ماہ رو! میں نے ماہ رخ سے دھوکا نہیں کیا۔ وہ اتنی اچھی، اتنی شان دار تھی کہ میں نے تمہیں فراموش کر دیا کہ ماہ رو! جب ہم بے بس ہو جاتے ہیں تو یانیکیاں کرنے لگ جاتے ہیں یا گناہ، مگر ماہ رو! اب احساس ہوتا ہے سات سال سے میں ماہ رخ کے محبتوں کے قرض چکا تار رہا ہوں۔ میرا اس پر محبتوں کا کوئی احسان نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں تمہیں فراموش کر رہا ہوں۔ درحقیقت میں خود کو فراموش کر رہا تھا۔ میں حقوق و فرائض کے گورکھ دھندے میں خود کو پھنسا رہا تھا مگر میں نے ماہ رخ سے شادی کے بعد ایک بار بھی تم پر نگاہ غلط نہیں ڈالی کہ میں نے سمجھوتہ کر لیا تھا۔“

میں ماہ رخ سے وفا کرتا رہا ہوں۔ تمہیں میں اب اس کا حساب آج تک نہیں چکایا پایا کہ تم جذباتوں کی راکھ تلے چنگاری بنی پڑی سوتی تھیں۔

میں امتحانوں سے گزرتا رہا ہوں۔ میں چاہتا تو ماہ رخ کو نظر اندازی کے تیر مار دیتا۔ شاید پھر چھ برس پہلے وہ مجھے چھوڑ جاتی۔ مگر ماہی! میں شاید بد نظر ضرور ہوں۔ بد باطن نہیں۔ میں جانتا تھا کہ قصور اتنا پرستوں کا ہے۔ ماہ رخ کا نہیں۔

اب میرے پاؤں کے آبلوں پر محبتوں کے مرہم رکھو یا مجھے تنہا چھوڑ دو۔ اب میں

تھک گیا ہوں۔

بہت تھک گیا ہوں۔ بہت زیادہ۔ بہت کہ اب میں سپر ڈالنا چاہتا ہوں، ہر ماحول میں جی سکتا ہوں۔ احسان تھکن تم نے اور بڑھا دیا ہے۔

اب فیصلہ کن بات کرنا ماہ رو!

اس نے نڈھال لہجے میں کہا۔

”اور ماہ روتجھ سے خدا کے واسطے نیکیاں نہ کرنے لگ جانا یا تو کھلی دشمن بنو یا کھلی دوست۔ سن رہی ہو؟“

وہ ایک ننگ، ساکت و جامد تھی۔

”تم کچھ بولتی کیوں نہیں ماہ رو؟“

”غلطی آپ نے کی تھی شاہ صاحب! ہمارا گھر انہ اس قدر ایڈوانس نہیں تھا۔ احسان علی سے میری منگنی میری رضا کے بغیر ہو گئی تھی۔ کتنے فیصد لڑکیاں ہیں جو اپنی شادی پہلے لڑکے سے مل کر طے کرتی ہیں؟“

وہ کس قدر گہری بات کہہ گئی تھی۔

”وہ وقت اور اس وقت کے تقاضے کیا تھے؟ میں سمجھا نہیں سکتا نہ تم سمجھنا چاہو گی۔“ وہ بہت شکست خوردہ تھا۔

وہ ساڑھی سمیٹ کر اٹھ بیٹھی۔

”اب کیا کہتی ہو؟“

”وہی جو آپ کے نکاح میں آنے کے بعد کہا تھا۔ آپ نے میری توہین کی، مسلسل کی۔ مجھے آپ قطعی درگزر کے قابل نہیں لگتے۔“ وہ اترنے کے لیے جھکی تو اس نے ماہی کو شانوں سے تھام کر بیڈ کی پشت پر نکا دیا۔

”نہ مجھے تمہاری معافی کی ضرورت ہے نہ درگزر کی۔ میاں بیوی میں معافیاں خود بخود ہو جاتی ہیں۔“

”چلو، آرام سے سو جاؤ۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”ہو نہہ مطلبی۔“ وہ دل ہی دل میں پھکاری۔

”شکریہ۔“ وہ نخوت سے ناک چڑھا کر بولی۔

”دلوں میں میل رکھ کر محبتیں نہیں ہوتیں۔“ وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاہ نے

اسے جھٹکا دیا جس کی اسے توقع نہیں تھی۔

”دل کا میل کب صاف ہوگا؟“ وہ جھٹکا۔

”کبھی نہیں، آپ کے نزدیک ہوتی ہوں گی یہ سب باتیں، میں بہت سنجیدہ ہوں۔ آئی ڈس لائنک یو۔ انڈراستینڈ؟“

چہرے سے چہرہ قریب تھا۔ دل اس سے بھی قریب۔ جذبے بے فاصلہ تھے۔ شاہ اتنی نفرت نہ سہ سکا۔ ایک دم اسے چھوڑ دیا۔

”پھر تم اس گھر میں کیوں ہو۔ میں نے تمہاری کبھی انسلٹ نہیں کی مگر آج پوچھ رہا ہوں کیوں ہو اس گھر میں، کیا حق ہے تمہارا.....؟“

”میں آپ کو بتا چکی ہوں پہلی ہی شب کو۔“

”بچے یتیم خانے میں نہیں ہیں۔ باپ کے گھر میں ہیں اپنے سمجھیں.....؟“ اس نے جھٹکے سے الماری کھولی۔ لاکر سے نوٹوں کی کئی گڈیاں نکال کر اس کے سامنے ڈال دیں۔ ”اٹھا لو یہ مہر مہجیل۔ اب تو قریب آنے دو۔“ وہ کٹیلے پن سے مسکرا دیا۔

”اوہ!“ وہ سرخ ہو گئی۔ قدم لڑکھڑا گئے۔

شاہ نے تھام لیا۔ ”اسے کہتے ہیں توہین۔ سمجھیں ماہ رویگم!“ شاہ جنونی ہو رہا تھا۔ ”اگر ڈائی ورس (طلاق) چاہتی ہو تو مجھے میرا حق تو دو۔ تب ہی تو تمہیں خود پر حرام کروں گا۔“

”شاہ!“ وہ چیخ پڑی۔ بھاگ کر دروازے تک گئی۔ دروازہ لاک دیکھ کر وہیں تک کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”لاک کھولیں، خدا کے لیے لاک کھولیں۔“

شاہ نے لاک کھول دیا۔

”ماہی! جتنی آزمائش تم نے میری کی ہے۔ خدا کرے تم بھی ایسی آزمائش میں ڈال دی جاؤ۔ تب ہی تمہیں میری سمجھ آئے گی۔“ اس نے اس کے سرخ چہرے پر تپتی نظر ڈال کر کہا۔ وہ روتی ہوئی باہر نکل آئی، اپنی ذات کی طاقت کے احساس نے وقت گریہ بھی سرشار کر دیا۔ شاہ کو آج بھی پچھاڑ دیا تھا۔ کیا کر لیا آخر اس نے۔

رونے کی وجہ سے نیند بھی گہری آئی۔

اٹھتے کے ساتھ ہی وہ اپنے رات کے فیصلے پر عمل پیرا ہوئی۔ بچے اسکول جا چکے

تباہ کر لیا تو نے اپنا آپ۔ اس اکڑ کے پیچھے۔ ذہن میزان تھا۔ منصف تھا۔ ضمیر کے گلے لگ کر اس کے عیب چھانٹ رہا تھا۔
وہ نہیں آئے گا۔
نہیں آئے گا۔

تو مر بھی جائے تو نہیں آئے گا۔ بچے پوچھیں گے تو کہے گا۔ تمہاری دوسری ماں بھی مر گئی۔ تمہاری پہلی ماں خدا کی مرضی سے مر گئی۔ دوسری ماں اپنی مرضی سے۔
آج بچے ماہی تیری جان کو روئیں گے۔

کئی دن روئیں گے تو تو ان کے ساتھ بھی کھیل کھیل گئی۔ ماہی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ دونوں بچوں کے تصور سے کھیلنا ہی سیکھا ہے کچھ جھیلنا بھی سیکھ۔

ساری غلطیوں کے بھگتیاں، سارے غلط فیصلوں کے عذاب شاہ کی جان کو جاتے تھے۔
وہ تھکا تھکا سا۔

الجھا الجھا سا۔
وہ سونے کی شوقین گورنس۔

پھول سے معصوم بچے۔
وہ ہاتھ دھو بیٹھا ہے تو منہ دھو رکھ۔ اب یہ انا یوں ہی تڑپتی کھستی پھرے گی۔ جا چلی جا۔

اس کی تھکن دونوں ہاتھوں سے سمیٹ لے۔ چل اب یہ خول اتار دے۔ اپنی اصلیت آشکار کر دے۔ محرم راز بنا لے۔ مشکلیں آسان ہوں گی۔ مشکلیں آسان ہو جائیں گی تو وقت سہل!

”خان! ایک منٹ۔“

وہ آنکھوں پر گلاسز چڑھا کر آہستگی سے گویا ہوئی۔

”شاہ خانہ واپس چلو۔“

”کچھ بھول آیا آپ بیگم صاحبہ؟“

”ہاں، سب ہی کچھ۔“



تھے۔ شاہ کا پتا نہیں تھا۔

اس نے ڈرائیور کو دیکھا۔ شاہ اپنی ڈائسن لے کر گیا تھا۔ پہلے ڈائسن اباجی کے استعمال میں تھی۔ اب شاہ کی رولس راس پورچ میں تھی۔

اس نے خان کو گاڑی نکالنے کو کہا۔
اپنا بیگ لے کر جب وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی شاہ کی گاڑی نظر آئی۔ گویا وہ آج ہسپتال نہیں گیا تھا۔

ایک لمحے کو دونوں کی نظریں چار ہو گئیں۔
شاہ کی نظر اس کے اعصاب پر ٹوٹ بجا گئی۔

”چلو خان۔“ اس نے میکے کا راستہ بتایا۔
گلشن سے ڈیفنس تک کا راستہ۔ اس نے سیٹ کی پشت سے سر نکا کر آنکھیں موند لیں۔

وہ چپکتی آنکھیں تصور میں آگئیں۔
کیا واقعی آج شاہ میری زندگی سے نکل گیا؟

نکال تو میں نے چھ برس پہلے دیا تھا۔ وہی شاہ جس کو پانے کے احساس نے مجھے پہروں جگایا تھا۔ یہ وہ شاہ نہیں۔ تو یہ ڈرامہ باز ہے۔ بے ایمان ہے۔ اپنا کو مطمئن کرنے والا،

مجھے بنانے والا، ضمیر کی چیخوں پر نیکیاں کرنے والا۔
اس نے سر ہاتھوں سے تھام لیا۔

تو بھی تو آج تک خود فراموشی کے ثواب کما رہی تھی ماہی۔
تیری فطرت تڑپانے والی ہے مگر تو تڑپتی رہ ساری زندگی اب۔ تو نے چاہا شاہ جیسا

شان دار آدمی تیرے سامنے ٹوٹ جائے۔ وہ ٹوٹا رہا۔ اب منہ دھو رکھو۔ اب وہ تجھے لینے نہیں آئے گا۔ وہ عورتوں پر پی ایچ ڈی کی ڈگری نہیں لیے ہوئے۔ تیری انا کے تقاضے اس کے پلے

نہیں پڑتے۔ وہ واقعی اب تھک گیا ہے۔
سارے باب بند کر آئی ہے آج تو۔ وہ تیرے پیچھے نہیں آئے گا۔ بچے اس کے

ہیں۔ فکر تجھے؟ اپنا پاپی من ٹوٹل ماہی! تو بہن کی خاطر فراموش کر رہی تھی خود کو؟ تو بھی قربانیوں کا چارہ ضمیر کے آگے ڈال کر تنہی پھر رہی تھی کہ نہیں۔

اتنا بھی کسی کو نہیں ستاتے۔ دل توڑنا تو تجھ سے سیکھے کوئی۔ اپنا خدا آپ بن بیٹھی ہے۔ اپنے جس عمل کو چاہے نیکی بنا دے۔ ثواب بھی خود ہی لے لے۔

لکھوں، اس لیے کہ رات دو بجے آپ سے اس طرح باتیں کرنا بہت اچھا لگ رہا ہے مگر.....
چلیں پھر سہی؟

کتنی سنان ہے چن کی فضا
دل دھڑکتا ہے آشیانے میں

فقط، زیبا

جناب عالی!

آداب عرض۔

آج پچھڑے ہیں تو کل ہم پھر کہیں مل جائیں گے
کچھ بھی ہو موبیوں کہاں جائیں گی ساحل کے سوا
پھر وہی گلہ جواب نہ لکھنے کا۔ کل میں کچن میں تھی تو مسعود بھائی آ گئے۔ انھوں نے
دبے لفظوں میں مجھ سے یہی پوچھا تھا۔ آیا میں نے جواب لکھ لیا ہے یا نہیں؟ اسی دم زری آپا
اندرا آ گئیں مجھ سے تو پہلے ہی جواب دینا دو بھر تھا۔ آپا کے آتے ہی دل دھک سے رہ گیا۔
مصلحت نے بزدل سا بنا رکھا ہے اور پھر میں لکھے ہوئے خط سے کچھ مطمئن بھی نہیں
تھی۔ سوچا تھا اور ذرا ٹھیک سا لکھوں گی۔ ہر بار خط لکھ کر یہی خیال آتا ہے، کہیں اس بات کا
مطلب آپ یہ نہ سمجھ لیں..... کہیں وہ نہ سمجھ لیں، کیا کروں، ہمت ہی نہیں پڑتی۔ مگر حال یہ ہے۔
میں جہاں پر تھا، وہاں سے لوٹنا ممکن نہ تھا
اور تم بھی آ گئے تھے کچھ پاس دل کے سوا
فقط۔ زیبا

سرکار!

تسلیمات۔

آج مسعود بھائی نے جو آپ کا خط دیا ہے، اس میں آپ کی ناراضگی عروج پر ہے
اور میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔ آپ کے خط میں لکھے اس شعر کو اتنی بار پڑھا ہے کہ
وظیفہ سا بنتا لگ رہا ہے۔ آپ نے لکھا ہے:
کم سے کم حرفِ تمنا کی سزا اتنی تو دے
جراتِ جرمِ سخن بھی مجھے آئندہ نہ ہو

خط جو پوسٹ نہ ہو سکے

مکرمی روخیل صاحب!

آداب۔

آپ کا خط مسعود بھائی کے ذریعے ملا..... ابھی تک جان سوکھے پتے کی طرح
کانپ رہی ہے۔ یہ آپ نے کیا کیا مسعود بھائی کو راز دار بنا لیا؟ اب تو مجھے ان کا سامنا دو بھر
ہے۔ اُف کیا سوچتے ہوں گے مسعود بھائی، آپ کو میرا ذرا خیال نہ آیا؟
رات سب گھر کے نوجوان تاش کھیل رہے تھے۔ کچھ دوسرے کزنز بھی آئے ہوئے
تھے۔ یہ سب شیطان کی خالائیں چھت پر بیٹھی گپیں مار رہی تھیں۔ مجھے کئی بار چائے بنا کر اندر
پہنچانا پڑی۔ ہر بار مسعود بھائی کی شریر مسکراہٹ نے میرے اوسان خطا کیے۔ سچ آپ نے
میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے..... آپ کو مجھ پر ذرا ترس نہیں آتا؟

فقط۔ زیبا پاکستان

مکرمی روخیل صاحب!

تسلیمات۔

آج پورے دس دن بعد آپ کا خط ملا۔ آپ نے جواب نہ لکھنے کی شکایت کی ہے۔
آپ نے لکھا ہے۔ مسترد کرنے کا مجھے پورا حق ہے، مگر واضح خط تین چھیرا نا افسانہ ضروری ہے،
وگرنہ آپ اس کی ڈوری سے لٹک رہیں گے۔

ہائے اللہ..... آپ کے علاوہ تو دوسری سوچ ہی میرے پاس نہیں۔ مسعود بھائی کتنی
بار معنی خیز انداز میں میرے پاس آئے تھے..... میں اگرچہ خط تو لکھ چکی تھی مگر میری ہمت نہیں
پڑی..... حالانکہ یہ میری بخت آوری ہے کہ دیارِ غیر میں آپ مجھے اور صرف مجھے یاد کرتے
ہیں۔ مگر میں کیا کروں، مجھے ڈر لگتا ہے تماشا بننے سے۔ آپ مسعود بھائی کو کہہ دیجیے گا، وہ اپنی
مسکراہٹ سے مجھے چھیڑا نہ کریں..... ورنہ میں مر جاؤں گی..... دل چاہ رہا ہے بہت طویل خط

روحیل.....!

السلام علیکم!

تازہ ترین خط ملا..... اب تو یہ حالت ہے۔

نام بھی پہچان لیتے ہیں قیافہ دیکھ کر!!

خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفاظہ دیکھ کر

آپ کی ناراضگی بجا سہی مگر یہ مسعود بھائی..... سچ پتا نہیں ان کی زندگی اتنی بے ترتیب کیوں ہے۔ رات ان کے کمرے کی لائٹ جلی دیکھ کر میں نے کچھ ہمت باندھی اور ایک عزم صمیم کے ساتھ ان کے کمرے کی طرف چلی۔ آپ کو پتا ہی ہے، میرا اور پارو کا کمرہ تو بالکل ہی آخر میں ہے اور مسعود بھائی کا کمرہ شروع ہی میں پڑتا ہے۔ ایک تو پارو کے ٹیٹ ہو رہے ہیں، دیر تک پڑھتی رہتی ہے۔ میں لفاظہ تیار کر چکی تھی۔ پارو کے سونے کا انتظار کر رہی تھی، یہ بھی دھڑکا تھا۔ مسعود بھائی سونہ جائیں۔ پارو کے سوتے ہی میں ان کے کمرے کی طرف بڑھی اور سر پیٹ کر رہ گئی، وہ رمیز، عمر اور صبیح کے ساتھ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ میں کتنی بے چارگی کے عالم میں اُلٹے پاؤں واپس آئی تھی۔ اس قدر جذباتی اور ہلکان ہو رہی تھی کہ مارے غصے کے لفاظہ پڑے پڑے کرنے کو جی چاہا۔ بڑی مشکل سے خود پر کنٹرول کیا۔

کیا زندگی ہے میری بھی؟ بڑا ترس آیا خود پر.....! پھر آج پانچواں دن ہے جو مسعود بھائی نظر آئے مگر ان کے ہاتھ میں آپ کا تازہ خط پھر مجھے امتحان میں ڈال چکا تھا۔ آپ کے ہرنے خط کے بعد اپنا جواب ادھورا محسوس ہوتا ہے اور خط از سر نو لکھنا پڑتا ہے۔ دیے آپ کتنے مستقل مزاج بلکہ کڑ ہیں۔ داد دینا پڑتی ہے اور اپنی دلی کیفیت کیا لکھوں؟

جب تجھ بن نہیں کوئی موجود

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

بہت ہی شرمندہ..... زیبا

میرے روحیل!

لب پہ آئے جو قاتل اسم گرامی ان کا

چاندنی سی میری آنکھوں میں بکھر جاتی ہے

خط کے سارے تکلفات اب بوجھ لگنے لگے ہیں۔ بس دل چاہ رہا ہے۔ لکھتی جاؤں،

کاش! میں آپ کو اپنے جذبوں کی ایک ایک لہر منتقل کر سکتی۔ مسعود بھائی ایک ہفتے کے لیے پشاور گئے ہوئے ہیں۔ میں اور کسی کو خط پوسٹ کرنے کے لیے ہرگز نہیں دے سکتی۔ دیکھے ناں روحیل صاحب بنتی مدت میں ہے بگڑتی گھڑی میں ہے۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اس بار آپ کو ہر صورت جواب بھجواؤں گی۔ اگر آپ ناراض ہوں گے تو میرا کیا ہوگا؟ سچ آپ میری مجبوری کو بھی مد نظر رکھیں اور یہ آپ کو کیا ہوا تھا کہ مجھ جیسی دقیانوسی، بزدل اور بے مایہ سی لڑکی کو پسند کر بیٹھے؟ جہاں آپ ہیں، وہاں تو رنگ و بو کا سیلاب ہے۔ جذبات کے اظہار کی آزادیاں ہیں۔ آپ کو بھلا کیا نظر آیا ہے مجھ میں؟ مسعود بھائی آئیں گے تو فوراً انھیں یہ خط دے دوں گی، پھر آپ کو کوئی شکایت نہ ہوگی۔

لفظ: زیبا

روحیل.....!

السلام علیکم!

سچ مسعود بھائی کی واپسی میں بہت ہی دیر ہو گئی تھی..... خط تو میں نے لکھ لیا تھا، لیکن آج جب آپ کا تازہ خط ملا تو محسوس ہوا تو پچھلا خط ناقص و نامکمل تھا، سوچا پھر لکھ لیتی ہوں، ہرج ہی کیا ہے۔ آپ کا خط میرے سامنے کھلا رکھا ہے، شکایت، گلہ، ناراضگی اور..... آپ بالکل حق بجانب ہیں..... مگر دیکھے ناں۔ مسعود بھائی جو گئے ہوئے تھے..... کل آئے تو ان کی ڈاک اچھی خاصی جمع ہو چکی تھی۔ انھوں نے آتے ہی آپ کا خط دیا۔

میں ہاتھ روم کا فرش دھو رہی تھی۔ عجیب سا حلیہ ہو رہا تھا۔ مسعود بھائی نے کھلا ہوا دروازہ ناک کر کے مجھے متوجہ کیا۔ میری حالت غیر ہو گئی۔ جب وہ آپ کا خط دیتے ہیں تو میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ کام دراصل ہے بھی تو رسکی..... بڑی احتیاط سے اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ مگر مجھے اب ان سے بہت شرم آتی ہے۔ کس جنجال میں جان ڈال دی ہے میری؟

آپ نے میرے حالات دریافت کیے ہیں کیا بتاؤں؟

تجھے خبر ہے تیرا انتظار گھر میں رہا

یہ حادثہ ہے تو عمر بھر سفر میں رہا

زیبا

لکھتی جاؤں..... الفاظ کا ایک جھوم ہے، مگر اس کی ترتیب محال ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے میر بیارے میں غلط اندازہ لگایا اور یہ کہ میں نے آپ کے جذبات اور احساسات سے کھینے کی کوشش کی ہے..... بہت نفرت ہوئی اپنے آپ سے، یہ سب پڑھ کر..... ظاہر ہے، آپ بھی انسان ہیں۔ مجھے آپ کی مجبوریوں کا اندازہ ہے..... آپ کو اس خاندان نے کیا مقام دیا ہوا ہے۔ یہ بھی میرے علم میں ہے..... میرا بس چلے تو آپ کو اپنے نصیب کے سکھ بھی دے ڈالوں۔

مگر..... آپ کے بنا میری زندگی میں کوئی سکھ ہی کہاں؟ آپ کے علاوہ میرا ذہن کچھ اور تو سوچتا ہی نہیں..... کل آپ کا فون آیا تھا..... مسعود بھائی بلائے آئے تھے، مگر بڑی ممانی مجھ سے غیر بھائی کے جوڑے ٹنکوا رہی تھیں۔ مسعود بھائی نے غالباً مجھے سنانے ہی کو راہداری میں کہا تھا..... روکیل کا فون آیا ہے، مخاطب جانے کس سے تھے۔

وہ تو کہہ کر واپس چلے گئے۔ بڑی اماں جو قریب ہی تھیں اور جنہیں شاید مسعود بھائی نے دیکھا نہیں تھا۔ وہ ان کے پیچھے ہی چل پڑی تھیں، پھر ان سے ریسور کون لے سکتا تھا؟ مجھے مسعود بھائی کی نادانی پر سخت غصہ آیا..... اشارے سے بھی تو کہہ سکتے تھے۔ آج جب میں انہیں یہ خط دینے جاؤں گی تو جتاؤں گی ضرور، سچ مارے تاسف کے رات بھر نیند بھی نہیں آئی..... دل تو چاہ رہا تھا، ٹھٹھ سے سوئے مسعود بھائی کو اٹھا کر خوب لتاڑوں مگر.....؟ روکیل! میں ان کے سامنے بہت گھبراہٹ محسوس کرتی ہوں۔ آپ ان سے میرے متعلق تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہوں گے۔ اُف! سوچ کر بڑی شرم سی آتی ہے۔ کیا سوچتے ہوں گے.....

مسعود بھائی؟

فقط:۔ زیبا

روکیل.....!

تسلیمات!

آج پورے ڈیڑھ ماہ بعد گاؤں سے واپس آئی ہوں۔ امی نانا جان کے چہلم سے پہلے گھر واپسی پر راضی نہ تھیں۔ پارو کے پاس تو ایگزام کی ڈھال تھی۔ اس کا تو ویسے بھی کبھی گاؤں میں دل نہیں لگا، وہ تو ”دسواں“ نمٹا کر بابا جان کے ساتھ گھر واپس آ گئی تھی۔ مگر امی نے مجھے آنے نہیں دیا کہ میرے ساتھ ہی چلنا.....!

غالباً مسعود بھائی نے آپ کو میرے گاؤں جانے کی اطلاع دے دی تھی، اسی لیے ڈیڑھ ماہ میں آپ نے صرف ایک خط لکھا ہے۔ میں اپنے کمرے میں آ رہی تھی کہ مسعود بھائی نے مجھ سے کہا کہ تمہارا خط میرے ٹیبل کور کے نیچے رکھا ہوا ہے۔

ان کی موجودگی میں تو میں ان کے کمرے میں نہیں گئی مگر جب وہ آفس چلے گئے تو میں فوراً خط نکال لائی تھی۔ اس خط میں زیادہ گھن گرج نہیں ہے۔ غالباً آپ کو نانا جان کے انتقال کی اطلاع مل گئی تھی۔ آپ نے جو میرے تاثرات نوٹ کیے۔ وہ قطعی فریب نہیں، آپ یقین کر لیں۔ بس میں ذرا دقیا نوی اور کم ہمت ہی ہوں، جو پیام آپ کے احساسات کے مظہر تھے، مجھ تک پہنچے، میں نے فوراً جواب دیے، مگر یہ جواب میری حدود سے پار ہو کر آپ تک نہ پہنچ سکے۔

یاد ہے، رومی آپنی جب امریکہ سے آئی ہوئی تھیں، گھر میں کس قدر ہنگامے اتر آئے تھے۔ خاندان بھر میں دعوتیں ہو رہی تھیں۔ انہی بہانوں میں ایک بار میں نے بڑے دل سے اپنی آرائش کی تھی۔ سفید ٹشو کے سوٹ کے ساتھ پھولوں کا زیور پہنا تھا مگر اس دن آپ بہت دیر سے گھر آئے تھے۔ جس قدر میرا سنگھار پرانا ہو رہا تھا۔ اس درجہ ہی دل بھر بھرا رہا تھا۔ اس روز مجھے سب نے تعریفی کلمات سے نوازا تھا۔

مگر آپ کے آنے کے بعد جب میں راہداری میں تالا ڈال رہی تھی تو آپ نے میرے پھولوں کے زیور کو بڑے سادہ سے انداز میں سراہا تھا۔ آپ کو پتا ہے، میں جو آپ کے دیر سے آنے پر شاک کی تھی، اس رات ایک نظم کہہ بیٹھی تھی، وہ یہ تھی۔

رات گئے گھر آ کر

میری آرائش سراہنے والے

یہ گجرے.....

میں نے شام کو پہنے تھے۔

نظم اوٹ پناگ سہی، میرے شاعرہ بننے کا کریڈٹ تو مگر آپ ہی کو گیا ناں؟ اگر میں باقاعدہ شاعرہ بن جاؤں تو میرا مخلص آپ تجویز کیجے گا۔ اس لیے کہ آپ مجھے مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپ ہی تو کہتے ہیں اور جو آپ کہتے ہیں، ہم اس پر اعتبار کرتے ہیں۔ ناچیز..... زیبا

بہت سے چٹائی پتھر

ڈھیروں خالی سپیاں

چند ٹوٹی کشتیاں ساحل پر کھڑی ہوں گی

اور بس..... اس سے آگے اپنے احساسات کو کیا معنی پہناؤں؟

خدا کرے یہ خط اپنی منزل تک پہنچ جائے۔

سرتاپا خلوص..... زیبا

میرے.....!

میرا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو اور آپ کے قدموں میں بکھر جائے۔ میں کون سا رنگ

بنوں جو آپ کی ذات میں پورا پورا جذب ہو جائے..... خوشبو بن کے فضا میں بکھروں جو آپ کے ایک ایک تارِ نفس میں حلول ہو کے معرکہ عشق ہو جائے..... جہاں دوئی کے احساس کا احتمال تک نہ ہو۔

”آپ کے خط کا ایک ایک لفظ جس اذیت، جس کرب کا غماز ہے..... میرا کلیجہ شق ہو چلا ہے۔ مسعود بھائی کو آج کل سخت فلو ہے۔ کئی بار مختلف بہانوں سے ان کے پاس گئی ہوں۔ میں کزن ہوں، خاندان کی لڑکی ہوں۔ اسی لیے وہ اتنی احتیاط کرتے ہیں۔ آپ کی وجہ سے شاید میرا احترام بھی بہت کرتے ہیں۔ یہ تو طے ہے کہ سارے خاندان میں وہ آپ کے سچے خیر خواہ اور بے لوث دوست ہیں..... آپ یقین کیجئے آپ، کے موضوع پر آج تک میرا ان کا کوئی مکالمہ نہیں ہوا۔

اور یوں بھی آپ کے ذکر پر بھید افشا ہوتا لگتا ہے، جتنا ضبط کرو..... مگر لگتا یہی ہے، چوری پکڑی جائے گی..... خدا کی پناہ..... اپنے آپ سے بھی خوف آنے لگا ہے..... عشق ہے کیا؟ خود اپنی ذات سے دشمنی کے ہوا..... ایک خلش، ایک کک..... آٹھوں پہرا نگاروں پر لوٹنا۔

اور خیر آپ میرے احساسات سے بے خبر تو نہیں ہیں۔ مجھے آپ کے پہلے خط میں لکھا شعر بہت خوب یاد ہے۔ آپ نے خط کے شروع میں لکھا تھا:

وہ سرد مہر سہی پڑ نگاہ لطف کے بعد

فراز دیکھ سماں برف کے پگھلنے کا!

روحیل جی.....!

میری خوبصورت دعا آپ کے نام۔

ہم جو پرستوں پہ گمان ترک وفا کا

یہ وہم کہیں تم کو گناہ گار نہ کر دے

پورے پندرہ دن مینا باجی کی شادی کا ہنگامہ رہا۔ مسعود بھائی نے یہ خط مجھے بچن میں

دیا تھا۔ آپ کا خط مجھے پہنچانے میں وہ بے حد احتیاط کرتے ہیں۔

مختلے چچا نے کبھی آپ کو اپنے دوست کا بیٹا نہیں سمجھا، اپنی اولاد سمجھا، حقیقی اولاد اگر دیگر لوگوں کے نفرت آمیز جذبات آشکار نہ ہوتے تو شاید کسی کو قیامت تک علم نہ ہو پاتا کہ آپ مختلے چچا کی حقیقی اولاد نہیں ہیں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ انہی افراد کے سوا ہاں روح انداز و اطوار نے آپ کو یہاں سے دوری پر مجبور کیا۔

اس خط سے پہلے میں نے آپ کے ہر خط کا جواب لکھا مگر افسوس..... خیر مجھے یہ دھڑکا تو ہر گز نہیں کہ آپ مجھ سے بدل جائیں گے۔ آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں، میں کتنی محتاط اور مصلحت کوش ہوں اور موقع محل کی نزاکت کو ملحوظ رکھتی ہوں۔ آپ کبھی بھولے سے بھی میرے متعلق کوئی اُلٹا سیدھا گمان نہ کریں۔ آخر مسعود بھائی میرے تاثرات تو آپ کو بتاتے ہی ہوں گے۔ آپ کے بچپن کے ساتھی بڑے ابا کے ہونہار سپوت، مجھے یقین ہے، وہ میرے چہرے سے بہت کچھ کھوج لیتے ہوں گے اور آپ سے ضرور ذکر کرتے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے آپ جب واپس آئیں گے تو سب کچھ..... ٹھیک ہو جائے گا..... آپ ایک اچھے مستقبل کی تلاش میں یہاں سے گئے ہیں، جس سے جاری آئندہ کی خوشیاں وابستہ ہیں۔ حالانکہ جب آپ جا رہے تھے تو مجھے ڈھیروں اُلٹے سیدھے وہم آئے تھے اور میں نے ایک نظم رات کے آخری پہر میں جیسے آنسوؤں سے لکھی تھی۔

میرے ہاتھوں کو سنہرے کنگن سے سجانے کی خاطر پرائے دیں جانے والے تو اگر سونے کی تلاش میں نکلا

تو.....

میں تیری تلاش میں نکل کھڑی ہوں گی

طوفان گزرنے کے بعد آنے والے

ہم عمر گزرتھیں، سب ہی تقریباً اپنے ”ان“ کو پیاری ہو چکی ہیں۔

حالانکہ میں سب سے پہلے ”کسی“ کو پیاری ہوئی تھی (روحانی طور پر) مگر.....!

میں نے گزشتہ تین خطوط کا جواب ایک ہی لفافے میں ڈال رکھا ہے، مگر یہ مسعود بھائی ہاتھ ہی نہیں لگ رہے..... آج سوچا تھا کہ جب وہ صبح کے غسل کے لیے ہاتھ روم جائیں گے تو میں دے پاؤں جا کر ان کی رائٹنگ ٹیبل پر لفافہ رکھ آؤں گی۔ وہ جب بھی خط دیتے ہیں تو یہی کہتے ہیں۔

”میں کل روئیل کو خط پوسٹ کروں گا اگر جواب لکھنے کا پروگرام ہو تو لکھ کر میری ٹیبل پر رکھ دینا.....!“

ان کے جانے کے بعد میں دیر تک حیا سے ٹوٹی رہتی ہوں۔ کیسا تماشا بنا ہے میرا مسعود بھائی کے سامنے..... سچ جب سے آپ گئے ہیں، میں نے آج تک ان سے نظر ملا کر بات نہیں کی۔ ایک تو ہمارے ہاں اکیسویں صدی کی آمد آنے کے باوجود لڑکیوں کو تنہا باہر نکلنے کی اجازت نہیں..... اسکول جاتے تھے تو یہ حال جیسے جلے کے شرکار سوائے منزل روانہ ہیں۔

کالج گئے تو جماعت سے پہلے ہی گھر سے ”باجماعت“۔

ورنہ خطوط پوسٹ کرنا مسئلہ نہ ہوتا۔

دوسرے آپ نے جاتے ہی جو پہلا خط لکھا تھا، اس میں جواب مسعود بھائی کے حوالے کرنے کی تاکید کی تھی۔

آپ نے لکھا تھا مسعود بہت ذمہ دار اور سلجھا ہوا ہے۔ اعلا انسانی اخلاقی قدروں کا علمبردار اور یہ کہ مجھے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ آپ پردیس میں ہیں اور دیس میں آپ کا کوئی حامی، حمایتی نہیں۔ اگر کسی کو بھٹک بھی پڑ گئی تو کہیں ضد میں یہاں وہ فیصلے نہ ہو جائیں جو ہماری زندگیاں بھاری بنا دیں۔

آپ نے جتنی تاکید کی، میں اس سے کہیں زیادہ محتاط ہوں۔ مسعود بھائی بھی تو آپ کو بہت کچھ بتاتے ہوں گے۔

میرا وجدان کہتا ہے۔ آپ کو مجھ پر انوٹ بھروسا ہے۔ میں کس طرح زندگی کے شب و روز گزارتی ہوں۔ کیا بتاؤں؟

آپ نے مجھے سرد مہر لکھا تھا..... گویا مجھے یونہی تنگ کیا تھا، ورنہ آپ کیا جانتے نہیں؟ بہت پریشان..... زیبا

روئیل.....!

سمجھا رہے تھے مجھ کو سبھی ناصحان شہر پھر رفتہ رفتہ خود اسی کافر کے ہو گئے

آپ کی کامیابیوں کی فہرست جوں جوں یہاں سامنے آ رہی ہے، بعض لوگوں کے خیالات میں تیزی سے تبدیلی آ رہی ہے۔

روحی آپنی جو پتا نہیں آپ کو کسی قابل نہیں سمجھتی تھیں۔ آج کل آپ کی تعریفیں کرتی نہیں تھکتیں۔ اور بڑے ماموں کی ہما کو تو آپ ہمیشہ سے ٹیلنڈ نظر آتے تھے۔

چھوٹی چچی جو آپ کا پیٹ نیم (بیار کا نام) ہی گاؤدی رکھ بیٹھی تھیں۔ آج کل ماہر علم نجوم ہو چکی ہیں..... اور آپ کی مزید اقبال مندی کی پیش گوئی کرتی رہتی ہیں۔

مختل چچی کو خوف ستانے لگا ہے کہیں آپ ہمیشہ کے لیے وہیں نہ رہ پڑیں (خدا نہ کرے) مسعود بھائی آفس کے کام سے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ آج تیسرا دن ہے۔ قوی

امکان ہے، آج رات نائٹ کوچ سے واپس آ جائیں گے..... میں نے سوچا ہے، یہ تینوں تازہ ترین جواب اکٹھے آپ کو بھجوا دوں گی۔ آپ کا ہر گلہ مٹ جائے گا اور پھر آپ کے خطوط کا انداز

بھی بدل جائے گا..... پھر شاید آپ میرے جذبوں کی شدت سے گھبرا جائیں یا اکتا جائیں اور یہ کہنے لگیں۔

دنیا میں ہیں کام بہت

مجھ کو اتنا یاد نہ کر

صرف آپ کی..... زیبا

روئیل.....!

آداب!

پچھلے تین ہفتے عجیب کرب میں گزرے۔ امی آئے دن آنے والے رشتوں میں سے کسی نہ کسی کی پر زور وکالت کرتی نظر آنے لگی ہیں۔ شاید اب وہ اتنی تیزی اس لیے دکھا رہی ہیں کہ گھر میں ہم چار فیملی ہیں۔ بڑے ابا..... منخلے چچا، چھوٹے چچا اور ہم، گھر میں میری جتنی

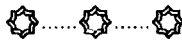
ہے، مسعود گھر کا لڑکا ہے.....!“

ابھی زمین میرے پاؤں کے نیچے ٹھہری بھی نہ تھی کہ مسعود بھائی میرے پیچھے پینٹری..... میں چلے آئے۔ وہ کہہ رہے تھے۔

”تم بہت مضبوط ہو..... میرے دل میں تمہاری بہت قدر ہے۔ روئیل جیسے لائق انسان نے کتنی بار تمہارے دل کے دروازے پر دستک دی، مگر تم نے بہت مضبوطی دکھائی۔ بس اسی وجہ سے میں، اماں کو انکار نہ کر سکا..... شاید روئیل کو مجھ سے شکایت ہو..... مگر..... وقت ثابت کر دے گا۔ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ.....؟“

سن رہے ہیں ناں آپ روئیل؟ دل کی دیوار کے اس پار.....!
میرے سامنے خطوط کا ڈھیر ہے..... جب یہ جملے گا تو بہت بڑا لالہ ہوگا۔
مجھے اندازہ نہیں کہ کتنی دیر جملے گا..... مگر میرے دل سے تو پھر بھی کم.....!
خط تو عادتاً ہی مکمل کر رہی ہوں..... ذات
ادھوری سہی..... کام تو مکمل کرنا چاہئیں۔

دیکھنا فانی کہیں تدبیر کی میت نہ ہو
اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے
زیبا



تیرے ساتھ گئی وہ رونق

اب اس شہر میں کیا رکھا ہے

دیے کی طرح جلتی ہوئی..... زیبا

روئیل.....!

ڈھیروں سلام شوق!

اے میرے منتظر! سکوتِ ازل بھی پہلی صبح کے لیے اتنی توجہ سے منتظر ہوگا..... جیسے

کہ میں.....!

آتی جاتی تارِ نفس میں آپ کا نام پروتی ہوں۔ ایسی روشن مالا..... ذرا میری چشم

تصور سے دیکھیں.....!

میں نے پچھلے چاروں خط لفافے سے نکال کر یہ پانچواں بھی ان میں شامل کر کے پوسٹ کرنے کا ارادہ کیا ہے اور یہ انشاء اللہ ضرور پورا ہوگا..... کیونکہ اب مسعود بھائی بھی اپنے دوروں سے فارغ ہو کر قدرے پرسکون ہو بیٹھے ہیں اور ان کا اب کہیں جانے کا پروگرام نہیں..... گھر میں آئندہ دو تین ماہ تک کسی تقریب کا بھی امکان نہیں..... لڑکیاں بھی میکے رہ کر جا چکی ہیں۔

ایک منٹ..... کمرے میں پارو آگئی ہے۔ کھانے کے لیے کہہ رہی ہے..... اب تو

رات کو اس کے سونے کے بعد ہی خط مکمل کروں گی..... ویسے یہ پہلا خط ہے جو دو نشستوں میں لکھا جائے گا۔

روئیل! اب خط لکھنے کے سارے جواز ختم ہو چکے ہیں۔ رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ آنسوؤں سے میری آنکھیں دھندلا رہی ہیں۔ اب تو سارے خطوط جلاتا ہی ہیں۔ بس عادتاً مکمل کر رہی ہوں..... کہ جب آپ کو خط لکھتی تو محسوس ہوتا جیسے آپ مجھے اپنے روم روم سے سن بھی رہے ہیں اور دیکھ بھی رہے ہیں۔ میری دھڑکن کسی لے کی طرح ہم آہنگ ہونے لگتی..... جیسے آپ کے مزاج کی ترتیب میری دھڑکنوں میں موسیقیت بن کر اتر رہی ہو.....

توبہ..... توبہ..... یہ میں کیا کر رہی ہوں؟..... اب آپ سے یہ باتیں مجھے زیب

نہیں دیتیں سارے سرٹوٹ گئے ہیں..... کس قدر بے ہنگم شورا بھر رہا ہے.....؟

کھانے کے فوراً بعد امی نے اطلاع دی کہ ”امی نے بڑی اماں کو ”ہاں“ کہہ دی

جینیفر سے تابندہ کی دوستی اچانک ہی ہو گئی تھی۔ جس اپارٹمنٹ میں تابندہ رہتی تھی، اس سے نچلے فلیٹ میں مدرٹریا قیام پذیر تھیں۔ وہ ریٹائرڈ پرنسپل تھیں اور پاکستان میں ان کا کوئی نہیں تھا۔ وہ نہایت بے کسی و بے بسی کے دن گزار رہی تھیں، سسر جینیفر ان کی تیمارداری کے لیے آیا کرتی تھی۔ تابندہ اور اس کی مہمی بھی ہمسائے کی حیثیت سے مدرٹریا کی خیر خبر لینے آ جاتی تھیں۔ یوں ان کی سسر جینیفر سے ملاقات ہوئی تو وہ دونوں کو بھاگ گئی تھی۔ وہ کبھی اپنے حقوق کی بات نہیں کرتی تھی۔ اسے تو بس انسانیت کی خدمت کا جنون تھا اور اس ”جنون“ کا بھی ایک خاص پس منظر تھا۔

سسر جینیفر چرچ کی جس اطفال گاہ میں پروان چڑھی تھی، اب اس سیمینری میں بچوں کی نگہداشت کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں پڑھا بھی رہی تھی۔ جینیفر کو سیمینری میں خود اس کی ماں نے داخل کیا تھا۔ اس کی وجہ جینیفر جانتی ہو یا نہیں۔ مگر قادر پال بہ خوبی جانتے تھے۔ جس طرح جناب مریم بنت عمران کو ان کی والدہ نے ہیکل کی ”نذر“ کیا تھا۔ اس طرح جینیفر کی ماں نے بھی جینیفر کو کلیسا کی نذر کر دیا تھا۔ وہ کٹر رومن کیتھولک تھی اور اس کی پرورش بھی ایک نن کے کی تھی، جو اسے غذا تو ناپ تول کر دیا کرتی تھی، مگر انسانیت کی خدمت کا درس بہت زیادہ، یہی وجہ تھی کہ زعم پارسائی اس کے لبوں میں رچ گیا تھا۔

اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ گناہوں کے کچڑے سے لت پت لوگوں کی اس بھیڑ میں وہ اور اس کی قبیل کے دوسرے افراد آسمانی تحفے ہیں لیکن ایک روز پرنسٹنٹ عقیدے کے ایک نوجوان نے اس کے عقائد پر محبتوں کے گلاب ڈال دیے اور وہ اپنا تن من ہار بیٹھی۔

اس کی ”مدر“ نے اس سے منہ موڑ لیا۔ اس کے قبیلے نے اسے اچھوت گردانا اور جہنم واصل ہونے کی نوید سنائی، لیکن اس نے تو ایک نئی دنیا پائی تھی، جس کا اپنا ایک نشہ تھا۔ پھر گزرتے وقت کے ساتھ جب یہ نشہ کم ہوا تو اسے ”احساس جرم“ ستانے لگا۔ اور ایک روز اس نے حضرت عیسیٰؑ کی تصویر کے سامنے جناب مریمؑ کی قسم کھا کر عہد کیا کہ وہ اپنے وجود میں پرورش پانے والے بچے کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دے گی۔ اگر لڑکا ہوا تو وہ اسے چرچ کا حصہ بنادے گی۔ اور اگر لڑکی ہوئی تو اسے کسی سیمینری کی نذر کر دے گی، جہاں ایک دن وہ سب سے معزز ہستی بن جائے گی۔

پھر یوں ہوا کہ خدا نے اس کی گود میں نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی جینیفر ڈال

صرف

اس دن جینیفر سیمینری سے نکلی تو تابندہ کو بس اسٹاپ پر بس کا منتظر پایا۔ تابندہ نے جینیفر کو دوستانہ انداز میں مسکرا کر دیکھا تو اس کے پاس چلی آئی۔

”گھر جا رہی ہو؟“ اس نے تابندہ سے پوچھا۔

”ہاں، آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ تابندہ نے اپنی اجرک درست کرتے ہوئے

سوال کیا۔

”مدرٹریا کے ہاں، انھیں دوائیاں پہنچانا ہیں۔“

”میں بھی کل ان کے ہاں گئی تھی، اب ان کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔“ تابندہ

نے بتایا۔

”یسوع مسیح ان کی مدد کرے۔“ جینیفر نے گلے میں جھولتی ننھی سی صلیب کو چھو کر سینے

پر کر اس بنایا۔

”مجھے آپ سے شکایت ہے سسر!“ تابندہ نے کہا۔ ”آپ روزانہ مدرٹریا کے ہاں

جاتی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں نہیں آتیں۔“

”اوہ!“ جینیفر مسکراتی۔ ”ان کی تیمارداری کرنے میں اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ سیمینری

آتے آتے رات ہو جاتی ہے۔“ جینیفر نے وضاحت کی۔

”امی مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ وہ اچھی اچھی باتیں کرنے والی لڑکی اتنے دنوں سے

کیوں نہیں آئی۔“

”امی کو بولنا کسی دن ضرور آؤں گی۔ بس آ رہی ہے۔“ اس نے بات کرتے کرتے

دائیں جانب دیکھ کر بتایا۔

بس رُک تو دونوں سوار ہو گئیں، لیکن رش کے باعث صرف جینیفر کو سیٹ مل سکی تھی۔

اس نے تابندہ کو اس پر بٹھا دیا۔

تھام کر معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”سسر! فاروق بھائی کی عادت ہے مذاق کی، آپ ماسٹرنہ کیجیے گا۔“

”ارے نہیں تابندہ! تم بالکل ایکسکیز نہ کرو۔ میں ایسا نہیں سوچتی۔“ وہ اپنی مخصوص سادگی سے بولی۔

”بس اسی لیے نہیں بنتی میری فاروق بھائی سے۔ مذاق کرتے وقت کبھی دوسروں کے جذبات و احساسات کا پاس نہیں کرتے۔“

”نائی بوائے۔“ مدرٹریا کو بھی فاروق کا کوئی مذاق یاد آ گیا تو ہنس کر بولیں۔

”بوڑھے ہو رہے ہیں وہ اور آپ بوائے کہہ رہی ہیں۔“ تابندہ جل کر بولی۔ دراصل وہ جینیفر کا دل رکھنے کی خاطر فاروق کو زور و شور سے برا بھلا کہہ رہی تھی۔

جب سے اس نے جینیفر کے حالات زندگی جانے تھے، اسے غیر شعوری طور پر ایک عجیب سی کیفیت اپنے وجود کے اندر محسوس ہوتی تھی، جسے وہ ہمدردی کا نام دے سکتی تھی۔ ”معلوم ہے میں آپ کو اوپر کیوں بلارہی تھی؟ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ تابندہ نے جینیفر کو بتایا۔

”اوہ گاڈ! کیا ٹریبل ہے؟“ اس کا معصوم دل دکھ کر رہ گیا، پھر وہ مدرٹریا سے مخاطب ہوئی۔

”مدر! میں تابندہ کی ممی کو دیکھ کر آتی ہوں۔“

وہ سب کچھ بھول بھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”آؤ تابندہ۔“ یہ کہہ کر وہ تابندہ سے بھی پہلے باہر نکل گئی تھی۔

اوپر پہنچی تو فاروق راستے ہی میں مل گیا۔

”ممی! کہاں ہیں؟“ وہ اس کی تیز چھتی ہوئی نظروں سے بوکھلا کر پوچھ بیٹھی حالانکہ احساسِ پارسانی اور نیکی کے خیالات اس کے مضبوط سہارے تھے۔ وہ بلا کی خود اعتماد تھی کہ اس کا ضمیر ہر قسم کی آلائش سے پاک تھا۔ نیکی کی راہ سے بھٹکانے والے گمراہ انسان نیکو کاروں کا امتحان ہوتے ہیں۔ لیکن نیکو کار بھی اٹل ہوتے ہیں۔ جینیفر نے سوچا۔

وہ راستے سے ہٹ گیا اور بولا۔ ”ہماری خالہ جان یعنی تابندہ کی امی بھی وہیں ہیں جہاں اکثر خواتین پائی جاتی ہیں۔ یعنی اپنے بیدروم میں۔“

اس شخص کو بولنے کا کس قدر شوق ہے ذرا سی بات کو یہاں سے وہاں تک پھیلا دیتا

دی۔ تب اس نے جینیفر کے پرنسٹن باپ کو اپنی ”منت“ کا حال بتا دیا اور یہ بھی کہا کہ وہ ”احساسِ جرم“ سے اندر ہی اندر بہت ٹوٹ پھوٹ چکی ہے، اب اگر یہ منت پوری نہ کی گئی تو وہ ختم ہو جائے گی، مر جائے گی، جینیفر کا باپ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو گیا اور اس نے بیوی کی بات مان لی۔ یوں جینیفر کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔

اب جینیفر کا باپ مر چکا تھا اور اس کی ماں متحدہ امارات کی کسی ریاست میں ملازمت کر کے جینیفر کے دو بھائیوں اور ایک بہن کی پرورش کر رہی تھی۔



جینیفر مدرٹریا کے پارٹنٹ کی سمت بڑھی تو فاروق بالکنی کی ریلنگ پر کھدیاں جمائے اپنے مخصوص لالباہی انداز میں جھکا سر گیٹ کا دھواں اسٹیم انجن کی طرح چھوڑ رہا تھا۔ جینیفر کو تابندہ نے بتایا تھا کہ فاروق بھائی امی سے چھپ کر سر گیٹ پیتے ہیں۔ فاروق کی تیز نظروں نے اس کا پھر پیچھا کیا تھا۔ نہ جانے وہ کیا کھوجنا چاہتا تھا۔ اسے فاروق کی نظروں سے اُلجھن اور کوفت محسوس ہوتی تھی۔ حالانکہ اس کے ساتھ تو یوں ہوتا تھا کہ اس کے سفید لباس پر نظر پڑتے ہی ہر مذہب اور عقیدے کا انسان احترام سے نظروں کا رخ موڑ لیتا تھا۔ کم از کم اس نے خود تو یہی محسوس کیا تھا۔ اب یا تو یہ شخص گمراہ تھا یا اس کے اخلاق کی ابھی مکمل نشوونما نہیں ہو پائی تھی۔ وہ دل ہی دل میں رب عزوجل سے پناہ مانگتی ہوئی کال نیل کا مٹن دبانے لگی۔ اتنے میں غالباً فاروق نے تابندہ کو اطلاع کر دی تھی۔ اس سے قبل کہ مدرٹریا دروازہ کھولیں تابندہ بالکنی سے جھانکی۔ ”ہیلو سسر!“

”گاڈ بلیس یو تابندہ!“ وہ جواباً دعا دے کر مسکرا دی۔

”اوپر آئیے گا نا؟“ تابندہ نے پوچھا۔

اس نے بالکنی پر نظر ڈالی۔ وہ گمراہ انسان اب وہاں نہیں تھا۔ ”تم ہی نیچے آ جاؤ۔ مدرٹریا کا دل بھی بہل جائے گا اور خدا تمہیں اجر بھی دے گا۔“

”کلیسا سے باہر آ کر سودے بازی سکھاتی ہو مس جینیفر!“ فاروق کی آواز آئی۔ وہ غالباً تابندہ کے پیچھے کھڑا تھا۔

اسی دم مدرٹریا نے دروازہ کھول دیا۔ جینیفر اس ”گنہگار“ انسان کی بات نظر انداز کر کے اندر چلی آئی۔ تھوڑی دیر بعد تابندہ بھی وہیں آ گئی۔ اس نے جینیفر کے بے حد حسین ہاتھ

تھا کہ اس کی موجودگی میں ان لوگوں کو تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن تابندہ نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ کچھ کرنا چاہتی ہے۔ معذروں کی طرح زندگی کیوں گزارے؟ بلکہ آج کل تو معذور لوگ بھی ذوق و شوق سے میدانِ عمل میں مصروف ہیں اور یوں ویسے بھی آج کل عورت کا ملازمت کرنا معیوب بات نہیں رہی۔ اس طرح یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا، زندگی کے دوسرے مرحلوں کی طرح۔

تابندہ کا آفس سیمینری سے نزدیک ہی تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ جینیفر کے بہت قریب آ گئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان پر خلوص دوستوں کا سارکھ رکھاؤ تھا۔ ان کی دوستی تنگ نظری اور تعصب و منافقت سے پاک تھی۔ بلکہ یہ سچی بات تو یہ تھی کہ تابندہ کبھی کبھار ضرور سوچتی تھی کہ اگر یہ لڑکی دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے تو اس کی ریاضتیں روشنیاں دیے لگیں، لیکن جینیفر نے اپنے کسی قول یا فعل سے شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے عقائد پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا موضوع انسانیت ہوتا تھا۔ عموماً یہ جملہ اس کے منہ سے نکلا کرتا تھا۔ ”تابندہ! کسی کا دکھ دور کر دینا اتنا اچھا عمل ہے کہ وہی تمہیں اس کی اہمیت بتا سکتا ہے جس کا کبھی کسی نے دکھ دور کیا ہو۔“

ایسے میں کبھی فاروق اس کی انسانیت پر تقریریں لیتا تو مخصوص کاٹ دار لیکن شگفتہ انداز میں کہہ دیتا۔ ”آپ تو دکھ اور خوشی پروف ہیں مس۔“ جینیفر کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر جاتے۔

”ہمارے بہت سارے اعمال و افعال دوسروں سے مختلف ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن دوسری لڑکیوں کی طرح بعض کام یکساں بھی ہوتے ہیں۔ جیسے کھانا بنانا۔ سینا پر دونا کھانا پکاتے ہوئے ہمارا ہاتھ بھی جل جاتا ہے اور ہمیں پتا چلتا ہے کہ جب آگ کھال کو چھوتی ہے تو اذیت کس نوعیت کی ہوتی ہے۔ سیٹے پر دتے سوئی کھب جاتی ہے اور بیماری میں انجکشن لگتا ہے۔ پھر ہم ”دکھ پروف“ کیسے کہے جاسکتے ہیں؟ ہم دکھ محسوس کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ دکھ صرف دھوکے اور منافقت ہی کا ریاکشن تو نہیں ہوتے نا۔ دکھ انسان اپنی غلطیوں کی وجہ سے بھی تو اٹھا سکتا ہے۔“ جینیفر بڑی خود اعتمادی سے اسے جواب دیتی۔

”گویا آپ سے بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں؟“ فاروق اپنے چہرے کے سامنے سے

ہے۔ اس نے سوچا۔ اسی دوران میں تابندہ بھی اوپر آ گئی۔ اور وہ دونوں فاروق کو وہیں کھڑا چھوڑ کر اندر چلی گئیں۔

فاروق دو سال کا تھا جب وہ تابندہ کی ماں کی آغوش میں آیا تھا۔ اس کی ماں تو اسے جنم دیتے ہی مر گئی تھی۔ دو سال اس کی دادی نے اسے سنبھالا، لیکن جب وہ بھی سوئے منزل چلی گئیں اور فاروق کے باپ نے دوسری شادی کر لی تو وہ بھانجے کو اس کے باپ اور اپنے شوہر کی رضامندی سے اپنے پاس لے آئیں۔ اس وقت تک تابندہ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ تابندہ کے ابو نے شروع دن ہی کہہ دیا تھا کہ بچے کو لے تو آئی ہو مگر اس کی پرورش کا آغاز جھوٹ سے نہ کرنا، اس لیے کہ جب کسی کی زندگی کو سنوارنا ہی ہے تو سچ اور حقیقت کے ساتھ سنوارنا چاہیے۔ اس طرح نفسیاتی اور سماجی مسائل پیدا ہونے کا خدشہ کم ہوتا ہے۔ اور یوں بھی حقیقت پسندی مشکلات کا بوجھ ہلکا کرتی ہے، بڑھاتی نہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا۔ ”یہ شروع دن سے تمہیں خالہ کہہ کر ماں سے محرومی کی حقیقت تسلیم کر لے تو اس کے حق میں بہتر ہے بجائے اس کے کہ باشعور ہونے کے بعد یہ دھماکا مستقبل کے ایک کارآمد انسان کو بے کار بنا دے اور اس کی باقی زندگی انہی شکوک میں گزر جائے کہ کہیں یہ بھی جھوٹ نہ ہو۔ کہیں وہ بھی جھوٹ نہ ہو۔“

انھوں نے اپنے شوہر کی بات پر عمل کیا تھا۔ یوں ابتدا ہی سے وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ تھے مگر حقیقتوں اور سچائیوں کے ساتھ تھے۔ ان کے درمیان ایک دوسرے سے متعلق کوئی شکوک نہیں تھے۔

حال ہی میں تابندہ یتیم ہوئی تھی۔ مگر فاروق کی موجودگی نے اس گھر کو بہت ڈھارس دی تھی۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ اور ایک فرم میں اسٹنٹ منیجر تھا۔ ایک بیٹے کی طرح وہ اپنی خالہ کا سہارا بنا ہوا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ اپنا تمام بار اس پر ڈالتے ہوئے شرمندہ تھیں۔ مبادا کہیں وہ یہ سوچے کہ ہم اس سے اپنے احسانات کی قیمت وصول کر رہے ہیں۔ یہی سوچ کر انھوں نے تابندہ سے کہا کہ وہ گریجویشن کر چکی ہے اب کہیں ملازمت کرے تو زیادہ بہتر ہے۔

تابندہ کو ماں سے اتفاق تھا مگر فاروق نے تابندہ کے ملازمت کرنے پر سخت برا مانا

سے اچھی ہو گئی تھیں۔ اس لیے اب وہ یہاں کم کم ہی آتی تھی۔

ایک روز مدرٹریا کا فون آیا اور انھوں نے بتایا کہ تابندہ کی ماں کو انجائنا ٹریل ہو گئی ہے اور تابندہ بھی کئی روز سے آئی ہوئی ہے۔ تب جینیفر نے اپنے پروگرام ترتیب دیتے وقت تابندہ کے گھر جانے کا بھی خیال رکھا۔ اور مغرب سے پہلے وہ تابندہ کے ہاں موجود تھی۔

بہت پیار سے اس نے تابندہ کی ماں کو دلا سے دیے اور ان کی مزاج پر سی کی۔ ان کی حالت اب سنبھل رہی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ تابندہ امید سے ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ ابھی ابھی ڈاکٹر کے ہاں گئی ہے۔ تو جینیفر نے اس خوشخبری پر مسرت کا اظہار کیا۔

فاروق ابھی گھر نہیں لوٹا تھا۔ صفائی کرنے والی عورت ادھر ادھر کام کرتی پھر رہی تھی۔ جینیفر نے کہا کہ وہ وہی ٹیبل، سوپ تیار کر کے رکھ جائے گی۔

وہ کچن میں چلی آئی اور بڑی لگن سے سوپ تیار کیا۔ اگرچہ وہ گرمیوں کے ابتدائی دن تھے، پھر بھی وہ پسینے پسینے ہو گئی۔ کچن کافی تنگ تھا۔ کھڑکی تھی لیکن ہوا راستہ بھولی ہوئی تھی۔ وہ باورچی خانے سے نکل آئی۔

کمرے میں آ کر اس نے سر سے رومال اتارا تو جوڑا اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے نہیں نکالیں تو بال شانوں پر بکھر گئے۔ اس نے شیمپو کر کے نم بالوں ہی کا جوڑا بنالیا تھا۔ بال بکھرے تو گردن پر بھاپ سی اٹھتی محسوس ہوئی۔ اس نے بال دائیں کا ندھے پر ڈال کر سر اور گردن پر ہوا لی۔ پٹکھا بہت ہلکا چل رہا تھا۔ پھر بھی اس کے وجود میں ٹھنڈک سی اتر گئی۔

اسی دم مردانہ بوٹوں کی چاپ ابھری۔ اس نے جلدی سے رومال اٹھایا۔ تبھی فاروق اندر داخل ہوا۔ وہ بے ارادہ ہلٹی تھی۔ مگر نظر مل گئی اور بجلیاں سی کوند گئیں۔ فاروق ریشم جیسے سنہری بالوں کے درمیان جینیفر کا معصوم اور تازہ گلابی چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ بال عورت کے حسن کا اہم جزو ہیں۔ اس نے آج تک صرف اس کا چہرہ ہی دیکھا تھا۔ زلفوں کی سنہری روشنیوں کو وہ قید ہی رکھتی تھی۔

جینیفر نے گھبرا کر رومال باندھنا شروع کر دیا۔

”ہیلو مس!“ وہ ہمیشہ اسے مس ہی کہہ کر مخاطب کرتا تھا جب کہ وہ سارے زمانے کی سسٹر تھی۔

”ہیلو!“ وہ بولی۔

اخبار ہٹا کر اس کم عمر، ذہین اور بلا کی خوبصورت لڑکی کو پھر تنگ کرتا تو تابندہ پریشان ہونے لگتی۔

”ہاں! ہم سے بھی بھول چوک ہو جاتی ہے مگر ہم احتیاط ضرور کرتے ہیں۔“ وہ کہتی۔ تب وہ جھلا سا جاتا۔ ”عجب بخ لڑکی ہو جینیفر! تمہیں غصہ کیوں نہیں آتا، تم جڑتی کیوں نہیں؟ اگر یہ عقیدے کی وجہ سے ہے تو میں اسے غیر فطری سمجھتا ہوں۔“

”آئیے سسٹر! مدرٹریا کے پاس چل کر بیٹھتے ہیں۔“ تابندہ کو ایسے میں یہ بحث ختم کرنے کے لیے یہی حل سوچتا۔

”میں کچھ فعل نہیں کرتی تابندہ! فاروق کو بولنے دو۔“ وہ مسکرا دیتی۔

”جس انسان میں جوش نہ ہو! مسابقت نہ ہو، وہ بھی کوئی انسان ہے۔ اور جو انسان ہی نہ ہو، وہ انسانیت کو کیسے ”بریف“ کر سکتا ہے؟“ فاروق اپنی بات کے اختتام پر خود ہی ہنس دیتا۔ تابندہ کا چہرہ غصے سے تپ جاتا مگر جینیفر اسی طرح بے تاثر رہتی۔

تب فاروق زچ ہو کر کہتا۔ ”کاش تم میری بات سمجھ سکتیں۔“

جینیفر اس کے دل کی بات خوب سمجھتی تھی لیکن وہ لوگوں کی اس بھیڑ میں سے نہیں تھی جو گناہوں کی کچھڑ سے لت پت ہوتے ہیں۔

وقت تبدیلی سے عبارت ہے۔ تبدیلیاں یہ ہوئیں کہ تابندہ کو ایک نیک خوار خوش رو انسان بیاہ کر لے گیا۔ پورے اہتمام اور روایتوں کے ساتھ اور اس اکثریت کا اندازہ غلط لگا جو یہ سوچ رہی تھی کہ تابندہ کی زندگی فاروق ہی سے وابستہ ہوگی۔

پھر اکثریت نے کھوج لگایا تو معلوم ہوا کہ تابندہ کے والد کی تو یہی خواہش تھی کہ تابندہ فاروق سے وابستہ ہو جائے لیکن فاروق نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس نے ایک مشفق اور بڑے بھائی کا کردار ادا کیا ہے۔ اس میں نہ تو اب نظر بدلنے کی ہمت ہے اور نہ رشتہ بدلنے کی۔ شاید تابندہ کی ماں نے بھی کچھ سوچا ہو لیکن جب بیٹی نے بھی نیا رشتہ قائم کرنے سے انکار کر دیا تو انھوں نے ذہن سے تمام حسرتیں جھٹک کر بیٹی کو غیروں میں بیاہ دیا۔

تابندہ کے اصرار پر جینیفر بھی آئی تھی لیکن لوگوں کو اپنی جانب تعجب و تمسخر سے دیکھتا پا کر وہ جلد ہی چلی گئی تھی۔

تابندہ کی شادی کے بعد وہ اوپر کا راستہ بھول گئی۔ مدرٹریا بھی علاج اور تیمارداری

”جی!“ فاروق نے بازو پھیلا کر دروازے کی چوکت تھام لی۔

”میں نے کبھی آپ کے سامنے مذہب کو موضوع بحث نہیں بنایا حالانکہ میں مشنری سے بھی منسلک ہوں لیکن میں ہر اس موضوع سے بچتی ہوں جس میں کسی کی دل آزاری کا پہلو نکلتا ہو۔“

”لیکن میں نے مذہب کو نہیں، تمہیں موضوع بنایا ہے۔ جائزہ لینا سیکھو، گہرائی میں اترو!“ اس کا لہجہ گہرے ہو گیا۔ ”تم انسانیت کی پرستار بنتی ہو، کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ میں بھی انسان ہوں، ایسا انسان جس کا دل تمہارے لیے۔“

جینیفر کا نازک سا جود کانپ کر رہ گیا۔

”آپ میرے بارے میں فکر نہ کریں۔“ جینیفر نے دوبارہ قطع کلامی کی۔ ”راستہ چھوڑیے۔“ وہ ٹرے تھامے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

فاروق دروازے سے ہٹ گیا۔ وہ چلی گئی۔ بات وہیں کی وہیں تھی۔

”کس قدر گمراہ، بے باک اور احمق انسان ہے یہ!“ جینیفر نے اپارٹمنٹ سے باہر نکلے اور سینے پر کراس بناتے ہوئے سوچا تھا۔ اور خدا سے اس کے لیے نیکی کی توفیق چاہی تھی۔ جب وہ مدرٹریا کے دروازے کے سامنے کھڑی کال بیل کا بٹن پیش کر رہی تھی تو فاروق اوپر بالکونی میں کھڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

پھر جینیفر کی مصروفیات اس قدر بڑھ گئیں کہ مہینوں تابندہ اس کی ماں اور مدرٹریا سے رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ لیکن ایک روز تابندہ کی جانب سے ایک کارڈ موصول ہوا۔ کارڈ پر جلی حروف میں ”شادی مبارک“ لکھا ہوا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ تابندہ کو علم ہے، وہ تقریبات ایڈینڈ نہیں کرتی، پھر اس نے یہ کس کی شادی پر بلاوا دیا ہے؟ اس نے بڑے تذبذب میں کارڈ کھولا تو نہ جانے کیا ہوا کہ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ حالانکہ ایسا ہونا تو نہیں چاہیے تھا۔

یہ فاروق کی شادی کا کارڈ تھا۔ وہ چھ جون کو مکمل ہو رہا تھا۔ اس کی نصف بہتر کا نام ساجدہ تھا۔

جینیفر نے زندگی میں صرف تابندہ کی شادی میں شرکت کی تھی، وہ بھی ذرا دیر کو کہ اسے اس نازک سی لڑکی کا پاس تھا۔ مگر اس کے اس اقدام کو سیمیری میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا

تابندہ کی امی کروٹ لیے لیٹی تھیں۔ بھانجے کی آواز پر سیدھی ہو گئیں۔ ”آگئے فاروق! تابندہ اور ریحان نہیں آئے اب تک؟“

”کہاں چلے گئے آپ کو تنہا چھوڑ کر؟“ وہ اپنے حواس میں آ گئے۔

”تابندہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ریحان ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا ہے۔“

”کیا ہوا ہے؟“ اس نے فکر مند لہجے میں پوچھا۔

”بس ایسے ہی کہہ رہی تھی دل گھبراتا ہے۔“ اب وہ اسے کیا بتائیں۔ بال بچوں والا

بھی نہیں تھا کہ مبہم سا اشارہ کر دیتیں۔

”سوپ بن گیا جینیفر؟ بھوک سی لگنے لگی ہے۔“ انھوں نے موضوع بدلنے کے لیے

جینیفر سے پوچھا۔

”جی، سوپ تو بن گیا ہے۔ ابھی لاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

وہ کچن میں آ کر ٹرے سجانے لگی تو اسے اپنے پیچھے ایک اور وجود کا احساس ہوا۔

پیچھے مڑ کر دیکھا تو فاروق اپنے بازو لپیٹے اسے کام کرتے دیکھا رہا تھا۔

”مس انسانیت! ایک بات سچ سچ بتانا تم جو ہر ایک سے خلوص سے ملتی ہو تو یہ بتاؤ،

کیا تمہارے ملنے والے جاننے والے انسانیت سے عاری ہیں؟“

”نہیں! میں نے یہ کب کہا؟“ وہ آہستگی سے بولی۔

”پھر تمہارا اپنے آپ کو بچانا کیا معنی؟ یہ زندگی، یہ جذبات، یہ عمر دوبارہ تو نہیں ملے

گی! تم چاہت دیتی ہو تو لینا کیوں نہیں چاہتیں؟“

”مجھے بہت سے لوگ چاہتے ہیں۔“ وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔

”ایک بات کہوں! برا تو نہیں مانو گی؟“ وہ تھوڑا سا جھجکا۔

”ہوں کہیے، برا ماننے کی پردا کیے بغیر۔“

”کیا تم زندگی بھر اپنے جذبات و احساسات کو قتل کرتی رہو گی؟ کیا تم وہ عقائد ترک

نہیں کر سکتیں جنہوں نے تمہیں فطری تقاضوں سے منہ موڑنے پر مجبور کر دیا ہے؟ عقائد کو

فطرت سے قریب تر ہونا چاہیے۔ لہذا بہتر یہ ہوگا کہ تم۔“

”آپ ایک بات غور سے سن لیجیے مسٹر فاروق!“ جینیفر نے اس کی بات کاٹی۔ پہلی

مرتبہ فاروق نے اس کے لہجے میں تپش محسوس کی۔

سال سے انگلستان میں مقیم اپنے بچوں کو بلا رہی ہیں۔ وہ بہا دیتے ہیں مگر آتے نہیں ہیں۔ مدر نریا کی بوڑھی آنکھوں سے بہتے آنسو سیدھے جینفر کے دل پر گرے۔ اس نے خود کو لعنت ملامت کی۔ کیا میں اتنی کمزور ہوں کہ گھبرا کر ادھر آنا چھوڑ دیا۔ یہ بوڑھی عورت بھی تو میرے مشن میں شامل تھی۔ میں نے اتنے برس اس سے محبتوں کی باتیں بھی نہیں کیں۔ اس کے زخم زخم دل پر ذرا سا مرہم بھی نہیں رکھا۔

مدر نریا نے اسے تلقین کی۔ ”اوپر جا کر تابندہ کی ماں سے ضرور ملو۔ وہ بھی کئی دہائی روگ لگائے بیٹھی ہے۔ اس کی بہو بھی دوسری زچگی کے دوران میں چل بسی ہے۔“

”اوہ!“ جینفر نے گھبرا کر سینے پر کر اس بنایا اور گلے میں پڑی چمکتی ہوئی صلیب کو انگلیوں سے تھام کر چوما۔

بڑی خود اعتمادی، جذبہ، ہمدردی و انسانیت سے سرشار وہ اوپر آئی تو اندر سے بچوں کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ وہ بے دھڑک اندر چلی گئی۔ گھر کی عجیب بے ترتیب حالت ہو رہی تھی۔ مغرب کا وقت تھا۔ پورے پارٹمنٹ کی لائٹس آن تھیں۔ ایک چھوٹا سا بچہ کچن کے دروازے کے سامنے دھرتا مارے بیٹھا تھا اور خوب چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ ایک بچہ سامنے وا کر میں بیٹھا بھائی کو رو تادیکھ کر وقفے وقفے سے خود بھی سر سے سر ملادیتا تھا۔ ماں تکتی ضروری ہے۔ بچوں کی حالت اس حقیقت کی گواہ تھی۔

تابندہ کی امی کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر حیرت اور خوشی کے تاثرات نمودار ہوئے۔

”گڈ ایونگ!“ جینفر سنبھل کر مسکرائی۔

”خوش رہو، کہاں رہیں اتنے دن؟“ وہ تھکے تھکے انداز میں خود کو گھسیٹ کر سامنے بچے تخت تک لے گئیں۔

”آؤ بیٹھو۔ جینفر!“

”آپ کو پوچھنے آئی تھی۔ زیادہ دیر ہو جائے گی۔ فاروق کی بیوی کا سن کر بہت دکھ ہوا۔“

”اللہ کی مرضی۔ تم تھیں کہاں؟ تابندہ نہیں ہے یہاں تو تم بھی ہمیں بھول گئیں!“

”تابندہ کہاں ہے آج کل؟“ اسے وہ پرخلوں لڑکی ایک دم شدت سے یاد آئی۔

”شارجہ میں ہے۔ ترس گئی ہوں اس کی صورت کو۔“ وہ آزدگی سے بولیں۔

”بیماری چین نہیں لینے دیتی۔ فاروق کا بسا گھر اجڑا ہے۔ اس کا دکھ علیحدہ کھا رہا ہے۔ وہ تو اس

گیا تھا۔ شاید فادر پال کو بھی بھٹک پڑ گئی تھی۔ بھی تو ملاقات پر انھوں نے اسے بغور دیکھ کر پوچھا تھا کہ آیا اسے اپنی زندگی کا مشن اچھی طرح یاد ہے یا نہیں! اور پھر انھوں نے بائبل کی چند آیات پڑھ کر اس کا ایمان تازہ کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ اگرچہ وہ کھلے نہیں تھے مگر وہ نادان نہیں تھی بلکہ اسے شرم محسوس ہوئی تھی کہ اس کے متعلقین کو اس کے ایمان کی مضبوطی پر گمان ہے۔ اس دن کے بعد سے وہ حد درجہ محتاط ہو گئی تھی۔

جانے کتنی شادیاں ہوتی ہیں روز اس شہر میں! ہم دعا کر کے خوش ہونے والوں میں سے ہیں۔ تابندہ! وہ مسکرا دی۔ اس کے خیالوں میں وہ گمراہ انسان اب بھی موجود تھا جو اس کے وجود میں بچھو کے سے ڈنک اتار دیتا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص میں ملبوس بلا کا بے نیاز اور خود اعتماد، مقابل کے مضبوط جذبوں کی دیوار پر ہتھوڑے برساکر انھیں زمین بوس کرنے والا، طنز سے مسکرانے والا، کم علم اور گناہ گار، جینفر نے سینے پر کر اس بنا کر کارڈ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔

جینفر اپنے مشن کے مطابق انسانیت کی خدمت میں مصروف تھی۔ تین سال کا عرصہ تیزی سے گزر گیا تھا۔ اب اس کا اس طرف پاؤں ہی نہیں اٹھتا تھا۔ کبھی مدر نریا کی حالت گبڑتی اور ان کا فون آجاتا تو وہ اپنی سسٹر ماریہ کو وہاں بھیج دیتی۔ وہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ یہ اس کو بھی خبر نہیں تھی۔ البتہ وہ فون پر تابندہ کی امی کی خیریت معلوم کر لیتی۔ عموماً ایسا ہوتا کہ وہ فون کرتی تو دوسری طرف سے فاروق کی آواز ابھرتی اور وہ فون رکھ دیتی۔ اس کا مشن کم زور نہیں پڑا تھا۔ فاروق کی کوئی بھی دلیل جینفر پر کارگر نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کہ جس وجہ سے وہ دلیلیں دیتا تھا۔ وہ وجہ بہت بھیانک تھی۔ ہیرا، دس قیراط کا ہویا اس کی معمولی سی کٹی، انسانی وجود کے اندر عمل دونوں کا ایک جیسا ہوتا ہے اگرچہ اس گناہ گار انسان نے ہیرے ایسی بات کبھی منہ سے نہیں نکالی تھی، مگر کئی، جتنے اشارے نے ہی جینفر کا جگر پاش پاش کر دیا تھا لہذا اس نے وہ راستہ ہی بھلانا مناسب سمجھا تھا جہاں ایک ”گمراہ“ کھڑا تھا۔

آج جب سسٹر ماریہ نے بتایا کہ مدر نریا مرض الموت میں مبتلا لگتی ہیں، کوئی علاج کارگر نہیں ہو رہا اور وہ اسے بہت یاد کر رہی ہیں۔ تو وہ اپنے مشن کے مطابق ایک انسان کو محبت کے بول سنانے چلی آئی۔

مدر نریا کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ وہ جینفر کو دیکھ کر رو دیں اور بتایا کہ وہ پچھلے دو

شادی پر ہی مشکل سے راضی ہوا تھا۔ دوسری کرنے کو کیسے کہوں؟ ہمت نہیں پڑتی۔ اپنے حواس میں نہیں رہتا۔ غصہ کرنے لگا ہے۔ ذرا ان بچوں کو دیکھو، کتنے معصوم ہیں، مگر وہ روٹی کی طرح ڈھنک کر رکھ دیتا ہے انھیں۔ اب تم آگئی ہو تو سمجھانا ہے!“

”آپ تو اپنا ایمان خراب نہ کریں ایسی باتیں کر کے خالہ جان!“ فاروق نہ جانے کہاں سے آوارہ ہوا۔ وہی جلتی سلگتی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے۔ ”آج برسوں بعد آپ آ کیسے گئیں؟ اور خالہ جان مجھے کیا سمجھائیں گی جن کی نزدیک کی نظر ختم ہو چکی ہے۔ ان کی نظر پر تو ”منتوں“ اور ”نذروں“ کے محذب عد سے لگے ہوئے ہیں۔ سوچے اور بخشے ہوئے یہ بے چارے لوگ تو اپنے بھی نہیں ہیں اور کسی کے کیا۔“ اتنا کہہ کر وہ یوں رکا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو، پھر بولا۔ ”حالانکہ میں نے کبھی مذہب کو درمیان میں لا کر تمہیں نشانہ نہیں بنایا جینیفر! لیکن اتنی تو میری معلومات ہیں کہ سیمیری میں آپ کے ہاں بالغ و باشعور لوگ اپنی خواہش اور مرضی سے داخل ہوتے ہیں، کسی منت یا نذر کے ذریعے نہیں! یہی بات میں آپ کو بتانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔“ اس نے بڑے تکلف سے اسے ”آپ“ کہا۔

”اوں ہوں۔“ تابندہ کی امی حیران پریشان نظر آنے لگیں۔

اجڑا اجڑا اور بکھرا بکھرا فاروق جینیفر کے سامنے ڈٹا کھڑا تھا اور پہلے سے زیادہ بے

باک ہو رہا تھا۔

جینیفر کو پھر آنچ آنے لگی۔ وہ لڑکی تھی کوئی پھر تو نہیں تھی۔

”یہ کیا اول فول بکنے لگے ہو فاروق! اسے بیٹھنے تو دو۔“ تابندہ کی امی ایک سیدھی سادھی عورت تھیں انھیں ”زن“ کے مقام کا ادراک نہیں تھا۔ وہ اسے محض تابندہ کی دوست سمجھتی تھیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ”یہ کیسی منت، نذر کی بات کر رہا ہے فاروق؟“ انھوں نے جینیفر سے پوچھا۔

”پتا نہیں!“ جینیفر کی لرزیدہ آواز ابھری تھی۔

واپسی پر رات کو وہ کافی دیر تک جاگتی اور سوچتی رہی۔ بلکہ اپنے آپ سے جنگ کرتی رہی۔ اس کے اندر کی لڑکی کہہ رہی تھی۔ ”سارے جہان کے انسانوں کے خداوند! ہم پیٹ کے بچے کی تقدیر کا فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں؟“

جینیفر کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا کہ تقدیروں کے فیصلے تو خداوند خود کرنے

والا ہوتا ہے۔

وہ ایک رسالہ اٹھا کر دیکھنے لگی جس میں نو آموز قلم کاروں کے افسانے چھپے ہوئے تھے۔ اسے ایک کہانی دلچسپ لگی تو پڑھنے لگی۔

”لوگوں کی نظریں تو موتی کی آب و تاب سے خیرہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن صدف میں بند پانی کے قطرے پر کیا حادثے گزرتے ہیں۔ کس طرح موتی بنتا ہے، یہ کوئی نہیں جان سکتا۔ موتی کتنی دل موہ لینے والی چمک رکھتا ہے۔ اس کی چمک بھی کسی پر یہ بھید نہیں کھولتی کہ صدف کے قید خانے میں کیسے الاؤ دیکھتے ہیں جو پانی جیسی چیز کو پتھر بنا دیتے ہیں۔ یہ آب و تاب تو موتی کی شرم ہے جس میں اندر گزرنے والی قیامتوں کے بھید پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس کی مثال بھی موتی جیسی تھی۔“

وہ بیہوش تک پڑھ پانی تھی کہ رُک گئی۔ اس نے رسالہ ایک طرف ڈال دیا اور پھر سے سوچوں میں ڈوب گئی۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ جب اس نے فون کا ریسپور اٹھایا اور کوئی نمبر ڈائل کرنے لگی تو مطلوبہ نمبر انگیڑ تھا۔ وہ وقفے وقفے سے نمبر ڈائل کرتی رہی اور بالآخر اس نمبر سے رابطہ قائم ہو گیا۔

”ہیلو!“ دوسری طرف سے فاروق کی بھاری آواز سنائی دی۔

”میں ہوں جینیفر!“

”اس وقت رنگ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی، انسانیت پرست مس جینیفر

کو؟“ فاروق نے حسب معمول طنزیہ انداز میں پوچھا۔

”نو ڈاؤٹ، میں انسانیت پرست ہوں اور یہ بتانے کے لیے تمہیں فون کیا ہے کہ چونکہ انسانیت ہر قید ہر محیط میں آزاد ہوتی ہے۔ اس لیے میں تنہا ہوں یا کسی نذر اور منت کے طعنے دینے والے کے ساتھ، مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ البتہ تمہارے بچوں کی زندگی پر ضرور پڑے گا۔ جنہیں ماں کی ضرورت ہے۔“

”جینیفر! جینیفر! تم سچ کہہ رہی ہو؟“ فاروق نے بے چینی سے کہا۔

”ہاں، اور سنو! میں نے اپنا نام بھی سوچ لیا ہے۔“

”کیا؟“ فاروق نے مسرت سے لرزتی آواز میں پوچھا۔

”صدف!“ یہ کہہ کر اس نے ریسپور کریڈل پر ڈال دیا۔



میرے خطوط کے ساتھ یہ سرد مہری، میری بے بسی پر سکوت کا یہ عالم تو خدا معلوم میرے ساتھ کیا رویہ ہو۔

رات صحن میں کوئی کودا تھا۔ ساری رات جاگتے..... آئیہ الکری پڑھتے گزاری ہمارے ارد گرد فلیٹوں میں آپ سے بھی زیادہ بے حس لوگ رہتے ہیں۔ خدا کا آسرا نہ ہوتا تو رات خود کشی کر لیتی۔ سارے رشتے داروں میں آپ ہی کچھ ہمیں..... درخور اعتناء سمجھتے تھے مگر اب آپ بھی..... خدا قیامت کے روز آپ سے اور ماموں جان سے ضرور باز پرس کرے گا۔ مجھ جیسی کم ہمت لڑکی تو بازار جانے کی بھی ہمت نہیں رکھتی۔ امی ابو کے بجائے میں ہی مر گئی ہوتی۔

فقط:- اسماء حیدر

بجلی بہت زور سے کڑک رہی تھی..... وہ جائے نماز پر سر بسجود تھی۔ بچکیوں سے پورا وجود ہل رہا تھا..... اسی دم باہر دستک ہوئی..... وہ اسے اپنا دم سمجھی..... دستک دوبارہ ہوئی کوئی بہت شائستگی سے دستک دے رہا تھا..... وہ سر پر چادر جماتی ہوئی دروازے کے نزدیک آئی..... ”کک..... کون ہے.....؟“ خوف سے آواز کانپ رہی تھی۔

”دروازہ کھولو..... اسماء.....!“ ایک مانوس آواز ابھری ساتھ ہی بجلی کا کڑا کا ہوا..... اس نے جنونی انداز میں چیخ کر گرا دی۔

سامنے بھیکے کپڑوں میں فاروق کھڑے ہوئے تھے..... وہ چیخ کر رو پڑی..... اس کا پورا وجود گویا طوفانوں کی زد میں تھا.....

فاروق..... اس کے لیے تیار نہیں تھے..... اس کے شانے تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگے۔

”اسماء..... پلیز..... اسماء..... مجھے اندر تو آنے دو.....“

”آہ..... آپ لوگ کتنے بے حس ہیں..... میں سرد ہی ہوں فاروق بھائی۔“ وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

وہ اسے تھامے ہوئے اندر چلے آئے۔ خوبصورت چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

”اسماء..... میں بابا جان کے پاس بیروت میں تھا۔ کل ہی رات کو آیا تو تمہارے تین چار خطوط ملے..... اسماء..... مجھے بے حد دکھ ہوا۔ پھوپھا جان کو کیا ہو گیا تھا.....؟“

یہ صراحی میں پھول نرگس کا

کمری فاروق بھائی!
السلام علیکم!

فاروق بھائی میں آپ کو اس سے پیشتر تین خطوط لکھ چکی ہوں۔ فاروق بھائی اس قدر کڑا وقت کہ تصور میں بھی نہیں تھا۔ فاروق بھائی ابو کے انتقال کے بعد میں جانکی کے عالم میں ہوں۔ آپ کو حالات کی سنگینی کا احساس نہیں دروازے کی چٹنی چڑھائے کا بیتی رہتی ہوں..... کراچی میں کون ہے میرا.....؟ پاس پڑوس سے پہلے بھی روابط نہیں تھے اب محتاط ہو کر مزید گوشہ نشین ہو گئی ہوں.....

اگر آپ نے دس دن کے اندر اندر جواب نہ دیا فاروق بھائی تو میں خود کشی کر لوں گی یا کسی ویلفیئر آرگنائزr کے پاس چلی جاؤں گی..... آپ لوگوں کو اس حال میں بھی ترس نہیں آتا؟ بخدا میں آپ سے مالی مدد کی خواستگار نہیں..... مجھے انسانوں کے اس جنگل میں کسی اپنے کا تحفظ چاہیے۔ میرے خدا میں کہاں چلی جاؤں؟..... ماموں جان اگر پاکستان آئے ہوئے ہیں تو سلام کہیے گا۔

آپ کی منتظر

اسماء حیدر

کمری فاروق بھائی!
السلام علیکم!

چوتھا خط ارسال کیے ہوئے تین دن ہوئے ہیں کیا کروں کہاں جاؤں؟ خدا کی غریب کے اتنے دولت مند رشتے دار بنائے جو سب کے سب اس قدر امیر ہوں! معاف کیجئے گا آپ اور ماموں جان دونوں بے حس ہیں..... میں خود لاہور چلی آتی ہمت کر کے مگر جب

انھوں نے اسے سمجھاتے ہوئے آہستگی سے اس کی بدگمانی دور کی۔

”کچھ بھی نہیں ہوا تھا فاروق بھائی..... اچھے بھلے سوئے تھے رات کو اور صبح کو.....“

وہ پھر رو پڑی.....

”اچھا..... ذرا میں کپڑے بدل لوں..... ابھی جہاز سے آیا ہوں.....“ انیر پورٹ پر

ہی بارش شروع ہو گئی..... پلیز..... اپنے آپ کو سنبھالو.....“ انھوں نے اس کا رخسار محبت سے

تھپتھپایا..... اور بیک سے کپڑے نکالنے لگے۔

وہ کرسی پر بیٹھ کر خود پر قابو پانے لگی۔

”فاروق بھائی..... آپ کو بھوک لگی ہوگی..... مگر گھر میں کچھ بھی نہیں ہے سوائے

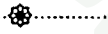
آٹے کے.....“

”میں نے تو خیر جہاز پر کھانا کھا لیا تھا..... مگر تم تو واقعی بھوکی ہوگی.....“ وہ تشویش

سے بولے..... وہ خاموش رہی.....

”اسماء..... تمہارے ساتھ واقعی بہت برا ہوا..... بس اب تیاری کرو ہم صبح ہی پنڈی

چلے جائیں گے..... وہ کپڑے بازوؤں پر لٹکا کر بولے۔



انھوں نے اس کی سمت سرسری انداز میں دیکھ کر اسے بیلٹ باندھنے کو کہا..... وہ

میکانکی انداز میں ان کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔

”فاروق بھائی..... گھر پر تو آپ اکیلے رہتے ہوں گے.....؟“ اس نے آہستگی

سے پوچھا۔

”جب تیرہ سال کا تھا تب سے اکیلا ہوں..... مگر باہمت ہوں.....“ انھوں نے

اس کی کم ہمتی جتائی۔

”آپ مرد جو ہیں.....“ اس نے تھوڑا سا برامان کر کہا.....

”ویسے تم فکر نہ کرو..... گھر میں جو ملازم عورتیں ہیں بہت اچھی و مشفق ہیں.....“

”آپ کی شادی بھی تو ہونے والی تھی.....؟“ اس نے سرسری انداز میں سوال کیا۔

”بہت وقت پڑا ہے ان کاموں کے لیے.....“ انھوں نے انیر ہوسٹس کو اشارے

سے بلا کر کوئی مخصوص میگزین منگایا..... تب وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔

گھر آ کر وہ خدا معلوم کہاں غائب ہو گئے..... رات گئے تک ان کا کچھ پتا نہ

تھا..... وہ ٹیرس پر خاموش بیٹھی تھی..... تب ہی وہ نمودار ہوئے.....

”شکر ہے تم جاگ رہی ہو..... آؤ بابا جان سے بات کروں.....“

وہ ایک دم تیزی سے اٹھ کر ان کے پیچھے ہوئی۔ ریسور تپائی پر پڑا تھا انھوں نے اٹھا

کر چند لمحے کچھ باتیں کیں پھر اس کی جانب بڑھا دیا.....

”السلام و علیکم ماموں جان.....“ اس کی آواز بھرا گئی.....

ادھر سے ماموں جان کی تسلی و شفقت پا کر وہ باقاعدہ رونے لگی۔

”بیٹی..... میں اگلے ماہ تک آؤں گا..... تم فکر نہ کرنا..... جس چیز کی ضرورت ہو فاروق

سے بلا جھجک کہہ دینا..... گھرانا مت..... بیٹی مجھے بہت دکھ ہوا..... شاید تمہارے پاس میرا بیروت

کا ایڈریس نہیں تھا..... بہر حال جو مرضی معبود خط وغیرہ لکھ دیا کرنا..... کیوں بیٹی.....؟“

”جی ماموں جان.....“

”خدا پر بھروسہ رکھو..... خوش رہنے کی کوشش کرو.....“

”ذرا ریسور فاروق کو دو..... تب اس نے ان کی سمت ریسور بڑھا دیا اور باہر چلی

آئی۔ شروع شروع میں تو ماحول اسے اجنبی لگا مگر جلد ہی ایڈجسٹ ہو گئی۔

ایک شام جب وہ ڈرائیونگ روم میں کسی غرض سے گئی تو فاروق بہت خوشگوار موڈ میں

فون پر مصروف گفتگو تھے..... اسے دیکھتے ہی انھوں نے آواز دھیمی کر لی اسے ایسے لگا گویا

انھوں نے بات بدل دی ہو..... وہ عجیب سی خفت محسوس کرتے ہوئے واپس لوٹ آئی.....

اس کی اور فاروق کی ملاقات سرسری ہوتی تھی۔ عجیب مصروف سے آدی تھے..... مگر

بہت مسرور مسرور سے۔ اس سے صرف اس کی ضروریات کے متعلق باتیں کرتے تھے.....

گھر میں بہت کم نکلتے تھے.....

وہ رات گئے تک بیٹھی رہتی ان کے آنے پر ہی بیڈ روم میں جاتی۔ اس کی قضاء کا لمحہ

جس دن آیا وہ صوفے پر میگزین پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی.....

فاروق صرف اس لیے ڈرائیونگ روم میں آئے تھے کہ انھیں پتا تھا وہ جاگ رہی

ہوگی..... مگر وہ عجیب بے ترتیب انداز میں محو خواب تھی..... اس کا بازو اس کے پہلو میں دیا ہوا

تھا..... وہ ازراہ ہمدردی آگے بڑھے اور اسے جگانے لگے..... آف وائٹ شلوار سوٹ میں

ملبوس وہ.....عجب نظارہ پیش کر رہی تھی.....نظارہ تو عام سات تھا دیکھنے والی نظر بدل گئی تھی.....
اس کے یا قوتی ہونٹ نیم وا تھے۔ وہ خیام کی رباعی کی طرح مرض لگ رہی تھی۔ چہرے پر دکھ کے سائے تھے.....امیر خسرو کی ”برہن“ کا سا افسردہ تاثر اس کے پورے وجود سے مل رہا تھا.....اس کا دوپٹہ ان کے پاؤں تلے آ رہا تھا انھوں نے اٹھا کر صوفے کے ہتھے پر ڈال دیا.....
وہ نیک باپ کی نیک اولاد تھے.....سو دوپٹہ کو ہتھے پر نہیں اس کے سر پر پھیلا دینا چاہیے تھا۔ نیکی ورثہ نہیں ہوتی.....نیکی صدقہ نہیں ہوتی.....ہاتھ.....پاؤں.....ناک.....کان.....کی طرح انسانی وجود کا ایک عنصر.....کبھی کبھی ہاتھ پاؤں ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔ بینائی بھی زائل ہو جاتی ہے.....انسان اپانچ بھی ہو جاتا ہے۔ وہ عمر بھر کو اپانچ ہونے جا رہے تھے.....مگر اس کی چھٹی جس جاگ اٹھی.....وہ چونک کر جاگ اٹھی تھی.....

فاروق کی آدمی اپانچ نظر اس نے دیکھ لی تھی.....چھن چھن.....اندر کتنے ہی آئینے ٹوٹ گئے.....وہ تو اپنوں کے تحفظ میں آئی تھی.....جو خدا یہاں اس کی حفاظت کر سکتا ہے وہ اس کے گھر پر بھی کر سکتا تھا۔ وہ وہاں باہمت کیوں نہ بن کر رہ سکتی تھی.....؟ اس کا ایمان کمزور ہو گیا تھا۔ وہ خدا کو پہچان نہیں پائی تھی.....فاروق نے اسے چھو اتک نہیں تھا.....ان کو ساری زندگی معذور بنا دینے والی ”بلا“ ابھی آس پاس ہی منڈلا رہی تھی.....جانے کون سی انجانے میں کی گئی نیکی طلسم بن کر ماحول پہ چھا گئی.....

ایک شیشہ بچ گیا تھا.....

ایک شیشہ ٹوٹ گیا تھا.....

اس نے بچے ہوئے شیشے پر دوپٹے کا پردہ ڈالا.....ٹوٹے ہوئے شیشے کی کرچیاں فاروق کی راہوں میں بچھا کر باہر نکل گئی.....اعتماد.....بالکل ناپینا اعتماد کی باریک باریک کرچیاں.....
کھال میں چبھ کر لہو میں اتر جانے والی کرچیاں.....
اس کی آنکھوں سے نکلے ہوئے حیرت کے تیر.....ملامت کے تیر.....صد مے کے تیر.....ان کے دل و اعصاب میں ترازو ہو گئے.....وہ گویا پتھر کے ہو گئے تھے۔



وہ ان کی نظروں سے بچتی تھی اور وہ اس کی نظروں سے.....

مگر اس روز ان کے ملنے والے آ گئے.....ان کے دوست اور ان کی بیگم.....انھیں

شاید اس کا پتا تھا تب ہی ملازمہ کے ہاتھ بلوا بھیجا۔ ناچار اسے اٹھنا پڑا.....گلابی دوپٹہ سنبھالتی وہ اندر چلی آئی.....فاروق اسی طرح رخ موڑے دوست سے محو گفتگور ہے.....جب کہ دوست کی بیگم اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئیں.....گلابی کپڑوں میں وہ خود بھی گلابی گلابی لگ رہی تھی.....دوسیاہ چوٹیاں آگے سینے پر پڑی ہوئی تھیں گھنیری سیاہ پلکوں کو چھپاتی ہوئی وہ بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ آپس میں تعارف کے مراحل طے ہوئے.....

”ارے ہاں بھئی.....فاروق نے پچھلے دنوں آپ کا تذکرہ کیا تھا کہ ان کی کزن آئی ہوئی ہیں بہت تعریف کرتے ہیں.....سلیقہ مند ہے.....مؤدب ہے اس کے آنے سے گھر کی طرف سے بے فکر ہو گیا ہوں.....“ بھابی ہنسیں.....پھر گویا ہوئیں.....
”فاروق بھائی! اتنی تعریفوں کے باوجود آپ کی تعریفیں نامکمل ہیں یہ بھی تو کہنا چاہیے تھا کہ میری کزن اتنی خوبصورت ہیں کہ پورے پنڈی میں جوڑ نہیں.....اور ہاں اتنی تعریفوں کے ہوتے ہوئے تھوڑا سا نخرہ بھی چل جاتا ہے.....اتنی دیر سے آپ کو بلا رہے تھے ہم۔“ انھوں نے شکوہ کر ہی ڈالا۔

”دراصل میں سو رہی تھی.....“ وہ بے طرح جھل ہو گئی.....

”بی بی تو دن میں بھی کنڈیاں لگا کر سوتی ہیں.....“ ٹرائی دھکیلتی خادمہ نے بھی لب کشائی کی.....

”بھئی اپنے گھر میں بھی دن میں کنڈیاں چڑھاتی ہیں.....“ خوش مزاج بھابی کھلکھلائیں.....

”بعض اوقات چور دن میں بھی آ جاتے ہیں.....خدا نخواستہ.....فاروق کے دوست نعیم نے مذاق کیا.....

تب اس کی نظریں فاروق کی سمت اٹھ گئیں.....وہ منہ میں سگریٹ دبائے کش پر کش لے رہے تھے.....ان کے ارد گرد دھوئیں کا غبار تھا.....

”ویسے فاروق بھائی رخصی کے سلسلے میں آپ نے جلدی کی.....“ جب وہ باہر آ رہی تھی تب اس نے بھابی کی آواز سنی تھی.....

اسے معلوم تھا رخصی فاروق کی پسند تھی کرنل عبدالرحمن کی اکلوتی بیٹی.....ابو کے انتقال سے پہلے فاروق نے باتوں باتوں میں تذکرہ کیا تھا۔ اس نے رخصی کو دیکھا تھا اسے پسند بھی آئی

تھی..... زمانہ دنوں میں بدل گیا تھا..... وہ بات اور تھی..... اب بات اور تھی.....



ماموں جان آگئے تھے..... اس کی ڈھارس سی بندھ گئی تھی..... گھر بھی اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا..... اب اسے کھانے..... ناشتے کے لیے باقاعدہ..... ڈرائنگ روم میں جانا پڑتا تھا..... جب بھی ناشتے کے لیے کمرے میں داخل ہوتی فاروق کے چہرے کے آگے اخبار ہوتا تھا..... بعض اوقات اسے ترس آنے لگتا اس کا جی چاہتا..... اس لمحاتی لغزش کے ناگ سے ڈسے جانے والے انسان کو احساسِ جرم..... ناکردہ جرم..... کے زہر سے نجات دلا دے..... زہر کا منتر پھونک کر اسے بچالے..... ”ظرف کا منکا“ لے کر اس شرمندہ انسان سے پوچھے..... بتا..... اے مجروح..... تجھے وقت نے کہاں پر ڈسا..... لا میں ظرف و معافی کے منکے سے وہاں سے زہر نکال دوں..... تیری روح شانت کر دوں.....

مگر نہیں..... وہ ڈسے جانے سے بال بال بچ گیا تھا..... اور وہ معاف کرنے سے..... آدھا علم خطرناک ہوتا ہے.....

آدھا جرم.....
آدھی سزا.....

اور..... یوں..... فاروق ادھور پن میں رہے اور وہ ایدھیڑ بن میں.....
ایک روز اس نے سنا فاروق نے رشتی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے.....

اور..... پھر ایک روز اس نے سنا.....
وہ ہمیشہ کے لیے بیروت جا رہے ہیں..... ماموں جان کی جگہ.....
اور آخر ایک روز وہ چلے گئے.....

جانے سے ایک رات پہلے وہ بے خبر پڑی سو رہی تھی اسے پتا ہی نہ چلا کہ ایک شرمندہ انسان رات کو کتنی بار اس کے دروازے پر آیا اور لوٹ گیا.....



از بیروت

اسماء السلام علیکم!

تمہارے لیے خلوص دل سے دعا گو ہوں..... اسماء..... مجھے تمہاری نظروں کی

حیرت نہیں بھولتی..... اسماء..... میں کمزور نہیں تھا..... مگر وقت کی گرفت میں آ گیا تھا..... میں کراچی گیا..... تمہیں لے کر آیا..... تم گھر پر آئیں مجھے کوئی کمزور لمحہ یا دہنیں پڑتا..... تم بھی گواہ ہو..... خدا بھی گواہ ہے..... مگر اس روز..... میں سوچتا ہوں کاش عذاب کا وہ لمحہ تمہاری آنکھ کھلنے سے پہلے مل جاتا..... پھر خود احتسابی کی گنگا میں نہا کر میں پاک ہو جاتا..... کرنا کاتین ایک طرف..... تمہاری نگاہ کا دکھ ایک طرف..... دو گواہ کاندھوں پر ایک میرے تمام وجود پر..... وہ گواہ تم ہو اسماء.....

اسماء..... کچھ بھی تو نہیں ہوا..... کچھ بھی تو نہیں..... تو پھر تم مجھے رہائی کیوں نہیں دیتیں.....؟ احساسِ جرم اس لیے شدید ہے کہ تم یہ نہ سوچتی ہو کہ تمہاری بے بسی..... بے سروسامانی سے فائدہ..... اسماء کچھ بھی تو نہیں ہوا تو پھر میں سولی پر کیوں لٹکا ہوں.....؟
رہائی کا منتظر..... فاروق احمد!

یہ محبت نامہ نہیں تھا یہ خیالت نامہ تھا..... عاجزی نامہ تھا..... مگر وہ ایک دم خوش ہو اٹھی..... ایک شخص خود احتسابی کے جہنم میں جھلس رہا تھا.....
وہ اکیلی پلی تھی..... اکیلی ہنستی تھی..... اکیلی روتی تھی..... کم از کم عذاب میں تو کوئی اس کے ہمراہ تھا.....

اس نے خط آنکھوں سے لگایا..... آنکھوں سے کئی قطرے رخساروں پر دھک آئے..... فاروق بھائی..... کراچی میں آپ سے کتنی بار ملی..... کچھ احساس نہیں ہوا..... مگر آہستہ آہستہ عجب احساس جاگا کہ جب آپ اپنے کام کے لیے مجھ سے بے تکلفی اور اپنائیت سے کہتے تھے..... میرا جی چاہنے لگا آپ سدا مجھے یونہی کہتے رہیں میں آپ کے چھوٹے چھوٹے کام..... کر کے خوشی پاؤں..... مگر رشتی میری آرزوؤں کے سیلاب کا بند بن گئی..... میں نے بہت آسانی سے آپ کو ہار دیا کہ بہت حقیقت پسند ہوں..... لیکن اس رات کے بعد میں اپنے ظرف سے نیچے اتر گئی.....

میں نے کمینگی سے سوچا..... یہ نہ ہونے والی لغزش میری تقدیر کا..... موڑ بن جائے کہ اب آپ بے بس تھے..... اور میں..... پھر مگر سوچا..... اتنی آسانی سے کمزور لمحوں میں بے بس ہو جانے والا مرد..... میرے لیے کیا کر پائے گا..... مگر میں اتنی کمینگی نہیں ہوں..... مجھے کچھ

نہیں چاہیے..... مجھے اعتماد کے وہی لمحے چاہیں جن کی بنا پر میں بارش کی سیاہ رات میں احساس تحفظ لینے آپ کے وجود میں چھپ گئی تھی..... کچھ نہیں ہوا..... مگر ہونے کے کتنا قریب تھا..... وہ بری طرح دوری.....

ازیروت!

اسماء.....!

تھیں خط لکھا تھا..... اس امید پر کہ جواب میں رہائی کا پروانہ آئے گا..... مگر.....؟
اسماء..... اعتماد کی..... کرچیاں..... پندار کی کرچیاں..... مجھے لہو لہان کر رہی ہیں۔ اسماء میں نے کچھ نہیں کیا..... تم بھی لکھ دو..... کہ میں نے کچھ نہیں کیا..... کبھی کبھاریوں بھی ہو جاتا ہے۔ کیا تمہیں میرا پہلا خط ملا.....؟

گنہگار..... فاروق احمد
اس نے خط پڑھا..... اور بند کر دیا..... اپنے جرم پر پردہ ڈال کر آپ نے غلطی پر غلطی کی ہے فاروق بھائی..... کسی زمانے میں..... زبان کی نگلی تحریر سے زیادہ ہوتی تھی..... آپ بھلا اعتماد کی قیمت کیا جانیں۔“

ماموں جان کو دوا پلا کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی..... دو سال میں آئے ہوئے فاروق کے خط..... اس نے دراز سے نکالے..... دو سال میں آئے..... چوبیس بچیں خط..... اس نے باری باری سب پڑھے..... پھر قطعیت سے کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی..... جناب فاروق احمد صاحب!
السلام علیکم!

آپ کے عرضی نما خطوط میرے سامنے ہیں۔ چوبیس کے چوبیس خطوں میں وہ چیز نہیں جو میں نے چاہی..... فاروق صاحب! غلطی فاش تھی..... چلیں غلطی نہ کہیں..... ارادہ کہیں..... ارادہ فاش تھا..... کھلا تھا..... تو پھر آپ کی..... شرمندگی میں اتنی اتانیت کیوں ہے.....؟ کسی خط میں یہ نہیں ہے کہ مجھے معاف کر دو..... رہائی دے دو..... رہائی..... میں کیا رہائی دوں..... آپ پندار کے پیشے کے گھر میں بیٹھے ہیں باہر آئیے..... آپ کی یہ گردان کہ کچھ نہیں

ہوا..... اعتماد پارہ پارہ ہوا..... کچھ نہیں ہوا..... احساس تحفظ چھٹا..... کچھ نہیں ہوا.....؟ اگر کچھ نہیں ہوا تو آپ اتنی دور کیوں..... بیٹھے ہیں.....؟ فاروق صاحب..... وقت کا ہر لمحہ آپ ہی کا تو نہیں..... گرفت میں لینے والے عفریت لمحے آپ کے تھے شکست دینے والے لمحے میرے..... لان میں زگس کے پھول کھلے ہیں..... میری حسرتوں کے ترجمان..... انتظار کے گواہ..... انگور کی بیلیں انگوروں سے پڑے ہیں میرے محبت بھرے دل کی طرح..... بلکہ سارا..... باغ سرسبز و شاداب ہے..... میرے ظرف کی طرح..... آپ آجائے یہ آپ کا گھر ہے در بدر نہ پھریے..... مگر خدا را یہ بھی نہ کہیے کہ کچھ نہیں ہوا..... کیسے کچھ نہیں ہوا.....؟ ڈرائیونگ روم میں دو سال سے زگس کے پھول بجتے ہیں صرف زگس کے..... چپہ چپہ منتظر ہے..... ہر شے..... میرے ظرف کی..... آئینہ دار..... کاش ماموں جان نے کبھی آپ کو لکھ دیا ہوتا کہ اسماء نے سارے گھر میں زگس پھیلا رکھی ہے..... زگس حسرت کی علامت..... انتظار کی علامت..... میں آپ کو یہ لکھ سکتی ہوں..... کہ زگس سارے گھر میں پھیلا رکھی ہے..... آپ اپنے پندار کو ایک لمحے کے لیے ایک طرف رکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ مجھے معاف کر دو..... کھلی غلطی..... کر سکتے ہیں..... کھلی معافی نہیں مانگ سکتے.....؟

اسماء.....



شناختی علامت

”اری مہارانی اب اٹھ جا..... چھوڑ دے یہ تخت طاؤس۔“

اماں کی چنگھاڑ پر وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور لرزتے قدموں سے باورچی خانے کی سمت چلی آئی۔

دروازے پر آ کر وہ چپ چاپ کھڑی ہو گئی..... اماں برتنوں کی اٹھا بیچ میں مصروف تھیں۔ اس کی موجودگی کا احساس کر کے انھوں نے گردن موڑ کر اس کی سمت خونخوار نظروں سے دیکھا۔

”جی اماں.....؟ کوئی کام ہے؟“

”کوئی کام.....! نوابزادی کام ہی کام ہے..... اب کام بھی تیری خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ دیدے پھوٹ چکے ہیں تیرے؟ نظر نہیں آتا.....؟“

وہ بے حساب برسیں.....

”چل یہ صاف کر کے لا.....“ انھوں نے کنکر بھرے چاول اس کی طرف کھسکائے۔

وہ پرات اٹھا کر باہر واپس آ گئی.....

”منخوس ہے..... جس دن سے پیدا ہوئی ہے میرے نصیب پر تو سیاہی پھر گئی.....“

ارے اس سے اچھا تھا پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔“

اس نے اپنا ہاتھ بے ساختہ اپنے بائیں رخسار پر پھیرا۔ آنکھیں لبالب بھرا آئیں۔

”اماں..... اس میں میرا کیا قصور ہے..... اللہ مجھے موت کیوں نہیں آ جاتی.....؟“

”اری..... چاول صاف کر کے یہ برتن دھو لیجیو۔ ذرا ہاتھ تیز چلا..... چھٹی کا دن

ہے۔ بھائی گھر پر ہیں۔“ اماں کی آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی..... وہ جلدی جلدی چادلوں

میں ہاتھ چلانے لگی۔

بچپن سے آج تک اس نے یہ جملے ہزاروں بار سنے تھے کہ وہ منخوس ہے اور اس کے

بائیں گال پر جو کالائٹ ہے وہی اس منحویت کا سبب ہے۔ اس نے بارہا سنا تھا کہ جب وہ پیٹ میں تھی تو اس کی نانی مر گئی تھی۔ جب وہ پیدا ہوئی تو پانچ سال کا ہنسا کھلتا بھائی چل بسا۔ وہ یہ ہے..... وہ یوں ہے..... اور

وہ یہ سب سن کر کونوں کھدروں میں پھوٹ پھوٹ کر رویا کرتی۔

کیا اس تل کو کھرچ کر پھینک دوں، تل بھی تو کوئی باریک سائیں تھا خوب سیاہ اور نمایاں تھا۔

اس تل کی منحویت کے قصے سن کر اس کے کان پک چکے تھے۔ اب تو اسے یہ محسوس ہونے لگا تھا گویا یہ تل نہیں کوئی بہت بڑا آسیب ہے جو اس کی جان سے چٹ گیا ہے۔ اسکول میں لڑکیاں رشک کرتی تھیں کہ اس کے رخسار پر کس قدر حسین تل ہے، کاش ان کے رخسار پر بھی اللہ تعالیٰ ایسا تل نقش کر دیتا۔ اسے ان کی باتیں سن کر رونا آ جاتا تھا۔ وہ آنسو پی کر انھیں سمجھاتی کہ کیا بد فالیں وہ منہ سے نکال رہی ہیں..... وہ تو خوش نصیب ہیں کہ ان کے رخسار پر اللہ نے تل نہیں بنایا۔

وہ اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس دیتیں۔

”یوں کیوں نہیں کہتی اگر ہمارے رخساروں پر بھی ایسا تل ہو جاتا تو تیرے تل کو کون

پوچھتا.....؟“

عمارہ، تجھے اللہ نے کتنی پیاری چیز دی ہے.....“

ان کی تعریفوں کے دوران اماں کے قبر بھرے الفاظ اس کے اعصاب پر ہتھوڑے

برسانے لگتے، وہ ان کے بیچ سے اٹھ جاتی۔

خاندان بھری لڑکیاں علیحدہ اس کے رخسار پر بے تل کو بڑی حسرت سے دیکھا

کرتیں۔ ”مارے احساسِ محرومی“ کے جب کوئی کزن مصنوعی تل بنا کر اس کے سامنے آتی تو وہ

تعجب سے سوچا کرتی۔ یا اللہ لڑکیوں کو منخوس بننے کا کتنا شوق ہے۔ ابھی پرسوں ہی کی بات تو ہے

جب خالہ ثریا کہہ رہی تھیں.....

”آپا..... عمارہ کا رنگ ضرور بھائیوں سے کم رہ گیا ہے لیکن اس تل نے کسر پوری کر

دی ہے بہت جتنا ہے۔“

”ارے چھوڑو۔ ثریا..... آگ لگے ایسی سجاوٹ کو جس نے لاکھ کو خاک بنا دیا۔“

وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی تھیں۔ ”سیاہ چیز تو نحوست کی نشانی ہوتی ہے۔ اب نحوست بھی خوبصورت ہونے لگی۔ ہونہہ.....“ اسی دن شام کو اس نے جاوید بھائی سے کہا تھا۔
 ”بھائی میاں..... میں نے پرائیویٹ انٹر تو کر لیا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ بی۔ اے کر لوں۔ میرا شناختی کارڈ بنوا دیں۔“

”ارے تمہارا شناختی کارڈ نہیں بنا.....؟“ انھیں گویا اچنبھا سا ہوا۔

”تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا.....“

”ارے بہت پڑھ لیا.....“ اماں نے حسب عادت پھر ٹکڑا لگایا۔

”بھائی میاں میں کونسا کالج جا رہی ہوں..... جو اماں پر کام کا بوجھ پڑے گا.....“
 ”ارے ہاں..... تو نے تو سارا گھر سنبھال رکھا ہے میرا پاؤں زمین پر لگنے نہیں دیتی..... ایسی ہی کام والی تو ہے۔ اے میں کام کی وجہ سے کہہ رہی ہوں، میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ زیادہ پڑھنے سے لڑکیوں کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں۔ رشتے میں الگ مشکل ہو جاتی ہے۔“

”کچھ نہیں ہوتا اماں..... خواہ مخواہ کی باتیں ہیں۔ آخر گھر بیٹھ کر پڑھ لینے میں حرج ہی کیا ہے۔“

بھائی میاں نے حسب ابق اس کی حمایت کی۔ اب اماں بڑبڑاتی پھر کہیں گھس گئیں۔ اسے اپنے مہربان بھائی پر ٹوٹ کر پیار آ گیا۔

اور پھر وہ پہلے شناختی کارڈ کا فارم لے کر آئے۔

شام کو جب وہ ”بی“ فارم سامنے رکھے اس کا فارم قلم کردہ ہے تھے تو سر اٹھا کر بڑے مصروف سے انداز میں پوچھنے لگے۔ ”شناختی علامت کیا لکھوں.....؟“

”منحوس لکھ دو بھائی میاں.....“ اس نے جمل کر سوچا۔

”ارے کیا لکھے گا..... یہ اتنی بری نحوست اس کے ”کلمے“ پر نہیں چمک رہی.....؟“

”ارے..... ارے..... ہاں.....“ اماں کے جلمے پھپھو لے بھائی میاں کے کام آ گئے۔ ”یہ ٹھیک ہے۔ لویہ تو بالکل واضح علامت ہے..... شناختی علامت کے خانے میں یہ نشان لکھ دیتا ہوں..... ٹھیک؟“ ہاں..... یہ بائیں طرف ہے یا دائیں طرف؟“

”بائیں طرف بھائی میاں.....!“

”اچھا یہ بتاؤ۔ تصویر لگواؤ گی یا دستخط سے کام چلاؤ گی.....“
 ”کوئی ضرورت نہیں تصویر لگانے کی۔ ارے کہیں راستے میں گر گیا تو خواہ مخواہ کی مصیبتیں گلے پڑیں۔ میں کہہ رہی ہوں، سن رہا ہے جاوید۔ تصویر لگانے کی ضرورت نہیں۔“
 ”اچھا..... اچھا..... اماں سن لیا.....“ بھائی میاں نے عاجز ہو کر کہا۔

انھوں نے فارم قلم کر کے جمع بھی کر دیا اور چند دنوں بعد ایک پلاسٹک کوٹڈ کارڈ اس کے سامنے ڈال کر مڑدہ سنایا کہ یہ رہا تمہارا شناختی کارڈ.....

اس نے کئی مرتبہ الٹ پلٹ کر کارڈ ملاحظہ کیا۔

”بھئی اب تو تم ”پروڈ“ پاکستانی ہو گئی ہو۔“ انھوں نے اس کے کھلے ہوئے چہرے کو محبت سے دیکھا۔

”ارے اب اٹھ جاؤ..... شناختی کارڈ سے پیٹ نہیں بھرتا..... وہ چھیلنے کو مٹر پڑے ہوئے ہیں۔“ اماں کو اس کا خوش بیٹھنا ذرا پسند نہیں آیا۔

تھرڈ ایئر کا پہلا سپردے کر جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو بے حد پریشان تھی۔ بھائی میاں کے آنے تک وہ اسی طرح بے چین رہی۔ جب بھائی میاں رات کو سونے کے لیے لیٹے تو اس نے ڈرتے ڈرتے بتایا.....

”بھائی میاں.....“

”ہوں.....؟“

”بھائی میاں..... میرا شناختی کارڈ گم ہو گیا ہے۔“

.....

دوسری دستک پر عمارہ نے دروازہ کھولا تھا۔

سامنے ذکی کو دیکھ کر وہ شیشا سی گئی۔

”راستہ کیوں روکے کھڑی ہو۔ یہاں باہر سورج عتاب بن کر ٹوٹ رہا ہے۔“ وہ ایک دم ہٹ گئی۔

”گھر میں اماں جان نہیں ہیں۔ اس لیے.....“

”ارے اماں جان نہیں ہیں تو کیا تم نہیں ہو.....؟ کھانا تم بھی کھلا سکتی ہو..... پانی تم بھی پلا سکتی ہو۔“ اس نے کرسی پر بیٹھ کر جوتے جرابیں اتارنا شروع کر دیں۔

”کھانا کھائیں گے آپ.....؟“

”صرف کھانا کھانے شارٹ کٹ کے طور پر اس گھر میں آیا ہوں.....“

وہ اوپر کے دو تین بٹن کھول کر کچھ کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

”ہم نے تو دال چاول پکائے ہیں۔ کھالیں گے؟“

”کچے بھی ہوئے تو کھالوں گا..... یہ عالم ہے۔“ اس نے پلٹ کر عمارہ کو دیکھا وہ

لپک جھپک باورچی خانے میں کھس گئی۔

جلدی سے کھانا ٹرے میں سجایا۔ پودینے اور املی کی چٹنی چھوٹی سی کٹوری میں ڈالی۔

جلدی جلدی پیاز کاٹ کر سلاد بنایا۔

اور پانچ منٹ بعد کھانا اس کے سامنے رکھ چکی تھی۔

”واہ بھئی بہت چست ہو۔ جس کے پلے پڑو گی، کبھی بھوکا نہیں مرے گا۔“ اس کی

آواز میں شوخی تھی۔

عمارہ کی کانوں کی لوؤں پر خوف جھلکنے لگا تھا۔

وہ اس کے دل کا مہمان بنا۔ اکثر ہی آ جاتا تھا۔ اس کی کوئی چوری تو عمارہ نے نہیں

پکڑی تھی جس کو دل میں محسوس کر کے پہروں یاد کرتی اور خوش ہوتی، آ تو وہ بچپن ہی سے رہا تھا

کہ اس کی اکلوتی خالہ کا اکلوتا فرزند تھا..... فرزند بھی لاکھوں میں ایک..... خوبصورت، اساتذہ

اور تعلیم یافتہ..... اس کی ہم عمر ڈھیروں کزنز کی شادیاں ہو چکی تھیں یا طے ہو گئی تھیں ایک سے

ایک دولہا نصیب ہوا تھا اور اس کے لیے ابھی تک اوسط درجے کے دو تین رشتے آئے تھے۔ جو

رشتے نہیں اس کے خوابوں کے شیش محل پر بھاری پتھر تھے۔ اس کی ہنرمندی سے جلنے والی کزنز

اب بڑی شان سے اس کے سامنے بیٹھ کر اپنے دولہاؤں کی تعریفیں کرتے نہ تھکتی تھیں۔ اسے

ایسا محسوس ہوتا گویا اسے نچا دکھایا جا رہا ہو۔ ایسے میں جب ذکی کا دھیان آتا تو ڈھارس سی

بندھنے لگتی۔

عمارہ کی ماں کو بھی شاید ذکی کا دھیان تھا جب ہی وہ اکثر بہن سے گفتگو کرتے

پائی جاتیں۔

”ہاں بھئی۔ یہی ایک ماں کی آرزو ہوتی ہے کہ اس کے بچے فخر سے اس کا سر بلند

کریں، یہ تو تھا ہی شروع سے ذہین۔“

”اب اتنا بڑا افسر لگ گیا ہے تو اور مصیبت جسے دیکھو رشتہ لیے چلا آ رہا ہے۔ ارے

صادقہ اُلٹا زمانہ آ رہا ہے۔ پہلے لڑکے والے لڑکی کے در کی مٹی لے لیتے تھے۔ جوتیاں کھس جاتی

تھیں اور اب یہ حال کہ جہاں کوئی اچھا لڑکا دیکھا۔ شہد سمجھ کر کھیوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔

ارے ہر ایک سے کہہ چکی ہوں کہ ابھی تو روزگار سے لگا ہے۔ ذرا بچہ سانس تو لے لے نہیں

ہیں کوئی جلدی.....“

”اے، اور کیا۔ اور پھر خاندان میں کیا لڑکیاں نہیں ہیں جو باہر جائیں.....“

انھوں نے چھالیہ کترتے ہوئے بہن کا چہرہ دیکھا۔

”خیر..... یہ تو میں نے ابھی سوچا نہیں..... خاندان اور غیر خاندان کے جھگڑے تو

بعد کی باتیں ہیں۔ جب ابھی میں نے سوچا ہی نہیں.....“

ارے جب سہرے کے پھول کھلنے کا وقت آئے گا تو پتا بھی نہیں لگے گا..... اور

صادقہ جو جوڑ اس کے نصیب میں ہوگا وہی ملے گا۔ میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ کوئی حور پری یا

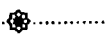
امیر زادی بیٹے کے لیے ڈھونڈوں گی۔ بڑے بول کا سر نیچا.....“

اور صادقہ بیگم جو بہن کی باتیں سن سن کر دہلی جا رہی تھیں ان کے آخری نیک

خیالات سن کر قدرے پرسکون سی ہو گئیں۔

اور عمارہ نے تمام تر گفتگو سے یہ نتیجہ نکالا کہ ”دیر ضرور ہے اندھیر نہیں.....“ اس کے

دل کو بھی ایک گونہ قرار سا آ گیا۔



آخر کار وہ لمحہ بھی آ گیا جو اس کائنات میں بہت سے بلکہ اکثر انسانوں کا نصیب

ہے..... کہ زندگی میں سکھ اور خوشی محض ایک چلتی ہوا کے جھونکے کا نام ہے۔ دکھ وہ بھاری طوق

جو گلے میں لٹک کر رہ جاتا ہے۔ دکھ سچ ہیں اور خوشی جھوٹ..... خوشی پکڑے سے پکڑ میں نہیں

آتی اور دکھ خود بخود جھولی میں آ گرتے ہیں۔ یہ زبردستی کے مہمان ہوتے ہیں..... انھیں دھکا

نہیں دیا جاسکتا..... بنا بنا پڑتا ہے۔

”ذکی کی مکئی ہو رہی ہے۔“ اس نے کس طرح یہ خبر سی وہ بیان نہیں کر سکتی تھی۔ اور

اماں وہ تو مارے صدمے کے گنگ سی رہ گئیں۔

”ارے یہ آپا تو بڑی دھوکے باز نکلیں.....“ وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکیں۔

”انہوں نے تم سے کیا پیمان باندھا تھا.....؟“ اباجی نے بیوی سے پوچھا۔

”اے، لو..... کیا پیمان ہی سب کچھ ہوتے ہیں۔ اپنوں کے سر پر دھرے بوجھ اپنوں ہی کو نظر نہیں آتے..... کیا قیامت ہے..... سکے رشتے اور یہ اندھیر۔“

انہوں نے دُکھ سے کہا۔

”کیوں جی کو روگ لگاتی ہو..... جو نصیب میں ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے..... کیا تم نے نہیں سنا.....؟ ایک بار حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کوئی نقصان ہو گیا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو سرزنش کیوں نہیں کرتے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”اے کچھ مت کہو جو بات ہوتی ہے ہو کر رہتی ہے۔“ صدمہ تو شاید اباجی کو بھی ہوا ہوگا۔ مگر ایسے میں اٹوٹ ایمان انسان کے کام آتا ہے۔ انہوں نے یہ صدمہ شاید سہہ لیا تھا..... حالانکہ ذکی کو وہ شروع سے ہی اس حیثیت سے پسند کرتے رہتے تھے۔

مگر اماں تو مارے صدمے کے بستر ہی سے لگ گئیں۔ عمارہ نے کئی مرتبہ ان کی بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔ اس پر تو خود دُہرے عذاب اترے تھے اور جب بے خبر بلکہ ”بے خبر نما“ ذکی، خالہ کی خیریت معلوم کرنے آیا تو عائشہ نے خود پر قابو پا کر مبارکباد دی۔

”اچھا..... بھئی یہ کون سا طریقہ ہے مبارکباد کا.....؟ گھر پر کیوں نہیں آئیں.....؟ میں تمہیں ان کی تصویر دکھاؤں گا۔ بس یا قسمت بہت اچھی ہے۔ جو تمنا بھی پوری ہوئی یا عمارہ..... میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انسان کی آرزو اس طرح بھی پوری ہو جاتی ہے۔ میں تمہیں ایک بات بتاؤں مجھے گال پر سجا ہوا تل بہت پسند ہے۔ ایک عورت کو کس قدر حسین بنا دیتا ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتا..... میرا جی چاہتا تھا جو میری بیوی ہو اس کے رخسار پر ایک خوبصورت تل بھی ہو۔ بعض اوقات مجھے اپنی اس خواہش پر ہنسی بھی آتی تھی۔ میں نے اپنی یہ خواہش کبھی ظاہر نہ کی۔ اس دُر سے کہیں کسی مصنوعی تل کے دھوکے میں نہ آ جاؤں وہ حلق پھاڑ کر ہنس دیا۔

”میں نے آفریدی صاحب کی بیٹی کو دیکھا تو پہلے ہی سمجھا کہ اس نے فیشن میں مصنوعی تل نکارکھا ہے۔ پھر بادائق ذرائع سے معلوم ہوا کہ تل حقیقی ہے۔ پھر تو میں نے رشتہ بھوانے میں زرا دیر نہیں لگائی..... اور اللہ نے کرم کیا۔

چلو ناں، کبھی اپنی بھابی سے ملنے.....“

”چلوں گی..... اماں کی طبیعت ٹھیک ہو جائے..... آپ بیٹھیں میں چائے بنا کر لاتی ہوں.....“ وہ آنسو پیتی ہوئی کچن میں آ گئی..... کتنی دیر تک وہ پلو سے آنکھیں رگڑتی رہی تھی۔



”منحوس نہ ہوتی تو کب کی اپنے گھر کی ہو گئی ہوتی۔ ارے اللہ کا عذاب ہے میرے سر پر۔“

سر پر۔

”یہ لو..... یہ بھی میرا قصور ہے۔“ اس نے جھلا کر کتاب ایک طرف رکھ دی۔

باہر تو حضرت نوح کے وقتوں کا پھانک جھول رہا ہے اور کینوں کی مالی حالت آشکارا کر رہا ہے۔ آج کل رشتے پیسے سے طے ہوتے ہیں۔ اماں..... بھائی میاں کی تنخواہ تو اپنے قبضے میں کر لیتی ہیں کہ وہی کچھ کر لیں پھر وہ دونوں بھائیوں کے اخراجات علیحدہ۔

اور اب ان کو کئی سوچ گئی ہے۔ شادی..... ہونہ۔ اب پڑھائی سے فارغ ہولوں، نوکری وغیرہ کر دوں گی تو کچھ ہو سکے گا۔ اماں کی دن رات کی پھنکاروں سے اس کے خیالات میں کافی چٹنگی آ گئی تھی۔

جب وہ آنگن کا فرش دھونے کے خیال سے جھاڑو اور پائپ اسٹور سے نکال کر لائی تو ناتواں پھانک بڑی اذیت سے کراہ اٹھا۔

وہ اسی طرح پھانک تک چلی آئی..... سامنے دو پیاری سی لڑکیاں کھڑی تھیں۔ انہوں نے اباجی کا نام لے کر تصدیق چاہی کہ یہ انہی کا گھر ہے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور انہیں لے کر اماں کے پاس چلی آئی..... ایک نسبتاً کم عمر لڑکی نے تعارف کرایا کہ میرا نام حنا ہے یہ میری بھابی ساجدہ ہیں۔

اماں نے اشارے سے اسے باہر جانے کو کہا..... وہ کچھ نہ سمجھتی ہوئی باہر چلی آئی..... مگر بدستور سوچ رہی تھی کہ یہ لوگ کون ہیں.....؟

اور معمرہ حل ہو گیا..... بلکہ بہت جلد ہی حل ہو گیا..... اسے تو یقین ہی نہیں آیا۔

آج نحوست کے بادل چھٹے تھے۔

وہ رخصت ہو رہی تھی۔ اس کی ساس کہہ رہی تھیں.....

صادقہ بہن اطمینان رکھیے..... یہ میری بیٹی ہے۔ آپ ہمیں غیر خاندان سمجھیں گی تو

ہم غیر نظر آئیں گے اپنا سمجھیں گی تو اپنے.....“
اماں نے شاید پہلی مرتبہ بیٹی کو سینے سے لگایا اور وہ ماں کے سینے کی گرمی پا کر پھوٹ
پھوٹ کر رو دی تھی۔

.....
ویسے کی صبح وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے گیلے بال لیے بیٹھی تھی اور ہارون تازہ اخبار
لیے بیٹھے تھے۔

”عمارہ!“

”جی.....!“ اس نے نظریں آہستگی سے اٹھائیں۔
”شناختی کارڈ تو تمہیں مل گیا ہوگا۔ میں نے لیٹر بکس میں ڈال دیا تھا۔ ایڈریس اتار
کر.....“ انھوں نے اس کی سمت شوخی سے دیکھا۔

”جی مل گیا تھا.....“ اس نے گیلے بالوں میں کنگھا پھنسا کر جواب دیا۔
”اسی شناختی کارڈ کے سبب یہ نحوست کے بادل چھٹے ہیں شاید.....“ اس نے دکھ
سے سوچا۔

”عمارہ..... یقین کرو جب میں نے یہ پڑھا شناختی علامت۔ بائیں رخسار پر قتل
ہے۔ بس میں نے حنا اور بھابی کو فوراً بھیجا کہ اتا پتا کریں۔ رخسار پر نکاتل عورت کو کتنا سجا دیتا
ہے۔ تم نہیں جان سکتیں۔“

